حبیب جالب ـ گھر کی گواہی

تحریر و ترتیب

سعید پرویز

حبیب جالب — گھر کی گواہی

تحریر و مرتب

سعید پرویز

ہماری والدہ صاحبہ رابعہ بصری

دو آبہ میں بہنے والے بیاس کے کنارے آباد گاؤں

میانی افغاناں کے حریت پسند اور ہمارے مورثِ اعلیٰ

بابا خیرالدین خان کے نام

میرا بیٹا میرا حبیب

میرا بھائی میرا جالب

گھر کے قلم کار

گوشہ صوفی عنائیت اللہ

گوشہ مشتاق مبارک

گوشہ حبیب جالب

گوشہ سعید پرویز

اساس

بلاشبہ حبیب جالب اپنی زندگی ہی میں ایک بڑے انسان تسلیم کر لئے گئے تھے'۔ ہماری خوش نصیبی ہے کہ جسے اس صدی کا ایک عظیم انسان کہا گیا' وہ ہمارے گھر میں پیدا ہوا۔

چند ماہ قبل میرے ذہن میں خیال آیا ہے کہ جالب صاحب جیسی شخصیت کیلئے "گھر کی گواہی" بھی بہت اہمیت رکھتی ہے۔ پھر میں نے سوچا ہے کہ دنیا بھر کے لوگوں نے ان کے بارے میں اپنی آراء کا اظہار کر دیا ہے' کہ وہ ایسے انسان تھے' ایسے شاعر تھے۔

جالب صاحب پر بہت کچھ لکھا گیا ہے' اور وہ سب کچھ دو کتابوں کی صورت ہمارے سامنے بھی ہے' ان کے بارے میں پہلی کتاب ۱۹۷۸ء میں ان کی پچاسویں سالگرہ کے موقع پر شائع ہوئی' حبیب جالب "فن اور شخصیت" اس کتاب کا ٹائیٹل خود صادقین صاحب نے خواہش ظاہر کر کے بنایا تھا اور اسی موضوع پر دوسری کتاب ۱۹۹۰ء میں شائع ہوئی' جس کے مرتب مجاہد بریلوی تھے۔ یہی کتاب بعد ازاں "کوئی تو پرچم لیکر نکلے" کے نام سے مزید مضامین کے ساتھ فرنٹیئر پوسٹ پبلیکیشنز لاہور نے شائع کی۔

حبیب جالب۔ گھر کی گواہی میں ہمارے والد صاحب کی وہ تمام یاداشتیں شامل ہیں جو انہوں نے اپنے بیٹے حبیب جالب کے بارے میں قلمی نسخہ جات کی صورت چھوڑی ہیں۔ والد صاحب نے جالب صاحب کی پیدائش کے دن سے داستان شروع کی ہے۔ اور پھر بچپنا' لڑکپن' جوانی۔ اور یوں ہوتے ہوئے' ان کی تحریر کا پھیلاؤ۔ ۱۹۷۱ء تک پہنچتا ہے۔

ان تمام واقعات کو پڑھ کر بخوبی سمجھ میں آتا ہے۔ کہ "حبیب جالب" ناقابل تسخیر کیسے بنے۔ یہ سب کچھ قدرت کو دکھانا منظور تھا۔ بس اور کچھ نہیں۔

والد صاحب کے قلمی نسخہ جات سینکڑوں صفحات پر مشتمل برسوں سے گھر میں پڑے تھے۔

زندگی میں اکثر والد صاحب اس خواہش کا اظہار کیا کرتے تھے۔ کہ میری تحریریں کتابی شکل میں آنا چاہئیں۔ مگر یہ کام اتنا آسان کہاں تھا۔ اور پھر ہمارے خود کے حالات بھی ایسے نہیں تھے۔ مگر آج والد مرحوم کی تحریریں۔ اپنے میریٹ پر شائع ہوئی ہیں۔ اور یوں آج ان کی روح بھی یقیناً خوش ہوئی ہو گی۔ والد صاحب کی تحریر کی سادگی کو من و عن پیش کیا جا رہا ہے۔ کہ یہی ان کی تحریر کی خوبی ہے۔

اس کتاب کا دوسرا حصہ "میرا بھائی میرا جالب" ہے یہ وہ واقعات ہیں' جو میرے سامنے رونپذیر ہوئے' اور جنہیں جالب صاحب خود سے بیان نہیں کر سکتے تھے کہ اس سے خودستائی کا پہلو نکلتا ہے۔ میرے سامنے ہونے والی جالب صاحب کی گرفتاریاں' مختلف سیاسی اکابرین سے ملاقاتیں' اور بہت سے یادگار واقعات' کے علاوہ گھر میں مختلف رشتوں کے حوالوں سے جالب صاحب کا کردار۔ میں نے یہ سب کچھ تاریخ کے حوالے کر دیا ہے۔

کتاب کا تیسرا حصہ' جالب کے گھر کے قلم کاروں پر مشتمل ہے۔ اس حصہ میں والد مرحوم کی شاعری۔ اور نثر' ہمارے سب سے بڑے بھائی مشتاق مبارک جو بڑے قادرالکلام شاعر تھے' کی شاعری اور میرے چند افسانے و شاعری کے علاوہ جالب صاحب کے کلام کا بہترین انتخاب شامل ہے۔

اپنی تحریر کو جالب صاحب کے اس پیغام پر ختم کرتا ہوں۔ کہ اس پیغام کی آج اشد ضرورت ہے۔

امن کا پرچم لیکر اٹھو' ہر انسان سے پیار کرو
اپنا تو منشور ہے جالب' سارے جہاں سے پیار کرو

کتاب کی اشاعت میں معاونت پر صابر ظفر' ایس۔ ایم۔ انعام' ایم۔ بی انجم اور محترم ایس۔ ایم۔ منیر صاحب کا شکریہ۔

سعید پرویز

۵ مارچ ۱۹۹۴ء

کراچی

میرا بیٹا میرا حبیب
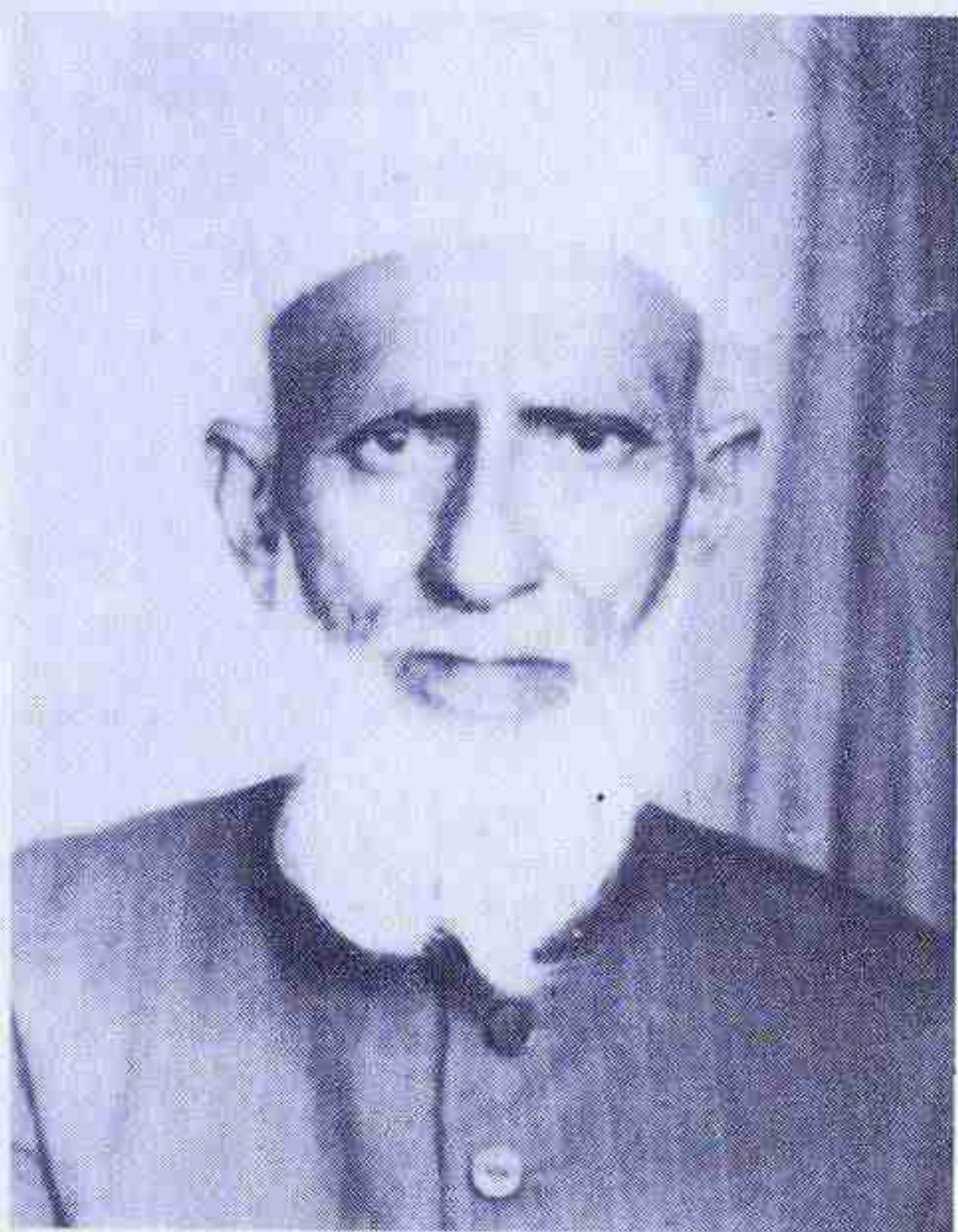
ہمارے والد صوفی عنایت اللہ

دو آبہ بہشت کا گلابہ

ہمارا گاؤں۔ ''میانی افغاناں'' مشرقی پنجاب میں دو آبے کی سرزمین جسے دو آبہ بہشت کا گلابہ بھی کہتے ہیں۔ اسی بہشت کے گلابے میں دریائے بیاس کے کنارے آباد تھا اور آج بھی ہے۔ یہ سرسبز و شاداب علاقہ جہاں ندیاں' نالے' نہریں بہتی تھیں۔ ممند پٹھانوں کی ملکیت تھا' ممند پٹھان بڑے باوقار صاحب علم اور زندہ دل لوگ تھے۔ ہمارے گاؤں میانی افغاناں کی آبادی تقریباً چھ ہزار کے لگ بھگ تھی۔ (قیام پاکستان سے قبل) میونسپل کمیٹی' مڈل اسکول' اسپتال اور پولیس چوکی گاؤں میں یہ سہولتیں میسر تھیں۔

میانی' میادی' لالو ملاح' یہ چند بستیاں دریائے بیاس کے کنارے آباد تھیں' پہلے یہاں مچھیرے آباد تھے بعد ازاں عرب مسلمان' کابل' قندھار' غزنی سے ہوتے ہوئے ہندوستان میں پھیل گئے۔ ہمارا گاؤں میانی افغاناں مسلمان پٹھانوں کی ملکیت تھا' مگر ہندو' سکھ' عیسائی بھی یہاں آباد تھے۔ اس گاؤں کے مالک چونکہ غزنی افغانستان سے ہجرت کرکے آئے تھے لہٰذا اس گاؤں کے نام میانی کے ساتھ افغاناں کا اضافہ ہوگیا اس طرح یہ گاؤں میانی افغاناں کے نام سے پکارا جانے لگا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ انگریز سرکار سے وفاداری نبھانے کے عوض مسلم پٹھانوں کو میانی گاؤں بطور جاگیر عطا کیا گیا تھا جو بعد میں میانی افغاناں کہلایا۔

دو آبے کی سرزمین نے بہت بڑے بڑے نامور لوگ پیدا کیے۔ بیدار مغز انسان، مرد میدان، جری، بہادر، نامور پہلوان اور اولوالعزم بزرگان عظام اور فارسی اردو پنجابی کے شاعر، ادیب بھی اس خطے نے پیدا کیے۔ حضرت مولانا غلام قادر گرامی، حضرت مولوی غلام رسول عالم پوری، حضرت حفیظ جالندھری، حضرت حفیظ ہوشیار پوری و طفیل ہوشیار پوری، یہ چند نام ہیں جو اس وقت یاد آ رہے ہیں۔ ورنہ باقاعدہ تحقیق کے بعد بہت سے نامور ہندو، سکھ اور دوسرے مذاہب کے شاعر ادیب بھی ہیں جنہوں نے اسی مردم خیز علاقے میں جنم لیا اور اسی خطے میں جنم لینے والے دو نامور شاعر مشتاق مبارک اور حبیب جالب جو کہ میرے فرزند ہیں شامل ہیں۔ میں اپنے نصیب پر جتنا بھی ناز کروں کم ہے کہ خدا نے یہ دو انمول ہیرے میری جھولی میں ڈال دیئے۔

ہمارے مورث اعلیٰ بابا خیرالدین خان

ہمارے گاؤں میانی افغاناں میں غالب اکثریت مسلمانوں کی تھی۔ مگر ہندو، سکھ اور عیسائی بھی یہاں آباد تھے۔ ہمارے گاؤں ہی میں ایک بزرگ حضرت بابا فتح محمد خان بھی رہتے تھے حضرت بابا فتح محمد خان کا چہرہ بہت نورانی تھا اور میں آپ کا بہت احترام کیا کرتا تھا ویسے ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی سبھی آپ سے بہت پیار کیا کرتے تھے، بابا فتح محمد خان کی ایک بڑی خوبی یہ بھی تھی کہ آپ علاقے کے بڑے تاریخ دان تھے اور آپ کو گاؤں بھر کے ہندو، سکھ، عیسائی اور مسلمانوں کی پشتوں کے نام حفظ تھے۔ جب بھی گاؤں کا کوئی آدمی بابا جی کو سلام کرتا تو جواب میں بابا جی وعلیکم السلام کہنے کے بعد سلام کرنے والے کو اس کے جد امجد کے نام کے حوالے سے پکارتے مثلاً آ بھئی جھنڈے خان والے آ بھئی ذیل سنگھ والے آ بھئی ہری چند والے اسی طرح میرا اور بابا فتح محمد خان صاحب کا آمنا سامنا ہو جاتا اور میں انہیں سلام کرتا تو وہ مجھے کہا کرتے تھے۔ آ بھئی خیردین خان والے۔

خیرالدین خان میرے والد میاں جی شرف الدین کے دادا تھے۔ ہمارے مورث اعلیٰ بابا خیر

الدین خان کے بارے میں بابا فتح محمد خان فرمایا کرتے تھے کہ خیرالدین خاں بڑے قوی ہیکل جوان تھے۔ ایسے طاقتور' بہادر اور غیرت مند انسان کم ہی پیدا ہوتے ہیں۔ پھر بابا فتح محمد خان بتاتے کہ بابا خیرالدین خان غزنی (افغانستان) سے ہجرت کر کے یہاں آئے تو ضلع جالندھر میں واقع قلعہ پھلور میں فوجی ملازمت اختیار کر لی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں جب انگریزوں نے قلعہ پھلور پر بھی یلغار کی تو خیرالدین خان اپنے فوجی ساتھیوں سمیت قلعہ میں محصور ہو کر رہ گئے اس موقع پر خیرالدین خان نے اپنے ساتھیوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ دشمن کا مقابلہ کرتے ہوئے جوان مردوں کی موت مرنا ہی مردانگی ہے۔ اس کے بعد خوب جان توڑ مقابلہ ہوا اور گورے سپاہی پسپا ہو کر بھاگ نکلے اور کچھ گورے سپاہی قلعہ کی بالائی منزل پر جا چھپے۔ جوش و ولولے کے عالم میں میاں خیرالدین خان نے تنہا ان گورے سپاہیوں کا تعاقب کیا اور قلعہ کی بالائی منزل پر جا پہنچے اور نو کے نو گورے قتل کر ڈالے۔ آخر گوروں کی مزید فوجی کمک آجانے پر خیرالدین خان گرفتار ہوئے اور انہیں انگریز فوجی افسر کے سامنے پیش کیا گیا اور اسے بتایا گیا کہ اس مسلمان جوان نے نو گورے فوجیوں کا قتل کیا ہے جو اپنی جان بچانے کی خاطر قلعہ پھلور کی بالائی منزل پر جا چھپے تھے۔

انگریز افسر سارا ماجرا سن کر بولا۔

وہ بزدل تھے جو میدان چھوڑ بھاگے جب کہ یہ جوان بہادر ہے۔

بابا فتح محمد خان کے کہنے کے مطابق بعد ازاں ہمارے مورث اعلیٰ خیرالدین خان نے میانی افغاناں میں رہائش اختیار کر لی جہاں انہوں نے پولیس چوکی میں آٹھ سپاہیوں پر جمعداری کی ملازمت اختیار کر لی۔ بابا جی فتح محمد خان پولیس ملازمت کے زمانے کا ایک واقعہ سنایا کرتے تھے کہ ایک مرتبہ شدید بارش میں ہمارے مورث اعلیٰ خیرالدین خان پولیس چوکی میں اپنی ڈیوٹی پر موجود تھے۔ رات کا وقت تھا سارے سپاہی گشت پر گئے ہوئے تھے۔ بارش اس قدر شدید تھی کہ پولیس چوکی کی چھت گرنے لگی۔ خیرالدین خان نے یہ دیکھا تو لکڑی کے بالے سے چھت کے شہتیر کو ٹیک لگا کر تمام رات پولیس چوکی کی گرتی ہوئی چھت کو سنبھالے رکھا۔ صبح جب سپاہی گشت سے لوٹے تو انہوں نے خیرالدین خان کو باہر نکالا مگر اس واقعے

کے بعد تمام عمر بابا خیرالدین خان کی ریڑھ کی ہڈی میں درد بیٹھ گیا اور اسی لئے وہ کمر میں لوہے کی زنجیر باندھ کر رکھتے تھے۔ اور کمر کے اس درد نے ان کا زندگی بھر پیچھا نہیں چھوڑا۔ مجھے لگتا ہے کہ ہمارے انہی بہادر غیرت مند بزرگ کی کوئی انی کنی میرے بیٹے حبیب جالب میں رہ گئی ہے۔

میاں شرف الدین خان

میرے والد میاں شرف الدین خان دس بارہ برس کی عمر میں والدین کے سائے سے محروم ہو گئے تھے والد صاحب کے بڑے بھائی یعنی میرے تایا میاں فضل محمد پیشہ کے اعتبار سے گائیڈ تھے۔ ہندوستان کی سیاحت کو جو غیر ملکی آتے تھے۔ میرے تایا فضل محمد ان سیاحوں کے ساتھ ہندوستان بھر گھومتے' اسی لئے تایا میاں فضل محمد کا زیادہ تر وقت کلکتہ' مدراس اور بمبئی میں گزرتا تھا جب کہ میرے والد میاں جی شرف الدین خان گاؤں میں تنہا رہتے تھے۔ گاؤں میانی افغاناں میں میرے والد صاحب کا قریبی رشتہ دار چچا' تایا' ماموں' پھوپھی کوئی نہیں تھا۔ بس یہ دو بھائی تھے۔ بڑا بھائی گاؤں سے باہر رہتا تھا اور یوں میرے والد گاؤں میں بے یار و مددگار لاوارثوں کی سی زندگی گزارنے پر مجبور تھے۔ عزیز رشتے دار انہیں منہ نہیں لگاتے تھے گویا وہ اپنے خاندان کا ایک ٹمٹماتا ہوا چراغ تھے۔ جسے باد مخالف کا ہلکا سا جھونکا بھی بجھا سکتا تھا مگر قدرت جس کا ہاتھ تھام لے پھر بھلا ہزار آندھیاں بھی چلیں تو کیا فرق پڑتا ہے اور پھر یوں ہوا کہ اللہ نے اپنے ایک مقرب بندے حضرت پیر حسین علی شاہ کے ہاتھ میں ان کا ہاتھ دے دیا میرے والد صاحب میاں شرف الدین نے اپنے پیرو مرشد بابا حسین شاہ صاحب کو دیکھا رنگ و نور کی کرنیں بابا حسین شاہ صاحب کے چہرے کا احاطہ کئے ہوئے تھیں۔ پیر کامل کی نظر سے نظر ملنا تھی کہ قبلہ والد صاحب نے باباجی کے قدموں میں بیٹھنے کی اجازت مانگی اور اس طرح گاؤں میانی افغاناں کے لاوارث شرف الدین خان کو حضرت پیر سید حسین علی شاہ قادری رحمتہ اللہ علیہ کے حلقہ ارادت میں جگہ مل گئی۔ قبلہ والد صاحب

بابا حسین شاہ صاحب کے مرید کیا ہوئے ان کی زندگی ہی بدل گئی۔ دس بارہ سال کا لاوارث بچہ جسے قدرت نے ہر قسم کے شر سے محفوظ رکھنا تھا اب یہ حال تھا کہ قبلہ والد صاحب کے دن رات اپنے پیر کے آستانے پر گزرنے لگے اور وہ اپنے مرشد ہی کے ہو کر رہ گئے اور ان کی عقیدت و محبت کا یہ عالم تھا کہ

جگہ نہیں ہے مرے دل میں تل بھی دھرنے کو
ہیں اس قدر مری نظروں میں وہ سمائے ہوئے

میانی افغاناں میں ہماری کوئی جاگیر وغیرہ کچھ بھی نہیں تھی بس ایک کچا سا مکان تھا۔ میرے تایا جیسا کہ میں نے بتایا کہ ان کی مخصوص ملازمت یعنی گائیڈ ہونے کی وجہ سے بڑے بڑے شہروں میں سیاحوں کے ساتھ گھوما کرتے تھے اور گاؤں میں ان کا چھوٹا بھائی یعنی میرے والد میاں جی شرف الدین اپنے پیر بابا حسین شاہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے آستانے ہی پر رہتے تھے۔ لمبا چوغا بدن پر اور سر پر پگڑی اور پیر کی اطاعت بس قبلہ والد صاحب کی زندگی اس رنگ ڈھنگ سے گزرنے لگی۔

وقت گزرتا گیا اور قبلہ والد صاحب بھی بچپنے کی حدود پھلانگ کر اب جوانی کی حدود میں داخل ہو چکے تھے مگر کامل پیر کی صحبت نے لغویات دنیا سے یکسر محفوظ کر رکھا تھا۔ قبلہ والد صاحب کے شب و روز آستانہ پیر حسین علی شاہ پر ہی گزر رہے تھے۔ دن رات اپنے پیر کی خدمت میں حاضر رہنا ہی والد صاحب کا واحد مشغلہ تھا اور پیر حسین علی شاہ بھی اپنے مرید شرف الدین سے بہت محبت کرتے تھے۔

ایک مرتبہ قبلہ والد صاحب نے اپنے پیرو مرشد سے عرض کیا کہ یا حضرت ہماری نسل میں بہت سے بزرگ ایسے ہیں جو لاولد ہی اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ سنا ہے ہمارے ان بزرگوں میں سے کسی نے نوشاہی خاندان کے بزرگ کی شان میں گستاخی کی تھی یا پیرو مرشد اس دنیا سے لاولد جانے والے ہمارے بزرگ یہ ہیں

میاں چتر داد خان

میاں روڑے خان (ٹانڈہ اڑمڑ)

ہمارے پیرومرشد سید حسین علی شاہؒ

میاں حیدر داد خان

میاں غلام مصطفیٰ خان

میاں غلام محمد خان

میاں میر محمد خان

میاں محمد بخش خان

اور میاں احمد بخش خان

ہمارے ان بزرگوں پر نوشاہی بزرگ کی شان میں گستاخی کرنے کی وجہ سے عتاب الٰہی نازل ہوا اور یہ لاولد ہی دنیا سے رخصت ہو گئے۔

پیرو مرشد سید حسین علی شاہ صاحب نے تمام ماجرا اپنے مرید خاص شرف الدین سے سنا تو اسے کہا کہ فوراً ساتھ والے گاؤں "جھنڈ چھانگے" چلے جاؤ وہاں نوشاہی بزرگ حضرت پیر امام الدین شاہ تشریف لائے ہوئے ہیں۔ حضرت پیر حسین علی شاہ کے آستانے سے "جھنڈ چھانگے" ڈیڑھ دو میل دور تھا۔

حضرت پیر امام الدین نوشاہی بزرگ

حضرت پیر امام الدین حضرت پیر بخت جمال کے پوتے تھے۔ جو چند یوم سے موضع جھنڈ چھانگے اپنے مریدوں کے پاس تشریف لائے ہوئے تھے۔ مرشد طریقت نے اپنے صادق الیقین مرید کو گرمیوں کی تپتی ہوئی دوپہر میں حکم صادر فرمادیا تھا کہ حضرت امام الدین نوشاہی بزرگ کی خدمت میں پیش ہو جاؤ لہٰذا شرف الدین خان حسب الحکم تپتی ہوئی دوپہر ہی میں موضع "جھنڈ چھانگے" کے لئے روانہ ہو گئے اور اپنے مرشد سے یہ بھی نہ پوچھا کہ حضرت پیر امام الدین نوشاہی کی خدمت میں حاضر ہو کر کیا عرض کروں۔

مرشد کے حکم کی تعمیل میں پیدل ہانپتے کانپتے میاں شرف الدین جھنڈ چھانگے پہنچ گئے ادھر بھیجنے والے بھی باکمال اور ادھر میاں امام الدین نوشاہی بزرگ بھی باطن کی آنکھ رکھنے

والے۔

میاں شرف الدین جب وہاں پہنچے کہ جہاں پیر سید امام الدین شاہ تشریف فرما تھے تو آپ نے دیکھا کہ حضرت پیر امام الدین شاہ اپنے مریدین کے جھرمٹ میں مانند ماہتاب تشریف فرما ہیں۔ قبلہ والد صاحب نے مودبانہ سلام عرض کیا' پیر امام الدین شاہ نے سلام کا جواب دیا اور مسکراہٹ ان کے چہرے پر پھیل گئی۔ قبلہ والد صاحب ابھی کھڑے ہی تھے' اور اجازت کے منتظر تھے کہ پیر امام الدین شاہ انہیں بیٹھنے کی اجازت دیں مگر نوشاہی بزرگ حضرت پیر امام الدین شاہ نے شرف الدین خان کو بیٹھنے کی بجائے یہ فرمایا۔

چلو بھئی شرف الدین تم کھو (کنواں) پر چل کر ہمیں نہلاؤ۔

پیر سید امام الدین شاہ کی بات سن کر ان کے تمام مریدین باادب کھڑے ہو گئے اور اپنے پیر کی خدمت میں عرض کرنے لگے کہ یا مرشد آپ ہمیں حکم دیں ہم آپ کو نہلاتے ہیں مگر پیر سید امام الدین نے اپنے مریدین کی خواہش کو رد فرماتے ہوئے پھر کہا کہ آنے والا شرف الدین ہی ہمیں نہلائے گا۔

مریدین میں سے دو ایک نے پھر ہمت کی اور اپنے مرشد سے کہا کہ شرف الدین سخت دوپہر میں پیدل چل کر آیا ہے۔ یہ تھکا ہارا آیا ہے لہٰذا آپ یہ خدمت ہمیں انجام دینے کی اجازت دیں مگر اس بار بھی پیر سید امام الدین نے اپنے مریدین کی بات کو منظور نہیں کیا اور وہی بات دھرائی کہ ہمیں یہی شرف الدین جو سخت چلچلاتی دھوپ میں پیدل سفر طے کر کے آیا ہے یہی ہمیں نہلائے گا۔

مرشد کا دو ٹوک فیصلہ سن کر تمام مریدین خاموش ہو گئے۔ اب قبلہ والد صاحب میاں شرف الدین حضرت پیر سید امام الدین نوشاہی بزرگ کے ساتھ قریب ہی واقع کنوئیں پر چلے گئے۔ پیر صاحب زمین پر بیٹھ گئے اور شرف الدین خان نے کنوئیں کا ٹھنڈا پانی نکال نکال کر پیر صاحب کے جسم مبارک پر ڈالنا شروع کر دیا۔ تپتی دوپہر کی شدت میں کنوئیں کے ٹھنڈے پانی سے نوشاہی بزرگ کی طبیعت سیراب ہو رہی تھی اور پھر اسی سیرابی کی کیفیت میں حضرت پیر امام الدین نے نہلانے والے شرف الدین کو دعائیں دینا شروع کر دیں۔

واہ بھئی شرف الدین واہ تم نے ہمیں خوش کیا خدا تمہیں خوش کرے۔
تم نے ہمیں ٹھنڈا کیا خدا تمہاری نسل کو سرسبز و شاداب کرے۔
تم نے ہمیں سیراب کیا خدا خوشیوں سے تمہاری آل اولاد کی جھولیاں بھر دے۔

جوں جوں میاں شرف الدین نوشاہی بزرگ حضرت پیر امام الدین شاہ کے جسم مبارک پر کنوئیں کا ٹھنڈا پانی ڈالتے تھے۔ نوشاہی بزرگ اپنے خزانے کے لعل و گہر دعاؤں کی صورت شرف الدین پر نچھاور کرتے تھے۔

حضرت پیر امام الدین نوشاہی بزرگ کے آستانے سے مرادوں کی جھولیاں بھر کر جب شرف الدین خان واپس اپنے مرشد پیر سید حسین شاہ کے آستانے پہنچے تو ان کی دنیا ہی بدل چکی تھی نوشاہی بزرگ کی دی ہوئی بد عا اب بفضل تعالیٰ دعا میں بدل چکی تھی یہ زندہ معجزہ ہے کہ ہماری نسل میں عرصہ دراز بعد صرف میرے والد میاں شرف الدین خان کو اللہ تعالیٰ نے اولاد سے نوازا اور میرے علاوہ مبارک علی صادق علی اور اقبال محمد ہم چار بھائی اور ایک بہن خدیجہ بی بی پیدا ہوئے جب کہ میرے والد صاحب کے بڑے بھائی تایا جی فضل محمد بھی دو شادیوں کے باوجود لاولد ہی اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ سب بزرگوں کی دعا ہے اور خدا کو ایسا ہی منظور تھا کہ یہ نسل آگے بڑھے پھلے پھولے۔

سادھو بولے یہ سبھا
سادھو کا بولا ورتھ نہ جا

میاں شرف الدین خان کی شادی

میرے والد محترم میاں شرف الدین خان کی ایک پھوپی زاد بہن موضع "ڈالہ" ریاست کپور تھلہ میں رہتی تھیں "موضع ڈالہ" ہی کے ایک گھرانے میں میرے والد صاحب کی انہی پھوپھی زاد بہن نے رشتہ کی بات چلا رکھی تھی۔ لڑکی والے اچھے کھاتے پیتے زمیندار تھے۔ ان کی زرعی زمین اور اپنے کنوئیں تھے۔ اپنے معیار کو دیکھتے ہوئے لڑکی والوں کو

میرے والد بالکل پسند نہیں تھے بلکہ ان کی نظر میں رشتہ کی بات انتہائی فضول اور بکواس قسم کی بات تھی۔ ہمارے والد صاحب کو ناپسند کرنے کی بہت سی وجوہات تھیں مثلاً والد صاحب کا کوئی سرپرست موجود نہ تھا۔ ان کے ایک بڑے بھائی تھے۔ میاں جی فضل محمد تو وہ اپنی ملازمت کی وجہ سے کلکتہ مدراس بمبئی رہتے تھے اور پیچھے گاؤں میں میاں شرف الدین تنہا یا پھر اوپر اللہ اور نیچے پیرو مرشد حسین علی شاہ اب ان حالات میں بھلا کون اپنی لڑکی دینے کو تیار ہو جاتا اور پھر جہاں والد صاحب کی پھوپھی زاد بہن نے بات چلائی تھی وہ گھرانہ یوں بھی بڑا زمیندار گھرانہ تھا۔

رشتے والی بات اڑتی اڑتی پیرو مرشد حسین علی شاہ تک پہنچی تو انہوں نے بھی اپنے مرید کے لئے تائید کرتے ہوئے لڑکی والوں سے کہلوایا مگر لڑکی والوں نے یہ کہہ کر "انہیں بھی انکار کر دیا کہ لڑکا مست ملنگ اور لاوارث ہے پیر مرشد سید حسین علی شاہ تک انکار اور وجہ انکار کے الفاظ پہنچے تو وہ بہت دل برداشتہ ہوئے یوں بات ختم ہو گئی اور مذکورہ لڑکی کا رشتہ ان کے بھائی میاں جی علی محمد نے کہیں اور طے کر کے شادی کی تاریخ بھی مقرر کر دی۔ میرے والد صاحب ان حالات کی وجہ سے اندر ہی اندر سلگ رہے تھے اور انہیں کسی کروٹ چین نہیں مل رہا تھا۔ پیرو مرشد نے مرید کی یہ حالت دیکھی تو فرمایا کہ فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں خدا بہتر کرے گا۔"

ادھر مقررہ تاریخ پر بارات آگئی مگر لڑکی اور لڑکے والوں میں عین شادی کے دن کوئی ایسی بات پیدا ہوئی کہ جس نے تنازعہ کی شکل اختیار کر لی اور بات اس قدر بڑھی کہ بارات واپس لوٹ گئی پھر میاں علی محمد (جو میرے ماموں تھے) نے اپنی بہن عمر بی بی (میری والدہ ماجدہ) کا رشتہ ایک اور جگہ طے کر دیا مگر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ دوسری مرتبہ بھی ویسا ہی کوئی اختلاف پیدا ہوا اور وہ بارات بھی واپس چلی گئی۔ اسی اثنا میں میرے والد میاں شرف الدین خان کے بڑے بھائی یعنی میرے تایا جی فضل محمد اپنی نوکری چھوڑ چھاڑ گاؤں لوٹ آئے' گاؤں آکر چھوٹے بھائی شرف الدین کو دیکھا تو وہ حیران پریشان ہو گئے۔ شرف الدین نے چولا پہن رکھا تھا اور اس کے شب و روز اپنے پیرو مرشد حضرت حسین علی شاہ کے آستانے پر گزر رہے

تھے۔ بعد میں تایا جی فضل محمد کو اپنے چھوٹے بھائی شرف الدین کے رشتے کی بات اور لڑکی والوں کے انکار کے بارے میں بھی ساری بات پتہ چلی۔ چھوٹے بھائی کے حالات سے تایا جی فضل محمد بھی بہت پریشان ہو گئے مگر وہ بھی مجبور تھے اور ان حالات کو اپنے چھوٹے بھائی کے حق میں تبدیل نہیں کر سکتے تھے اور اس میں بنیادی وجہ لڑکی والوں کا بڑا زمیندار ہونا تھا اور وہ بھی یہ سوچ کر چپ ہو گئے تھے کہ بھلا اتنے بڑے زمیندار اپنی بیٹی ایک ایسے نوجوان کے ساتھ کیسے بیاہ دیں کہ جس کا کوئی مستقبل ہی نہیں ہے اور پھر یوں بھی میرے والد شرف الدین خان صورت شکل کے اعتبار سے خاصے کم تر تھے جب کہ لڑکی بہت خوبصورت تھی غرضیکہ میرے والد شرف الدین خان کے پلے اگر کچھ تھا تو وہ یہی کہ وہ پیرو مرشد حضرت سید حسین علی شاہ کے منظور نظر تھے اور پھر ان کے پیرو مرشد اپنے مرید صادق الیقین کو سرسبز و شاداب بھی دیکھنا چاہتے تھے اور یہ کہ نوشاہی بزرگ حضرت سید امام الدین کی دعاؤں نے بھی بارگاہ الٰہی میں مقبول ہونا تھا' اور پیرو مرشد حسین علی شاہ کی بھی یہی خواہش تھی کہ "ڈالے والے" میاں جی علی محمد کے گھر ہی اپنے مرید کو بیاہیں لہٰذا اسباب خود بخود پیدا ہو رہے تھے۔

ادھر لڑکی والے دو باراتیں لوٹنے پر بہت پریشان نظر آ رہے تھے۔ غرض کہ اللہ کی رضا کے آگے کسی کی نہیں چلتی جو اسے منظور ہوتا ہے وہی ہوتا ہے اور پھر خدا کا کرنا یوں ہوا کہ میرے والد میاں شرف الدین اور میاں جی علی محمد کی بہن کے رشتے کے بارے میں ایک پنچائت پھر سے بیٹھی اور اس پنچائت کے سرپنچ پیرو مرشد حضرت سید حسین علی شاہ ٹھہرے۔ دونوں طرف کے لوگ اکٹھے ہوئے۔ رشتے کی بات شروع ہوئی گفتگو سوچ بچار' بحث و مباحثہ کے بعد بالآخر رشتے کا معرکہ اللہ کے نیک بندے کی سربراہی میں خوش اسلوبی سے طے پا گیا اور لڑکی والے مان گئے اور شادی کی تاریخ مقرر ہو گئی۔

شادی کا مقررہ دن آیا تو پیرو مرشد حضرت حسین علی شاہ کی سربراہی میں ہمارے والد صاحب میاں شرف الدین خان کی بارات ہمارے گاؤں میانی افغاناں سے "ڈالے" کی طرف روانہ ہوئی اور نہایت خوشی خوشی پیرو مرشد حضرت حسین علی شاہ دلہن کی ڈولی لے کر

میانی افغاناں لوٹے۔

یہ سب بزرگوں کی دعاؤں کا فیض تھا کہ خدا تعالیٰ نے اپنی رحمت سے میرے والد محترم میاں شرف الدین خان کو یہ شرف بخشا کہ خطاؤں کے نتیجہ میں ملنے والی بدعائیں بزرگوں کی خدمت کے عوض دعاؤں میں تبدیل ہو گئیں اور میاں شرف الدین خان کا باغ سرسبز و شاداب ہوا اور اس باغ کا ایک پھول حبیب احمد جالب ہے کہ جو میاں شرف الدین خان کا پوتا ہے۔ یہ باغِ شرف الدین کا وہ پھول ہے کہ جس کی خوشبو حق و صداقت اور جرات و بیباکی کی پہچان ہے۔

بابر بادشاہ اور ہمایوں والا قصّہ

میرے والد محترم میاں شرف الدین اور والدہ ماجدہ عمر بی بی ان دونوں کو اللہ نے چار بیٹے یعنی میں عنایت اللہ، مبارک علی، صادق علی، اقبال محمد اور ایک بیٹی خدیجہ بی بی عطا کیے۔ ہماری والدہ صاحبہ بے حد خوبصورت تھیں خاندان والے اکثر کہتے ہیں کہ میں نے اپنی ماں کی صورت پائی ہے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ بچوں میں سب سے بڑا ہونے کی وجہ سے مجھے اپنے والدین کی خصوصی توجہ حاصل تھی۔ والدین کو پیار تو اپنی تمام اولاد سے ہوتا ہی ہے مگر بڑا بچہ ایک خاص توجہ حاصل کر ہی لیتا ہے سو وہی توجہ مجھے بھی حاصل تھی جب میں سولہ، سترہ سال کی عمر کو پہنچا تو ایک بار مجھے شدید بیماری نے آگھیرا۔ والدین نے مقدور بھر علاج کروایا مگر بیماری کی شدت میں اضافہ ہی ہوتا گیا حتیٰ کہ میں چارپائی سے جالگا اور میرے زندہ بچ رہنے کی امید بھی جاتی رہی۔ دوا دارو نے اثر کرنا بالکل چھوڑ دیا تھا اور میں دنوں کا مہمان نظر آنے لگا تھا۔ میرے والدین کی پریشانی کا اندازہ ہر صاحب اولاد خوب لگا سکتا ہے کہ خدانخواستہ جن کا سولہ سترہ سال کا جوان بیٹا لبِ مرگ پڑا ہو۔ سو میرے والدین اور خصوصاً میری والدہ بے حد پریشان تھیں۔ میرے زندہ بچنے کی کوئی امید نہیں تھی۔ ایسے میں میری والدہ صاحبہ کو کسی نے بابر بادشاہ اور اس کے بیٹے ہمایوں کا قصہ سنادیا کہ بابر بادشاہ کا بیٹا

ہمایوں ایک بار اس قدر شدید بیمار پڑا کہ شاہی طبیبوں تک نے جواب دے دیا کہ یہ شہزادہ تندرست نہیں ہو سکے گا اور اب موت ہی اس کا مقدر ہے۔ تب چاروں جانب سے مایوس و نامراد ہو کر بادشاہ وقت نے خدا کے حضور سر جھکا دیا اور اپنی جان کے بدلے اپنے بیٹے ہمایوں کی زندگی چاہی اور پھر اپنے بیٹے ہمایوں کے پلنگ کے گرد سات چکر کاٹ کر خدا کے حضور اپنے بیٹے کے لئے درازی عمر کی دعا کی اور خدا نے بابر بادشاہ کی دعا قبول کرتے ہوئے۔ اس کے بیٹے ہمایوں کو نئی زندگی عطا کر دی۔ اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد بابر بادشاہ خود وفات پا گیا۔ میری والدہ صاحبہ بھی بابر بادشاہ کے قصے سے بہت متاثر ہوئیں۔ اور ماں کی ممتا کی خاطر انہوں نے بھی بابر بادشاہ کی طرح میری چارپائی کے گرد سات چکر کاٹے۔ اور ہر بار اپنا سر میرے سر سے لگایا خدا کے حضور میری صحت کے لئے دعا کی اور پھر وہی ہوا' جو بابر بادشاہ کے ساتھ ہوا تھا میں چند ہی دنوں میں تندرست ہو گیا' مگر میری والدہ صاحبہ کچھ ہی عرصہ بعد وفات پا گئیں۔ واقعی ماں کے رشتے جیسا کوئی اور رشتہ خدا نے بنایا ہی نہیں ہے۔ ماں بے لوث اپنی اولاد سے پیار کرتی ہے۔ آج بھی جب کبھی میں اپنی ماں کی اس قربانی کے بارے میں سوچتا ہوں تو ماں کی شکل نگاہوں میں گھوم جاتی ہے' جیسے وہ مسکرا رہی ہوں بہت خوش ہوں اور پھر میں سوچتا ہوں کہ اللہ کے کام اللہ ہی جانتا ہے اور وہی سمجھتا ہے۔

میرے تایا جی فضل محمد نے شادی کی مگر ان کے کوئی اولاد نہ ہو سکی اور پھر ان کی بیوی بھی وفات پا گئیں۔ والدہ محترمہ کی وفات کے بعد والد محترم نے بھی دوسری شادی نہیں کی۔ والدہ صاحبہ کی وفات کے وقت ہم چار بھائی اور ایک بہن میں دو بھائی یعنی میں اور مجھ سے چھوٹا مبارک علی بالغ تھے جب کہ بہن خدیجہ' صادق علی بہت چھوٹے تھے جبکہ ہمارا سب سے چھوٹے بھائی اقبال محمد تو اتنا چھوٹا تھا کہ اس نے والدہ صاحبہ کو دیکھا بھی نہیں۔ گھر کے حالات کو دیکھتے ہوئے میری شادی گاؤں میانی افغاناں ہی کے میاں احمد بخش کی سب سے چھوٹی بیٹی رابعہ بصری سے کر دی گئی۔ (کہتے ہیں ناموں کا شخصیت کی ساخت پر بڑا اثر ہوتا ہے اور یہ بات درست ہی ہے میری اہلیہ بظاہر درمیانے قدو قامت کی مالک رابعہ بصری کو قدرت نے فولادی ہمت و حوصلہ عطا فرمایا ہے۔) رابعہ بصری سے میری شادی ہونے میں بھی

خدا کی مصلحت شامل تھی کیونکہ یہ رابعہ بصری ہی وہ کردار ہے جس نے گلستان شرف الدین کے اپنے حصہ کو اس طرح سینچا کہ انسانیت کی تاریخ کا حصہ بنادیا۔ حبیب جالب کے باپ ہونے کے ناتے اس کی شخصیت کی ساخت میں میرا حصہ بہت ہی کم ہے جب کہ وہ ہو بہو اپنی ماں ہے۔ وہی جلال' وہی خودداری' وہی حق گوئی' وہی منہ پر آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کا شیوہ۔ بڑے بڑوں سے ٹکرا جانے کا حوصلہ' انتھک محنت' لگن' صبر' استقامت یہ تمام خوبیاں حبیب کو اپنی ماں کی طرف سے ورثہ میں ملی ہیں۔

پیدائش مشتاق حسین مبارک

میرا سب سے بڑا بیٹا ۱۰ جنوری ۱۹۲۱ کے دن پیدا ہوا بچے کی پیدائش پر ازراہ خیر و برکت اسے پیرو مرشد بابا حسین علی شاہ کی جھولی میں ڈالا گیا جنہوں نے بچے کو پیار کیا اور دعائیں دیں اور پھر اپنے پیرو مرشد ہی کی کنیت سے بچے کا نام مشتاق حسین رکھا گیا۔

مشتاق کے ساتھ ساتھ میری بیوی رابعہ بصری کے ذمہ میرے چھوٹے بھائی اقبال محمد کی پرورش کی ذمہ داری بھی تھی جو مشتاق سے دو سال ہی بڑا تھا۔ میرا بھائی صادق اور بہن خدیجہ تو خاصے بڑے سمجھدار تھے لیکن یہ دونوں بھی ابھی بچے ہی تھے جب کہ میرا بھائی مبارک علی سمجھدار بالغ جوان تھا۔ والدہ صاحبہ کے انتقال کے بعد خصوصاً تیرہ چودہ سالہ بہن خدیجہ کی ذمہ داری میری بیوی رابعہ بصری کے سپرد تھی اور سب سے چھوٹے بھائی اقبال محمد نے تو ماں کو دیکھا ہی نہیں تھا اس کے لئے تو ماں رابعہ بصری ہی تھی اور اس اقبال محمد نے اس رشتے کو ہمیشہ نبھایا۔ ویسے میرے سارے ہی بہن بھائیوں نے میری بیوی کو ہمیشہ ماں ہی کا درجہ دیا اور اسی طرح عزت و احترام کیا۔

میرے آٹھ بیٹے اور ایک بیٹی پیدا ہوئی۔ مگر لمبی عمر چار بیٹوں اور بیٹی نے پائی اور اتفاق ہے کہ درمیان کے بچے کم عمری ہی میں فوت ہوتے گئے۔ مشتاق کے بعد اشفاق کم عمری میں فوت ہو گیا۔ حبیب کے بعد نثار فوت ہو گیا۔ رشیدہ کے بعد مجید فوت ہو گیا۔ حمید کے بعد ممتاز

فوت ہوگیا اور سب سے چھوٹا بیٹا سعید اختر پرویز ہے۔

حبیب احمد جالب کی پیدائش

میرا بیٹا حبیب احمد جالب ۲۴ مارچ ۱۹۲۸ مطابق یکم شوال ۱۳۴۶ ہجری بروز ہفتہ صبح ساڑھے آٹھ بجے عید الفطر کے دن پیدا ہوا۔ ماہ صیام اپنی تمام تر رونقوں سمیت رخصت ہوچکا تھا۔ عید کا چاند نظر آنے کا اعلان ہمارے گاؤں کے ماسٹر محمد دین نے نقارے پر چوٹ لگا کر کردیا تھا۔ روزے دار، عید سعید کی خوشی میں سرشار نعرہ تکبیر، نعرہ رسالت بلند کر رہے تھے۔ گولے چل رہے تھے کیونکہ صبح عید تھی۔ اہل اسلام عید کی خوشی میں چاند رات جاگ کے گزارتے ہیں۔ لوگ خرید و فروخت میں مصروف رہتے ہیں۔ سکھی سہیلیاں اپنے عید کے جوڑوں کو گوٹا کناری لگاتی ہیں۔ ہاتھوں پر مہندی لگائی جاتی ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ بہت سے اللہ کے نیک و صالح بندے چاند رات عبادت و ریاضت میں بھی گزارتے ہیں۔

ایک چاند رات ہم نے بھی جاگ کر گزاری تھی۔ تمام رات رابعہ بصری تکلیف میں مبتلا رہی حتیٰ کہ صبح کے چھ بج گئے میاں کے دیوان خانے سے بار بار نماز عید کے جلوس کی روانگی کا اعلان ہو رہا تھا۔ آہستہ آہستہ گاؤں کے لوگ میاں کرار خان کے دیوان خانے کے باہر جمع ہو رہے تھے۔ جلوس کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ میاں کرار خان بار بار لوگوں سے میرے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ لوگ بار بار مجھے بلانے کے لئے گھر کے چکر بھی لگا رہے تھے مگر میری مجبوری تھی۔ میں ایسی نازک حالت میں اہلیہ کو چھوڑ کر نہیں جاسکتا تھا حتیٰ کہ نماز عید کا جلوس میاں کرار خاں کے دیوان خانے سے روانہ ہوگیا۔ میں گھر کے صحن میں بیٹھا پردہ غیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے اس کا منتظر تھا' رابعہ بصری کی نابینا ماں کوٹھری میں اپنی بیٹی کے پاس موجود تسبیح کر رہی تھی اسی اثنا میں کسی نے کوٹھری سے باہر آکر مجھے مبارکباد دیتے ہوئے بتایا کہ بفضل تعالیٰ بیٹا پیدا ہوا ہے اور زچہ بچہ دونوں خیریت سے ہیں یہ سب کچھ سن کر میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور گھر سے باہر نکل کر عید گاہ کی طرف تیزی سے بھاگا' نماز عید کا جلوس

پولیس چوکی تک پہنچ چکا تھا کہ جب میں نے جلوس کو جالیا' میرے جلوس میں شامل ہونے اور بیٹے کی پیدائش کی خبر سن کر تمام لوگ بہت خوش ہوئے۔ میں نے نماز عید ادا کی اور یوں بارگاہ ایزدی میں شکرادا کیا۔ یہ وہ مبارک عید تھی کہ جب خدا کی رحمت سے میرے گھر شیر دل بیٹے حبیب احمد نے جنم لیا جسے دنیا حبیب جالب کے نام سے جانتی ہے۔ یہ چاند رات کا چاند ہے جو مانند آفتاب دنیا میں طلوع ہوا کبھی نہ غروب ہونے کے لئے۔ میری دعا ہے کہ خدا اس کی عمردراز کرے (آمین)

سبحان اللہ کیا مبارک عید تھی کیا خوشی و مسرت کا دن تھا کہ جب دنیائے اسلام میں عید منائی جارہی تھی۔ ماہ صیام رخصت ہو چکا تھا۔ مسلمانان عالم عید کی خوشیوں میں جلوس نکال رہے تھے۔ نعرہ تکبیر اور نعرہ رسالت بلند ہورہے تھے ہر سو ذکر خدا ورد زبان تھا۔ خوش گلو نعت خواں پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور نذر گذار رہے تھے ایسی ہی ایک سہانی صبح عید تھی کہ جب حبیب جالب پیدا ہوا یہ نوید صبح بن کر دنیا میں آنے والا یہ روشنیوں کا دلدادہ 'یہ اجالوں کا متوالا' یہ اندھیروں کا دشمن' تاریکیوں سے متنفر اس کی پیدائش صبح ساڑھے آٹھ بجے ہوئی کہ جب رات کی سیاہیوں کا سینہ چیرتے ہوئے انوار و تجلیات کا سورج آب و تاب سے چمک رہا تھا۔

حبیب جالب کی پیدائش اس زمانے میں ہوئی کہ جب ہندو مسلم اتحاد اپنے عروج پر تھا اور پورا ہندوستان انگریز کے خلاف سیسہ پلائی ہوئی دیوار بنا ہوا تھا اور آزادی کے نعروں سے فضا گونج رہی تھی اس فضا میں حبیب جالب کی پیدائش ہوئی۔

حضرت بابا میرے شاہ صاحب کی دعا

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ میرا چھوٹا بیٹا حبیب اس وقت اس کی عمر تین سال ہوگی سخت بخار میں مبتلا ہوگیا شام میں اسے بخار ہوا اور رات ہوتے تک بخار کی شدت میں اضافہ ہوگیا جوں جوں رات گزر رہی تھی بخار کا زور ٹوٹنے کی بجائے اس کی شدت میں مسلسل اضافہ

ہو رہا تھا حبیب مجھ سے بہت مانوس تھا اسی لئے میں نے ہی اسے اپنی گود میں لے رکھا تھا۔
گرمی کا موسم 'اور بخار کی شدت کے باعث حبیب بار بار چیخ مار کر میری بغل میں گھس جاتا یوں جیسے وہ کسی سے خوفزدہ ہو۔ گرمی کی وجہ سے ہم دونوں میاں بیوی بچے کو لے کر چھت پر آ گئے ہمارا خیال تھا کہ کھلی فضا میں بچے کو کچھ سکون ملے گا مگر بچے کی کیفیت میں کوئی فرق نہیں آیا اور بخار مسلسل اسی شدت کے ساتھ موجود رہا۔ ہم دونوں میاں بیوی قرآنی آیات پڑھ پڑھ کر حبیب کو دم درود کر رہے تھے حتیٰ کہ اسی تگ و دو میں آدھی رات بیت گئی مگر بچے کو کوئی افاقہ نہیں ہوا آدھی رات گئے حبیب کی ماں نے مجھے بتایا کہ شام کے وقت مجھے حضرت بابا میرے شاہ صاحب کی آواز سنائی دی تھی حبیب اس وقت گھر کے دروازے پر کھڑا تھا اور بابا میرے شاہ صاحب بڑی اونچی آواز میں کہہ رہے تھے کہ شام کے وقت بچے کو گھر کے دروازے پر مت کھڑا ہونے دیا کرو' بچے کو اندر کر لو۔

حبیب کی ماں نے یہ واقعہ سنا کر مجھے کہا کہ سنا ہے بابا میرے شاہ صاحب گولے آرائیں کے گھر تشریف لائے ہوئے ہیں کیوں نہ ہم حبیب کو لے کر بابا جی کی خدمت میں حاضر ہو جائیں تاکہ وہ بچے کو دم درود کریں۔ حبیب کی ماں کی بات سن کر میں سوچ میں پڑ گیا آدھی رات گزر چکی تھی باہر گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ گاؤں دیہات کی اندھیری رات کہ جہاں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا ایسے میں دوسرے محلے جانے کے خیال ہی سے بدن میں جھرجھری سی آئی مگر بچے کی تکلیف بھی ناقابل برداشت تھی لہٰذا ہم دونوں میاں بیوی خدا کا نام لے کر گھر سے بابا میرے شاہ صاحب کی طرف روانہ ہو گئے میں نے حبیب کو اٹھا رکھا تھا گاؤں کی خاموش سنسان اور اندھیری رات میں ہم دونوں میاں بیوی بچے کو لئے جا رہے تھے حتیٰ کہ گولے آرائیں کے گھر کے دروازے پر ہم نے پہنچ کر دروازہ کھٹکھٹایا اتنی رات گئے دروازے پر دستک سن کر گولے آرائیں کے گھر والے پریشان ہو گئے بابا میرے شاہ صاحب بھی نیند سے بیدار ہو گئے تھے۔ ہم بابا جی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حبیب کے بارے میں انہیں بتایا بابا میرے شاہ صاحب نے بچے کو دَم کیا اور مجھے بھی چاروں قل اور اول آخر درود شریف پڑھنے کا طریقہ بتایا اور پھر فرمایا کہ اس طرح بچے کو دَم کرو اور آیت البقرہ

وماانفقتم نفقتہ او نظرۃ من نذر یہ آیت بھی پڑھ کر دم کرو۔

بابا میرے شاہ صاحب کی خدمت میں حاضری دے کر ہم بچے کو لے کر گھر آگئے میں بابا جی کی بتائی ہوئی قرآنی آیات پڑھ پڑھ کر بچے کو دم کرتا رہا مگر بچے کی حالت میں کوئی فرق نہیں پڑ رہا تھا۔ بچہ بدستور بخار میں تپ رہا تھا اور بار بار چیخ مار کے میری بغل میں گھس جاتا تھا ایسے جیسے وہ خوفزدہ ہو۔ بچہ اپنا ہاتھ بھی بار بار منہ میں ڈالتا تھا اس کی حالت عجیب ہو رہی تھی میں بابا جی کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق حبیب کو آیات قرآنی پڑھ پڑھ کر پھونکیں مار رہا تھا اور پھر اچانک اسی حالت میں مجھے نیند نے آگھیرا۔ میں نیم غنودگی کی حالت میں تھا کہ مجھے ایک بہت ہی خوفناک آواز سنائی دی کوئی کہہ رہا تھا "تم بڑی تحصیل میں پہنچ گئے ورنہ ہم بچے کو لے جاتے۔" یہ آواز اور الفاظ سن کر میرا کلیجہ ہل گیا اور میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ میں نے حبیب کو دیکھا بخار ویسا ہی تھا مگر اب مجھے عین تسلی ہو گئی تھی کہ میرا حبیب روبہ صحت ہو جائے گا اور پھر صبح ہوتے ہوتے واقعی بچے کا بخار بہت ہلکا ہو گیا۔ دوسرے دن اللہ کے ایک اور نیک بندے بزرگ سائیں لانے شاہ ہمارے گھر تشریف لائے حبیب کو بیمار دیکھ کر سائیں لانے شاہ نے بھی اسے دم درود کیا اور بچے کی صحت کے لئے دعا کی' دعا کے بعد سائیں جی نے بابا میرے شاہ کے بارے میں پوچھا تو میں نے انہیں بتایا کہ بابا جی محلہ بنگلہ میں گولے آرائیں کے گھر تشریف لائے ہوئے ہیں مگر پھر پتہ چلا کہ بابا میرے شاہ صاحب جالندھر تشریف لے جا چکے ہیں۔ سائیں لانے شاہ صاحب ہمارے گھر ہی پر موجود تھے۔ بچے کی حالت کے پیش نظر سائیں جی کی موجودگی ہمارے لئے بہت ہی حوصلہ و تسلی کا باعث بنی ہوئی تھی۔ سائیں لانے شاہ ادھر ادھر کی باتیں کر رہے تھے۔ باتیں کرتے کرتے اچانک انہوں نے مجھے کہا کہ بھئی حضرت سخی سرور سلطان کا عرس شریف شروع ہو گیا ہے چلو ہم دونوں عرس میں شرکت کے لئے کپور تھلے چلیں۔

سائیں جی کی بات سن کر میں سوچ میں پڑ گیا بچہ ابھی مکمل طور پر صحت یاب نہیں ہو پایا تھا ایسی حالت میں بچے کو چھوڑ کر میں کیسے جا سکتا تھا اور جب کہ بچہ مجھ سے بے حد مانوس ہونے کی وجہ سے میرے بغیر رہ بھی نہیں سکتا تھا مگر دوسری طرف سائیں لانے شاہ کا کہنا میرے

لئے حکم کا درجہ رکھتا تھا اور پھر حضرت سخی سرور سلطان کا عرس شریف آخر میں نے سائیں لانے شاہ کے حکم پر حضرت سخی سرور سلطان کے عرس میں شریک ہونے کا فیصلہ کرلیا اور اللہ کا نام لے کر سائیں لانے شاہ صاحب کے ساتھ میانی افغاناں سے کپور تھلہ روانہ ہوگیا مگر راستے بھر ایک لمحے کے لئے بھی میرا دھیان حبیب کی طرف سے نہ ہٹ سکا۔ دراصل حبیب مجھے بچپن سے ہی بہت پیارا لگتا ہے۔ کپور تھلے پہنچ کر حضرت سخی سرور سلطان کی درگاہ کے گدی نشین سے ملاقات ہوئی اور میں نے ان کی خدمت میں اپنے بچے حبیب کی صحت یابی کے لئے دعا کرنے کی التجا کی انہوں نے حبیب کے لئے بطور خاص دعا فرمائی اور پھر بچے کا احوال سن کر فرمایا کہ بچہ جب سات سال کی عمر کو پہنچ جائے تو اسے کپور تھلہ عرس شریف میں نیاز کے ساتھ حاضری کے لئے لانا اور پھر نیاز کے بارے میں بتایا کہ حسب توفیق نقارہ بنایا جائے جسے بچہ خود بجاتا ہوا حضرت سخی سرور سلطان کی نیاز لے کر حاضری دے انشاء اللہ بچہ صحت مند اور عمر دراز پائے گا۔

میلہ حضرت سخی سرور سلطان کا آج پہلا دن تھا میلہ آٹھ یوم تک رہنا تھا۔ سائیں لانے شاہ مجھ سے بولے کہ اب بچے کی طرف سے اطمینان ہوگیا ہے لہٰذا عرس کے اختتام تک درگاہ پر قیام کریں گے۔ مگر میں اپنے لخت جگر کے لئے بے چین تھا۔ جسے میں بیمار چھوڑ آیا تھا۔ ان حالات میں میرے رکنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ لہٰذا میں نے بڑے ادب کے ساتھ روانگی کی اجازت چاہی۔ سائیں لانے شاہ نے ہرچند مجھے روکنا چاہا مگر میں نہ رک سکا۔ سائیں جی آخر بولے کہ دیکھو عنایت تم آج اپنے گاؤں نہیں پہنچ سکو گے مگر اس کے باوجود بھی میں اللہ کا نام لے کر کپور تھلہ سے جالندھر ہوتا ہوا رات کے نو بجے ٹانڈہ کے ریلوے اسٹیشن پہنچ گیا۔

ٹانڈہ تو میں پہنچ گیا مگر رات کے نو بج چکے تھے اور مجھے سائیں لانے شاہ یاد آرہے تھے کہ جنہوں نے کہا تھا کہ تم آج اپنے گاؤں نہیں پہنچ سکو گے۔ ٹانڈہ کے اسٹیشن پر میں کھڑا تھا کانوں میں سائیں جی کے الفاظ اور نظروں کے سامنے ان کا چہرہ۔

تم آج اپنے گاؤں نہیں پہنچ سکو گے۔"

باباميرے شاہؒ

اور واقعی میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ ٹانڈہ سے پانچ میل کا پیدل سفر کیسے طے کرسکوں گا۔ اندھیری رات کوئی ساتھی بھی نہیں کوئی سواری بھی نہ مل سکے گی مگران تمام مجبوریوں کے باوجود اپنے بیمار لخت جگر کی خاطر مجھے گاؤں پہنچنا تھا جتنی جلدی ممکن ہوسکے مجھے گھر پہنچنا تھا اور پھر یہ سوچ کر خطرناک راستے کی پرواہ کئے بغیر اندھیری رات میں' میں پیدل ہی سڑک سوار ہوگیا' ٹانڈے سے انے دی کھوئی (اندھے کنواں) تقریباً ایک میل کے فاصلے پر تھی جب میں اس جگہ کے قریب پہنچا تو میں نے محسوس کیا کہ ادھر سے میں اور میری مخالف سمیت سے کوئی اور مسافر آرہا ہے اندھیرا اس قدر تھا کہ کوئی شے نظر نہیں آرہی تھی میں ادھر سے اور وہ ادھر سے اپنی اپنی دھن میں مگن چلے آرہے تھے کہ دونوں زوردار طریقے سے آپس میں ٹکراگئے اور پھر وہ مجھ سے اور میں اس سے خوفزدہ ہوکر اپنی اپنی سمت میں بھاگے۔

بھاگتے بھاگتے میں نے پیچھے مڑکر دیکھا تو مجھے کچھ بھی نظر نہیں آیا ہاں البتہ کوئی بھاگا چلا جارہا تھا اللہ ہی بہتر جانے کہ وہ کون تھا۔ اس وقت میری عجیب حالت تھی خوف کے مارے میرا برا حال تھا۔ میں نے "ناد علی" کا ورد شروع کردیا اور تیز تیز قدم اٹھاتا اپنے گاؤں کی طرف چلتا رہا اپنے بیمار بیٹے حبیب کا خیال بھی مجھے آرہا تھا۔ اسی تانے بانے میں ایک پل آگیا اور پھر کسی غیبی طاقت نے مجھے سائیں قائم شاہ کی کھوئی پر پہنچادیا۔ وہ رات میں کبھی نہیں بھول پاؤں گا کہ جب اپنے بیمار بیٹے کی محبت میں' میں نے اپنی جان کو خطرے میں ڈال دیا تھا یہ میں حقیقتاً" سچ لکھ رہا ہوں کیونکہ رات میں ٹانڈے سے میانی کا سفر بہت خطرناک سمجھا جاتا تھا راستے میں چور ڈاکوؤں کا بھی خطرہ رہتا تھا مگر یہ سب بزرگان دین کا فیض تھا کہ میں بحفاظت اپنی منزل تک پہنچ گیا تھا۔ اب سلوتر خانے کی عمارت میری نظروں کے سامنے تھی اور پھر فوراً ہی ایک گلی طے کرکے میں بخیریت تمام گھر پہنچ گیا۔ اس وقت رات کے گیارہ بج رہے تھے اور گنگو چوکیدار کی آواز آرہی تھی۔

جاگتے رہنا بھئی اوے۔

میں گھر میں داخل ہوا تو دیکھا کہ حبیب کو اس کی ماں گود میں لئے ہوئے تھی پاس ہی

حبیب کی نانی گو ماں تسبیح لئے بیٹھی تھی اور پڑھ پڑھ کر دم کر رہی تھی میں نے حبیب کے ماتھے پر اپنی ہتھیلی رکھی اسے بخار تھا۔

اچھا ہوا تم آگئے بچے نے ابا جی ابا جی کی رٹ لگا رکھی تھی۔

حبیب کی نابینا نانی نے مجھ سے کہا۔

مجھے دیکھ کر حبیب اپنی ماں کی گود سے اتر کر میری گود میں آگیا اور پھر مجھ سے لپٹ گیا۔

اتنی رات گئے کیسے پہنچے ہو؟

حبیب کی ماں نے مجھ سے پوچھا۔

تب میں نے سفر کا تمام حال بیان کیا کہ کس طرح ٹانڈے سے میانی تک پانچ میل کا فاصلہ میں نے طے کیا میرے باحفاظت پہنچنے پر حبیب کی نانی اور ماں دونوں نے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا پھر میں نے حضرت سخی سرور سلطان کی درگاہ کے سجادہ نشین کی حبیب کے لئے دعائے خیر اور سات سال کی عمر میں حبیب کی درگاہ سخی سرور سلطان پر حاضری کے بارے میں بتایا۔

خدا کے نیک بندوں کی برکت اور دعا سے میرا بچہ حبیب جلد ہی صحت یاب ہو گیا اور پھر سات سال کی عمر کو پہنچنے پر درگاہ حضرت سخی سرور سلطان کے سجادہ نشین صاحب کے حکم کے مطابق حسب توفیق نقارہ بنوایا گیا جسے بجاتے ہوئے حبیب نے حضرت سخی سرور سلطان کے مزار واقع کپور تھلہ حاضری دی۔

میری بہن خدیجہ کی شادی

میری والدہ عمر بی بی جنھوں نے میری بیماری کے دوران میری چارپائی کے سات چکر کاٹے تھے اور یوں میں تندرست ہو گیا اور میری ماں بابر بادشاہ کی طرح ابدی نیند جا سوئیں۔ ماں کے مرنے کے بعد میری اہلیہ رابعہ بصری ہی نے گھر کو سنبھالا تھا اور گھر میں اس وقت سب سے اہم مسئلہ میری چھوٹی بہن خدیجہ بی بی کی شادی کا تھا مگر خدا کے فضل و کرم سے اور بزرگوں کی دعاؤں کے طفیل یہ مسئلہ بہت جلد اس وقت حل ہو گیا جب جالندھر شہر کے بابو

شفیع کا رشتہ خدیجہ کے لئے آیا۔ لڑکا پڑھا لکھا اور ملازم تھا لہٰذا ہم نے ہاں کردی۔

خدیجہ بی بی کی شادی پر مرشد نا پیر حسین علی شاہ تشریف لائے ہوئے تھے۔ بارات جالندھر شہر سے آئی ہوئی تھی کہ عین موقع پر کسی نامعقول کا خط موصول ہوا جس میں تحریر تھا کہ رشتہ سوچ سمجھ کر کریں یہ لڑکا شفیع محمد خراب شخص ہے اور اس کے اپنی پڑوسن سے ناجائز تعلقات ہیں اور یہ تعلیم کے اعتبار سے بھی صرف مڈل پاس ہے۔

یہ خط تمام دوستوں اور گھر والوں نے پڑھا سبھی کو خط کے مندرجات پر بڑی تشویش لاحق ہوگئی سب پریشان ہوگئے۔ اس صورتحال میں حضرت پیرو مرشد حسین علی شاہ نے آگے بڑھ کر حالات کو سنبھالا اور فرمایا کہ یہ ایک سازش ہے لہٰذا آپ اس خط کی مطلق پرواہ نہ کریں اور اللہ کا نام لے کر نکاح پڑھواؤ آپ نے فرمایا۔

نمک کی بیڑی سمجھ کر چھوڑ دو اللہ خود ہی کھنڈ (چینی) کی کردے گا۔

اور حضرت پیرو مرشد سید حسین علی شاہ نے جیسا فرمایا تھا ویسا ہی خدا نے کر دکھایا واقعی نمک کی بیڑی کھنڈ کی بیڑی ثابت ہوئی اور خدا کے حکم سے خدیجہ کو گھر کا آرام ملا اللہ نے رزق دیا اور انتہائی لائق فائق اولاد عطا کی یہ سب حضرت پیر مرشد حسین علی شاہ کی دعا کا کرشمہ ہے۔

علم بڑی دولت ہے

ہر انسان اپنی زندگی کے بارے میں کوئی نہ کوئی مقصد ضرور رکھتا ہے اس کی کچھ تمنائیں آرزوئیں ہوتی ہیں جنہیں وہ پورا کرنے کی تگ و دو میں لگا رہتا ہے اور جذبہ کامل اور لگن سچی ہو تو خدا بندے کو اس کی محنتوں اور ریاضتوں کا پھل ضرور عطا کرتا ہے۔

میری بھی زندگی میں کچھ تمنائیں تھیں۔ آرزوئیں تھیں دراصل مجھے بچپن ہی سے پڑھنے لکھنے کا بہت شوق تھا مگر افسوس کہ میں ناسازگار حالات کی وجہ سے باقاعدہ کسی مدرسہ میں تعلیم حاصل نہ کرسکا مگر قرآن پاک میں نے اپنے ماموں میاں جی علی محمد سے پڑھا او چند درسی

کتابیں بھی ان سے پڑھیں بس یہی میری تعلیمی حیثیت ہے۔ میرا پڑھنے لکھنے کا شوق اب بھی جاری ہے مگر صرف اردو پڑھنے لکھنے تک ہی یہ عمل جاری ہے یہ حقیقت ہے کہ علم بڑی دولت ہے علم کے بغیر انسان قلاش ہے مفلس ہے میری تمنائیں میری آرزوئیں میرے خواب جو بغیر تعلیم کے ادھورے رہ گئے تھے۔

میں سوچا کرتا تھا کہ تعلیم حاصل کرکے بڑا افسر بن جاؤں گا یا بڑا شاعر بن جاؤں گا مگر یہ سب کچھ میں حاصل نہ کر سکا لیکن خدا کی ذات بھی کیا خوب بے نیاز ہے کہ اس ذات باری تعالیٰ نے میرے ذوق و شوق میری آرزو و تمنا میرے خوابوں کو حقیقت کا روپ یوں دیا کہ میری یہ دونوں آرزوئیں میرے دونوں بڑے بیٹوں کو عطا کردیں میرا بڑا بیٹا مشتاق مبارک محکمہ قلم و مطبوعات میں کلاس ون گز۔ٹڈ آفیسر ہے اور دوسرا بیٹا حبیب جالب نامور شاعر ہے۔

ہم خاندانی اعتبار سے کسی بھی قسم کی جاگیر کے مالک ہرگز نہیں تھے' اور ایسا ہمارے بزرگوں کی غیرت مند زندگی گزارنے سے عبارت تھا۔ ہمارے مورث اعلیٰ میاں خیرالدین نے انگریز سے وفاداری اور وطن سے غداری کرکے کوئی جاگیر حاصل کرلی ہوتی' تو آج ہم بھی "کچھ اور" ہی ہوتے' مگر خدا کا لاکھ لاکھ احسان ہے کہ ہم "کچھ اور" ہونے سے بچ گئے۔ اور آج ہم فخر سے سر اٹھا کے سینہ تان کے کہتے ہیں کہ ہم میاں خیرالدین جیسے حریت پسند کی اولاد ہیں کہ جنہوں نے انگریز کے خلاف وطن کی آزادی کے لئے جنگ لڑی۔

میانی افغاناں گاؤں میں ہماری کوئی ذاتی جائیداد نہ تھی' میں پیشہ کے اعتبار سے پنجابی کھسے پر طلع کا کام کرنے کا کاریگر تھا' میرے بنائے ہوئے جوتے' علاقے بھر میں بہت مشہور تھے۔ قرب و جوار کے بڑے بڑے زمیندار میرے ہی بنائے ہوئے جوتے پہنتے تھے' اس کے علاوہ شادی' بیاہ کے موقع پر بھی دولہا' دلہن میرے ہی بنائے ہوئے جوتے پہنتے تھے۔ میرے کام کے برعکس' میری بیوی رابعہ بصری کو حد درجہ شوق تھا' لگن تھی' کہ اس کے بچے تعلیم حاصل کرکے قلم کی روزی کمائیں' دفتر میں میز کرسی پر بیٹھ کر کام کریں۔ یہ رابعہ بصری کے اپنے بچوں کے مستقبل کے بارے میں خواب تھے۔ اور وہ اپنے خوابوں کو حقیقت بنانا چاہتی

تھی۔ اور پھر ہمارے خاندان میں پہلی بار ایسا ہوا کہ خاندان کے کسی بچے کو باقاعدہ مدرسے میں داخل کیا گیا اور وہ پہلا بچہ میرا بڑا بیٹا مشتاق حسین تھا۔ مشتاق کا مدرسہ میں داخلہ گاؤں کے بڑوں کو ایک آنکھ نہ بھایا' اور حیلے بہانے انہوں نے کہنا شروع کر دیا۔

کیا ضرورت ہے بچے کو پڑھانے کی۔

کیا کرے گا بچہ پڑھ لکھ کر!

یونہی دماغ خراب ہو گیا ہے تم لوگوں کا

میں گاؤں کے بڑوں کی باتیں سن کر خاموش ہو جاتا مگر میری بیوی رابعہ بصری "بڑوں" کے اعتراضات پر خاموش نہیں رہتی تھی بلکہ وہ فیصلہ کن انداز میں بڑوں سے کہتی کہ اب میرے بچے قلم کی روزی کمائیں گے۔ اب میرے بچے تعلیم ضرور حاصل کریں گے۔

مجھ میں تو حالات کا مقابلہ کرنے کی اتنی زیادہ ہمت نہیں تھی مگر رابعہ بصری بڑی باہمت اور سخت جان نکلی اور مشتاق کے بعد میرا دوسرا بیٹا حبیب احمد بھی مدرسے جانے لگا یوں ہمارے دونوں بیٹے تعلیم حاصل کرتے رہے۔ میں محنت مزدوری کرتا تھا اور میری بیوی رابعہ بصری بھی میرے ساتھ میرے کام میں ہاتھ بٹاتی تھی اور ساتھ ساتھ بچوں کی تعلیم کی بھی فکر وہی کرتی تھی۔ چٹی ان پڑھ ہونے کے باوجود وہ مشتاق اور حبیب کو لے کر بیٹھ جاتی اور ان سے کہتی کہ اونچی آواز میں سبق دھراؤ' ماں کے حکم پر دونوں بچے اونچی آواز میں اپنا اپنا سبق پڑھنے لگتے جس کے جواب میں رابعہ بصری ہوں۔ ہاں شاباش ٹھیک ہے کے الفاظ ادا کرتی رہتی اور یوں دونوں بچے یہی سمجھتے کہ ہماری ماں ہمارے سبق کو خوب سمجھتی ہے۔

ہمارے دونوں بچے مشتاق اور حبیب سال بہ سال تعلیمی میدان میں آگے بڑھتے رہے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا کہ ہمارے بچے پاس ہو جاتے اور گاؤں کے بڑوں کے بچے فیل اور پھر بڑوں کے بچے فیل ہونے پر اپنی تذلیل کا بدلہ یوں لیتے کہ وہ مل کر مشتاق اور حبیب کو مارتے ایسے ہی مظالم برداشت کرتے ہوئے' رابعہ بصری اپنے بچوں کو تعلیمی میدان میں آگے بڑھاتی رہی۔

میانی افغاناں میں اسکول صرف مڈل کلاس تک ہی تھا اور میٹرک میں داخلہ لینے کے لئے

بچوں کو قریبی قصبہ ٹانڈہ جانا پڑتا تھا جہاں ہائی اسکول موجود تھا جب مشتاق نے مڈل کا امتحان بورڈ سے پاس کرلیا تو ہم نے اسے ٹانڈہ ہائی اسکول میں داخل کردیا ٹانڈہ ہمارے گاؤں میانی افغاناں سے پانچ چھ میل کے فاصلے پر تھا بچے کا روزانہ ٹانڈے آنا جانا بہت مشکل تھا لہٰذا بچے کی سہولت کی خاطر ہم دونوں میاں بیوی بچوں سمیت اپنے گاؤں سے ٹانڈہ منتقل ہوگئے نویں جماعت پاس کرکے جب مشتاق دسویں جماعت میں پہنچا تو ہم دونوں میاں بیوی بہت خوش ہوئے اس زمانے میں میٹرک پاس ہونا ایک بڑا اعزاز سمجھا جاتا تھا۔ ہمارا بیٹا میٹرک میں آگیا تھا۔ امتحان قریب آنے پر میٹرک کی امتحانی داخلہ فیس بورڈ کو بھجوانے کا مرحلہ آن پہنچا تھا۔ اس موقع پر اسکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب نے مجھے بلوایا اور کہنے لگے کہ آپ اپنے بیٹے مشتاق کی امتحانی داخلہ فیس بورڈ کو مت بھجوائیں کیونکہ میں جانتا ہوں آپ کا بچہ پاس نہیں ہوسکے گا اور اگر یہ فیل ہوگیا تو اسے دوبارہ ٹانڈہ کے اسکول میں داخلہ نہیں مل سکے گا اور اس طرح آپ لوگ پریشان ہوجائیں گے۔ میں آپ کا بھلا چاہتا ہوں اور یہ سال میری ریٹائرمنٹ کا سال ہے مگر میں جاتے جاتے آرڈر کرجاؤں گا کہ آئندہ سال بھر کے لئے مشتاق کی فیس معاف کردی جائے' اس طرح بچہ ایک سال مزید محنت سے پڑھ لے گا اور آئندہ سال اعلیٰ پوزیشن کے ساتھ میٹرک پاس کرلے گا۔

ہم میاں بیوی اپنے بچے کو جلد از جلد میٹرک پاس دیکھنا چاہتے تھے اتنی طویل اور تھکادینے والی جدوجہد کے بعد اب منزل سامنے نظر آرہی تھی پھر بھلا ہم مزید ایک سال کیسے انتظار کرتے ہیڈ ماسٹر صاحب کی بات ہماری سمجھ میں نہیں آرہی تھی لہٰذا ہم نے ان کے مشورے کو رد کرتے ہوئے مشتاق کی میٹرک داخلہ امتحانی فیس بورڈ کو بھجوادی مشتاق نے میٹرک کا امتحان دیا مگر نتیجہ وہی نکلا جو ہیڈ ماسٹر صاحب نے کہا تھا۔

مشتاق کے فیل ہوجانے پر ہماری تو جیسے کمر ہی ٹوٹ گئی ہمیں اپنا مستقبل اندھیر نظر آنے لگا سارے خواب چکنا چور ہوگئے خصوصاً میں تو بالکل ہی حوصلہ ہار بیٹھا مگر مشتاق کی ماں ابھی حوصلہ نہیں ہاری تھی اس کی ہمت و حوصلہ میرے لئے ناقابل فہم تھا مگر وہ پورے یقین کے ساتھ ہمت و حوصلے کے ساتھ میدان میں ڈٹی ہوئی تھی۔

مشتاق اگلے سال پھر میٹرک کا امتحان دے گا رابعہ بھری کہہ رہی تھی اس کا لہجہ بڑا پر عزم تھا مگر اب مسئلہ ٹانڈہ کے ہائی اسکول میں دوبارہ داخلے کا تھا جو مشتاق کے فیل ہوجانے کی وجہ سے ممکن نہیں تھا۔

کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ مشتاق کو دوبارہ اسکول میں کیسے داخل کروایا جائے۔ میں نے اپنی سی کوشش کرڈالی منت سماجت کی لوگوں سے کہلوایا مگر سب بے سود اب تو بس ایک ہی صورت رہ گئی تھی کہ بچے کو "دسوہہ" ہوشیار پور یا جالندھر کے کسی اسکول میں داخل کیا جاتا مگر ہمارے حالات ہرگز ہرگز ایسے نہ تھے کہ اب ہم کسی اور نئی جگہ منتقل ہوجاتے۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ مسئلہ کیسے حل ہوگا۔ ہم پریشان تھے اور اس پریشانی کے عالم میں میرے ایک مہربان جناب ماسٹر سید محمد حسین کفیل صاحب فرشتہ رحمت بن کر ہماری مدد کو آگئے کفیل صاحب ہائی اسکول ٹانڈہ ہی میں ٹیچر تھے انہوں نے ہماری حتی المقدور مدد کرنے کی حامی بھرلی اور ہماری طرف سے ایک درخواست انسپکٹر آف اسکولز جالندھر ڈویژن کے نام لکھی جس میں یہ استدعا کی گئی تھی کہ ہمارے حالات کے پیش نظر ہمارے بچے مشتاق کے لئے ہائی اسکول ٹانڈہ میں دوبارہ داخلے کی خصوصی اجازت دی جائے۔

انسپکٹر آف اسکولز جالندھر ڈویژن کے نام درخواست بھیج کر ہم میاں بیوی نے مصلہ پکڑلیا اور خدا کے حضور گڑگڑا گڑگڑا کر دعائیں مانگنے لگے اور بالآخر خدا نے ہماری التجا کو قبول کرلیا۔ یوں انسپکٹر آف اسکولز جالندھر ڈویژن سے ہماری درخواست منظور ہوکر آگئی اور ہمارے بیٹے مشتاق کو ہائی اسکول ٹانڈہ میں دوبارہ داخلہ مل گیا مشتاق میٹرک میں فیل ہوجانے پر ہماری پریشانیوں کو دیکھتے ہوئے بہت ہی نادم تھا اور اسی احساس ندامت نے مشتاق کو پڑھائی کے بارے میں بے حد سنجیدہ بنادیا تھا اب وہ دن رات پڑھتا رہتا تھا اس نے دوسرے سال میٹرک پاس کرنے کے لئے بہت محنت کی ادھر ہم بھی خدا کے حضور مشتاق کی کامیابی کے لئے ہاتھ پھیلائے رہتے تھے اور پھر سال ختم ہونے پر امتحان کی داخلہ فیس بورڈ کو بھجوانے کا وقت آن پہنچا۔ اور یہ مرحلہ اس طرح طے پایا کہ گھر کے برتن بیچ کر مشتاق کی داخلہ فیس ادا کی گئی۔

امتحان کا مرحلہ آیا اور مشتاق کی فکر مندی اور ہم والدین کی دن رات دعاؤں کے ساتھ ساتھ گزر گیا۔ اب ہمارے گھر کے مستقبل کا تمام تر دارومدار میٹرک کے نکلنے والے نتیجے سے منسلک تھا۔

حضرت بابا دولے شاہ چشتی صابریؒ کی عالم جذب میں مشتاق حسین مبارک اور حبیب احمد جالب کے بارے میں دعائیہ پیشن گوئیاں

قصبہ ٹانڈہ ضلع ہوشیارپور میں ایک بزرگ حضرت پیر افضل جیؒ کی درگاہ تھی۔ اس درگاہ پر ایک درویش بابا دولے شاہؒ کا مستقل قیام تھا۔ باباجی درگاہ کے خدمت گار تھے اور ہمیشہ وہاں جھاڑو کشی کرتے نظر آتے تھے۔ ظاہرہ نظر آنے والے عام سے معمولی فقیر، حقیقتاً "اللہ کے بہت ہی پیارے بندے تھے۔

میرے والد میاں جی شرف الدین جیسا کہ وہ بزرگان دین و اولیاء عظام، فقراء کے بہت معتقد تھے۔ وہ خود بھی بزرگوں کے عرس منعقد کیا کرتے تھے اور بزرگوں کے عرس پر بڑے خلوص و عقیدت کے ساتھ حاضری بھی دیا کرتے تھے۔

میں درگاہ حضرت افضل جیؒ کے احاطے میں فکر مند بیٹھا تھا، کل مشتاق کا میٹرک کا نتیجہ نکلنے والا تھا۔ گزشتہ سال وہ میٹرک کے امتحان میں فیل ہو گیا تھا خدا نے غیبی مدد کی تھی اور بچے کو دوبارہ ہائی اسکول میں داخلہ ملا تھا۔ بچے نے بھی اس سال بہت محنت کی تھی مگر پھر بھی امتحان کا نتیجہ جب تک سامنے نہ آجائے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ کیا ہوگا۔ ہم دونوں میاں بیوی کے ساتھ ساتھ مشتاق بھی بڑا فکر مند تھا۔

میٹرک کا نتیجہ لاہور بورڈ سے نکلنا تھا اور کل کے اخبارات میں نتیجہ شائع ہونا تھا۔ اخبار صبح جالندھر سے آنے والی ٹرین سے ٹانڈہ پہنچنا تھا۔

اڑتے اڑتے یہ خبر بھی مجھ تک پہنچی تھی کہ مشتاق نے اپنے دوستوں سے کہا ہے کہ اگر اس سال بھی میں فیل ہو گیا تو ٹانڈہ اسٹیشن پر ہی ریل گاڑی کے نیچے آکر جان دے دوں گا اس بات نے الگ ہم دونوں ماں باپ کو پریشان کر رکھا تھا کہ خدانخواستہ بچہ کوئی غلط قدم نہ

اٹھالے۔ ہم اس کی نگرانی بھی کر رہے تھے۔ کل نتیجہ آنے والا تھا یہ ایک دن گزارنا ہم سے مشکل ہو رہا تھا۔ ایسے نازک حالات میں میرے والد میاں جی شرف الدین میانی افغاناں سے ٹانڈہ تشریف لے آئے اور گھر سے معلوم ہونے پر کہ میں درگاہ حضرت افضل جی کے احاطے میں بیٹھا ہوں۔ آپ بھی وہیں تشریف لے آئے۔ میں نے والد صاحب کو دیکھا تو اٹھ کر انہیں سلام کیا میرے سلام کا جواب دینے کے بعد والد صاحب بولے کہ فوراً تیار ہو جاؤ تم کو ابھی میرے ساتھ پیر محمد دیوان شاہ اور حضرت ولی کمال نوری جمال پیر میرے شاہ صاحب کے منعقدہ عرس پر نیاز مندانہ حاضری دینا ہے والد صاحب کی بات سن کر میں نے ان سے کہا کہ کل مشتاق کا میٹرک کا نتیجہ آ رہا ہے۔ بچہ گزشتہ سال فیل ہو گیا تھا لہٰذا اس سال کے نتیجہ کے بارے میں ہم میاں بیوی اور خود مشتاق بھی ذہنی طور پر شدید پریشان ہیں اور ان حالات میں میں آپ کے ہمراہ کہیں نہیں جا سکوں گا۔ میرا جواب سن کر والد صاحب بولے کہ تم فکر مت کرو انشاء اللہ بزرگوں کی برکت سے اس بار بچہ پاس ہو جائے گا بس تم عرس پر چلنے کی تیاری کرو میں نے پھر والد صاحب کو قائل کرنے کے لئے بتایا کہ جوان بچہ ہے اور اس بار وہ بہت جذباتی ہو رہا ہے۔ کہتا ہے کہ اگر اس سال بھی فیل ہو گیا تو ریل کے نیچے آ کر جان دے دوں گا میں مجبور ہوں اور ان حالات میں بچے کو تنہا نہیں چھوڑ سکتا۔ والد صاحب پھر بولے کہ تم انکار مت کرو۔ اور عرس پر چلو' والد صاحب کی بات پر آخر میں نے دوٹوک الفاظ میں صاف انکار کر دیا کہ میں آپ کے ساتھ نہیں جاؤں گا۔ میں نے مزید کہا کہ مجھے بچے کا امتحان درپیش ہے اور اس موقع پر آپ بھی میرا امتحان لینے کے لئے آ گئے ہیں؟

ہم دونوں باپ بیٹا کی تکرار بڑی دیر سے بابا دولے شاہؒ سن رہے تھے۔ والد صاحب کا اصرار اور میرا پیہم انکار۔ بابا دولے شاہؒ ہاتھ میں جھاڑو' درگاہ کی صفائی میں مشغول تھے کہ انہوں نے اچانک اپنا کام روک دیا اور غصے میں مجھے گھورتے ہوئے بولے اوئے عنایت!

کیوں بار بار اپنے باپ کو انکار کرتا ہے تیرا بار بار انکار' اور باپ سے تکرار' اچھا نہیں اپنے باپ کا کہا مان اور ان کے ساتھ چلا جا۔ بابا دولے شاہؒ میرے ہم عمر اور بے تکلف دوست بھی تھے اسی لئے میں ان کی بات سن کر غصے میں آگ بگولہ ہو گیا۔ اور میں نے اسی کیفیت میں

باباجی سے کہا۔ اوئے بابا! تم رہنے دو اور خاموش رہو۔ تمہیں حالات کا اور ان کی اہمیت کا اندازہ ہی نہیں۔ بس تم خاموشی سے درگاہ پر جھاڑو لگاؤ۔ میں بابا دولے شاہ کو سخت ست باتیں سنا کر، سر جھکائے فکر مند سا بیٹھا تھا۔ اور مجھے کچھ معلوم نہیں کہ بابا دولے شاہ کس عالم میں پہنچ چکے ہیں اوئے عنایت!

تو ہم کو کہتا ہے کہ ہمیں کچھ معلوم نہیں۔

اوئے تو سن لے!

ہم نے تیرے بچے کو پاس کر دیا ہے۔

باباجی کی بات سن کر بھی میں ان کی کیفیت نہ سمجھ پایا اور پھر ان سے مخاطب ہو کر بولا۔

باباجی!

نتیجہ لاہور یونیورسٹی سے نکلنا ہے!

میرا اتنا کہنا تھا کہ باباجی غضب ناک ہو گئے اور کہنے لگے۔

اوئے ہم لاہور یونیورسٹی کے مالک ہیں۔

ہم نے کہہ دیا کہ تیرا بچہ پاس ہے۔

یہ کہہ کر بابا دولے شاہ نے مزار حضرت افضل جی کی طرف اشارہ کر کے انتہائی جذب کے عالم میں کہا۔

رب دی سوں (خدا کی قسم) ہم یونہی کتے رنگڑ فقیر نہیں ہوئے ہیں اگر تیرا بیٹا پاس نہ ہوا تو اس مزار کو اینٹ اینٹ کر دوں گا۔

میں نے یہ الفاظ سنے تو نظریں اٹھا کر باباجی کو دیکھا بابا دولے شاہ صاحب کی آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں اور ان کا پورا وجود کانپ رہا تھا۔

باباجی کو اس حالت میں دیکھ کر میرے بھی رونگٹے کھڑے ہو گئے اور میں خوف زدہ سا ہو کر تھر تھر کانپنے لگا۔

ادھر بابا دولے شاہ اسی جذب کے عالم میں کہہ رہے تھے۔

ہم نے اپنے پیر کی درگاہ میں عرضی ڈال دی ہے جو بارگاہ الٰہی میں منظور بھی ہو گئی ہے۔

پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولے۔

جا! تیرا بیٹا پاس ہے۔ نا صرف پاس بلکہ ہم نے اس کے بڑے بڑے مرتبے بھی کر دیئے۔

میں تھر تھر کانپ رہا تھا اور آنکھیں پھاڑے بابا جی کو دیکھ رہا تھا اور میرے والد محترم میرے کان میں کہہ رہے تھے۔

بابا دولے شاہ باطنی وزیر تعلیم ہیں۔

بابا دولے شاہ جذب کے عالم میں میرے بیٹے مشتاق کو دعائیں دے رہے تھے اس وقت ان کی سخاوت عروج پر تھی اور وہ دونوں ہاتھوں سے موتیوں کے دان لٹا رہے تھے کہ اسی دوران میرے چھوٹے بیٹے حبیب احمد کے پرائمری اسکول کے استاد میاں احمد حسین صاحب تشریف لے آئے حبیب اس وقت درجہ چہارم میں پڑھتا تھا میاں احمد حسین صاحب نے جو بابا جی کو جذب کے عالم میں لعل و گہر لٹاتے دیکھا تو وہ بابا جی سے بولے۔

بابا جی! مشتاق کو تو بہت کچھ دے دیا اب کچھ ہمارے شاگرد حبیب کے لئے بھی عطا کر دو۔

میاں احمد حسین کی بات سن کر بابا دولے شاہ نے حبیب کے بارے میں صرف اتنا کہا۔

"اس کی خوشبو تو دور دور تک پھیلے گی۔ یہ تو بہت ہی یکتا ہو گا۔"

بابا دولے شاہ کی کہی ہوئی باتیں دعائیں آج میں عملی شکل میں دیکھ رہا ہوں میرا بڑا بیٹا مشتاق حسین مبارک محض میٹرک پاس تھا مگر وہ ترقی کرتا ہوا کلاس ون گز۔ٹڈ آفیسر بنا انگریزی فارسی' عربی زبانوں پر اسے دسترس حاصل ہے اور اردو کا بہت اچھا شاعر ہے جب کہ میرا دوسرا بیٹا حبیب۔ جس کے بارے میں بابا دولے شاہ نے فرمایا تھا کہ اس کی خوشبو دور دور تک پھیلے گی اور وہ یکتا ہو گا اور ایسا ہی ہوا کہ میرے بیٹے حبیب جالب کی خوشبو ان کی شاعری کی صورت دور دور تک پھیلی ہوئی ہے اور وہ اپنے عمل میں یکتا ہے۔

سادھو بولے سہے سبھا
سادھو کا بولا ورتھ نہ جا

ہمارے سب سے بڑے بھائی مشتاق مبارک

ماں کی ممتا

ہر ماں اپنے بچے کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتی ہے۔ خود دکھ سہتی ہے تکلیفیں برداشت کرتی ہے مگر اپنے نور نظر کو آرام پہنچانے کی سعی کرتی رہتی ہے اور ماں خواہ کتنی ہی غریب کیوں نہ ہو مگر جب وہ اپنے بچے کو لوری دے گی تو اسے زمانے بھر کے خطابات بخش دے گی کبھی اسے عرش کا تارا کہے گی تو کبھی بادشاہ بنادے گی اور ذات باری کے قربان جاؤ کہ کبھی کبھی ماں کے ممتا بھرے خواب حقیقت بھی بن جاتے ہیں۔

والدہ مشتاق حسین بھی ایک ممتا بھرا دل رکھنے والی ماں تھی۔ اس نے بھی بچپن میں مشتاق حسین کو ممتا بھری لوریاں دیتے ہوئے بڑے بڑے القابات بخش دیئے تھے میرا بیٹا مشتاق وائسرائے کے دفتر کا بابو ہے' افسر ہے۔ میرا مشتاق ولی کا شہزادہ ہے۔

اے لو بھوں بھوں کرتی مشتاق کی موٹر گاڑی آگئی چپراسی موٹر گاڑی کا دروازہ کھول رہا ہے مشتاق صاحب گاڑی سے اتر رہا ہے۔ سارے لوگ اٹھ اٹھ کر مشتاق کو سلام کر رہے ہیں۔

یہ شیخ چلی والی باتیں سن سن کر ہمارے گاؤں کی عورتیں والدہ مشتاق پر خوب ہنسا کرتی تھیں مگر بیگم حمیدہ جو خاں صاحب غلام سرور خاں کی بیگم تھیں اور بہت ہی خلیق و ہمدرد خاتون تھیں وہ رابعہ بصری کی اپنے بیٹے کے بارے میں شیخ چلی نما لوری سن کر بہت متاثر ہوتی

تھیں اور انہوں نے رابعہ بصری سے وعدہ کر رکھا تھا کہ جب مشتاق میٹرک پاس کر لے گا تو میں غلام سرور خان سے کہہ کر اسے دلی میں ملازمت دلوا دوں گی۔ بیگم حمیدہ کے شوہر غلام سرور خاں دلی میں محکمہ اطلاعات و مطبوعات میں بڑے افسر کے عہدہ پر فائز تھے۔

جب مشتاق نے میٹرک پاس کر لیا' تو رابعہ بصری اپنے بیٹے مشتاق کے بارے میں کیئے گئے وعدہ کے ایفا کے لئے بیگم حمیدہ کے پاس گئی اور انہیں مشتاق کے میٹرک پاس کر لینے کے بارے میں بتایا تو بیگم حمیدہ بہت خوش ہوئیں اور انہوں نے وعدہ کے مطابق مشتاق کی نوکری کے بارے میں اپنے شوہر غلام سرور خاں سے بات کی اور اس طرح ہمارا بیٹا مشتاق حسین دہلی شہر میں بابو بھرتی ہو گیا۔

وہ دن بھی میں کبھی نہ بھلا سکوں گا کہ جب ۲۹ دسمبر ۱۹۳۹ کو دلی سے خان صاحب غلام سرور خان کا خط مجھے موصول ہوا۔

دلی

دوست من عنایت اللہ

السلام علیکم

آپ کے لڑکے مشتاق حسین کو میں نے عارضی طور پر تین ماہ کے لئے اپنے ہی محکمہ میں ملازم رکھ لیا ہے۔ اسے ساٹھ روپے ماہوار تنخواہ ملے گی۔ میں آئندہ بھی حتی المقدور اس کی مدد کروں گا۔

والسلام غلام سرور خان

خاں صاحب غلام سرور خاں اور ان کی بیگم حمیدہ بی بی مشتاق حسین کو اپنی اولاد کا سا پیار دیتے تھے بلکہ انہوں نے عملاً اسے اپنا ہی بیٹا بنا لیا تھا۔ بیگم صاحبہ نے وعدہ نبھاتے ہوئے والدہ مشتاق کی شیخ چلی نما لوری کو عین حقیقت کر دکھایا تھا اور یوں ممتا کی لوری کے مطابق مشتاق دلی کے وائسرائے کے دفتر میں بطور بابو ملازم ہو گیا تھا اور پھر ممتا کی لوری اور بابا دولے شاہ کے عالم جذب میں عطا کردہ بڑے بڑے مرتبوں کو بھی میں نے حقیقت کا روپ بھرتے ہوئے دیکھا اور وہ یوں کہ مشتاق اپنے ساتھ بھرتی ہونے والے ساتھیوں کو پیچھے

چھوڑتا، ترقی کرتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔

وائسرائے کے دفتر کی ایک نئی برانچ ۱۵۔ راج پور روڈ اودھے پور ہاؤس میں کھولی گئی اور پھر اسی نئی برانچ میں مشتاق حسین کا تبادلہ کردیا گیا اور یہی تبدیلی اس کی ترقی کا زینہ بن گئی۔ جب ۱۵ راج پور روڈ والی برانچ میں بھی عملہ بہت زیادہ بڑھ گیا تو جگہ کی قلت کے باعث دوبارہ کچھ عملہ وائسرائے کی پرانی عمارت میں منتقل کردیا گیا۔ وائسرائے کی پرانی عمارت میں منتقل ہونے والے عملہ کے لئے ایک انچارج کا انتخاب ہونا تھا اور اس آسامی کے لئے درخواستیں طلب کی گئیں تھیں۔ انٹرویو لینے کے لئے ایک انگریز آفیسر مقرر کیا گیا تھا۔ درخواست گزاروں میں ایم اے اور بی اے پاس امیدواران شامل تھے۔ ادھر مشتاق کے دفتر کے لوگوں نے یونہی تفریحاً" مشتاق کو بھی انٹرویو دینے کے لئے بھیج دیا۔ جب انگریز آفیسر نے تمام امیدواروں کا انٹرویو لیا تو اس نے مشتاق کا انتخاب کرلیا۔

مشتاق ماشاء اللہ چھ فٹ سے نکلتا ہوا قد۔ بھرا بھرا جسم بارعب اور جاذب نظر نوجوان تھا اور انگریزی زبان لکھنے اور بولنے پر بھی اسے عبور حاصل تھا اس طرح وہ انچارج کی آسامی کے لئے منتخب کرلیا گیا۔ مشتاق کے انتخاب پر اس کے دفتر والے انگشت بدنداں رہ گئے۔ مگر خدا کی کرم نوازی دیکھئے کہاں کلرک بابو محض میٹرک پاس اور کہاں یہ شان یہ عزت کہ علیحدہ کمرہ اور کمرے کے دروازے پر مشتاق کے نام کی تختی اور میز پر ٹیلیفون مگر یہ تو ابتدا تھی کیونکہ بابا دولے شاہ کی دعاؤں اور کہی ہوئی باتوں میں سے ابھی بہت کچھ ہونا باقی تھا اور پھر وہ سب کچھ ہم نے پاکستان بننے کے بعد کراچی میں دیکھا کہ جب مشتاق ۱۹۶۰ء کی دہائی میں ترقی کرتا ہوا محکمہ اطلاعات و مطبوعات میں کلاس I گز۔ ٹڈ آفیسر بن گیا اور اس کے ساتھ ساتھ ملک کے معروف اردو شاعر کی حیثیت سے بھی اس کا نام ہوا اور دوستوں میں وقت کے بڑے بڑے عالم فاضل شامل ہوئے زیڈ اے بخاری، قدرت اللہ شہاب علامہ رشید ترابی، صادقین، پیر حیرت شاہ وارثی، ڈاکٹر یاور عباس، استاد فتح علی خاں قوال، مرکزی وزیر خواجہ شہاب الدین اور ان اکابرین کے علاوہ مشتاق کی عوام دوستی کا یہ عالم تھا کہ ننھا سبزی والا اور دیگر بھی اس کے حلقہ بگوشاں میں مکمل قدرو منزلت کے ساتھ شامل تھے۔ گویا مشتاق ایک

شمع تھی جس کے پروانوں میں ادیب، شاعر، مصور، موسیقار، علماء، پیر، فقیر بھی شامل تھے۔

وفات میاں جی شرف الدین

۱۹۳۹ میں مشتاق دلی شہر میں بطور بابو ساٹھ روپے ماہوار تنخواہ پر ملازم ہو گیا تھا جب اسے پہلی تنخواہ ملی تو اس نے اپنے دادا میاں جی شرف الدین کے نام اپنی تنخواہ بذریعہ منی آرڈر گاؤں بھیجی۔ میاں جی اپنے بڑے پوتے مشتاق کی تنخواہ پا کر بہت خوش ہوئے اور اس کے حق میں دعا کی مگر اب میاں جی کی طبیعت اکثر خراب رہنے لگی تھی اور پھر وہ اتنے شدید بیمار ہوئے کہ پیشاب پاخانہ بھی بستر پر ہی کر دیتے تھے اس حالت میں میاں جی شرف الدین کی بڑی بہو یعنی میری اہلیہ رابعہ بصری نے ان کی بڑی خدمت کی اور سسر کی اس حالت میں ذرہ برابر پرہیز نہ کی اور میاں جی کا بستر بدلنا، باقاعدہ حکیم صاحب کی دوا وقت پر پلانا انہیں نیم گرم پانی سے نہلانا مکھن کی بدن پر مالش کرنا یہ تمام خدمت معمول کے مطابق کرتا اور اسی خدمت کی بدولت رابعہ بصری نے والد صاحب کی بہت دعائیں لیں۔

میرے والد میاں شرف الدین بہت خوش نصیب تھے کہ جنہوں نے اپنی عین حیات میں اپنا ہرا بھرا باغ دیکھا اور اپنے پوتے مشتاق حسین کو برسرروزگار دیکھا اور آخر کار قضائے الٰہی ۲۸ فروری ۱۹۴۱ مطابق یکم صفرالمظفر ۱۳۶۰ ہجری بروز جمعہ اس فانی دنیا سے رخصت ہوئے۔ **اناللہ وانا الیہ راجعون**

خدا سے دعا ہے کہ وہ میاں جی کو جنت الفردوس عطا فرمائے (آمین)

مشتاق کو دہلی میں ملازمت کرتے ایک سال ہو گیا تھا یہ ۱۹۴۰ تھا۔ مشتاق اس وقت تنہا دہلی میں مقیم تھا خاں صاحب غلام سرور خاں کے گھر میں وہ رہائش پذیر تھا ہم باقی گھر والے سب اپنے گاؤں ہی میں مقیم تھے کیونکہ میرا چھوٹا بیٹا حبیب گاؤں کے پرائمری اسکول میں پانچویں جماعت میں پڑھ رہا تھا اور ہم چاہتے تھے کہ وہ پرائمری پاس کر لے پھر اسے دہلی میں ہائی

اسکول میں داخل کروایا جائے۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ جب لاہور کے منٹو پارک میں قرارداد پاکستان پیش کی جارہی تھی۔ پورا ہندوستان زبردست سیاسی تحریکات کے زیر اثر تھا۔ مسلمانوں کے لئے علیحدہ مملکت کے تصور نے پورے ہندوستان کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ان حالات میں گاؤں میانی افغاناں کا جاگیردارانہ ماحول گاندھی جی عطا اللہ شاہ بخاری، قائداعظم محمد علی جناح خان عبدالغفار خان، مولانا آزاد کے افکار، سیاسی تبصرے، گفتگو یہ سیاسی حالات ایک طرف۔ اور دوسری طرف گاؤں میانی افغاناں کے حسین سبزہ زار دل موہ لینے والے پیارے لوگ، دریائے بیاس کا حسن، یہ تھا وہ ماحول جس میں حبیب کا بچپن گزرا۔

میانی افغاناں کے فنکار شاعر ادیب

ہمارے گاؤں سے ڈھائی میل کے فاصلے پر عالم پور تھا جو مولوی غلام رسول عالم پوری کا گاؤں تھا اور جنھوں نے پنجابی زبان میں منظوم یوسف زلیخا لکھی تھی، بزرگ بتاتے ہیں کہ مولوی غلام رسول عالم پوری برنا کے درخت کے نیچے بیٹھ جاتے اور مترنم آواز میں یوسف زلیخا پڑھا کرتے۔ انہی مولوی صاحب کے ایک شاگرد مہر منشی ہمارے گاؤں میانی افغاناں میں رہتے تھے مہر منشی اکثر حبیب کو ادبی کتابیں پڑھنے کو دیتے اس طرح حبیب کو بچپن ہی میں ادبی فیض حاصل کرنے کا موقع نصیب ہوگیا تھا۔ دراصل حبیب ابتدا ہی سے اپنے ہم عمر بچوں سے یکسر مختلف تھا اس کے مشاغل بھی دوسرے بچوں سے مختلف تھے شروع میں تو ہم نے حبیب کے انداز و اطوار پر زیادہ دھیان نہیں دیا مگر بعد کو اس کے مختلف مزاج نے ہمیں اپنی جانب خاصا متوجہ کیا۔ ہمارے گاؤں کے اپنے اثرات نے بھی اس بچے کی شخصیت بنانے میں بنیادی کردار ادا کیا۔ مجھے یاد ہے کہ گرمیوں کی راتوں میں جب تمام گاؤں والے اپنے اپنے گھروں کی چھتوں پر چارپائیاں ڈالے دریائے بیاس کے ٹھنڈے پانی کو چھو کر آنے والی

ہوا کے جھونکوں سے لطف اندوز ہوا کرتے تھے اور ایسے میں گاؤں میں رہنے والے معروف سارنگی نواز نبی بخش عرف نبھے خاں اپنے مکان کی چھت پر پہاڑی چھیڑتے تو سارنگی کی تاروں سے نکلنے والے سروں سے ماحول پر سحر طاری ہو جاتا اور ایسے میں اکثر لوگ گلی میں نکل آتے اور خاموشی سے میاں نبھے خاں کی سارنگی سے پھوٹنے والے سروں پر وجد و کیف کے عالم میں سر دھنتے اسی طرح ہمارے گاؤں میں ایک مغنیہ بھی رہتی تھیں ان کا نام "ولائت" تھا اور وہ ولائتن کے نام سے مشہور تھیں وہ گانے بجانے والی طوائف تھیں اور اسی پر ان کی گزر بسر تھی۔ قدرت نے کیا خوبصورت آواز سے اس خاتون کو نوازا تھا کہ الفاظ میں اسے بیان نہیں کیا جاسکتا۔ اتنی سریلی آواز میں نے آج تک نہیں سنی' اس وقت میری اچھی خاصی عمر تھی یہی تیس بتیس سال مگر ولائتاں بی بی کا گانا' گاؤں کے بڑے بزرگ ہی باقاعدہ سنا کرتے تھے اور جب ان کے گانے کی محفل ہوتی تھی تو ان کی آواز کے جادو سے یوں لگتا جیسے پورے گاؤں پر رنگ و نور کی برسات ہو رہی ہو۔ رات جوں جوں بھیگتی چلی جاتی توں توں مائی ولائتاں کی آواز نکھرتی چلی جاتی عمر رسیدہ ہونے کے باوجود ان کی آواز کا حسن ہرگز ماند نہیں پڑا تھا۔ بلکہ عمر گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی آواز میں پختگی آگئی تھی مائی ولائتاں کی آواز سے میرا بیٹا حبیب بھی بہت متاثر ہوتا تھا اور مائی صاحبہ اس بچے سے بہت پیار کرتی تھیں خدا غریق رحمت کرے مائی ولائتاں تہجد گزار خاتون بھی تھیں۔

میانی افغاناں سے دہلی کی طرف کوچ

میرے چھوٹے بیٹے حبیب نے جب پانچویں جماعت گاؤں کے پرائمری اسکول سے پاس کرلی تو ہم میاں بیوی اپنے بچوں سمیت گاؤں سے دہلی شہر منتقل ہو گئے۔ مشتاق تو پہلے ہی سے دہلی میں موجود تھا۔ گاؤں سے ہم میاں بیوی حبیب حمید اور میری اکلوتی بیٹی رشیدہ ہم سب بھی دہلی آگئے۔

دہلی آکر میں نے حبیب کو اینگلو عربک اسکول اجمیری گیٹ میں درجہ ششم میں داخل

کردیا۔ میرا بڑا بیٹا مشتاق محکمہ اطلاعات و مطبوعات میں ملازم تھا جہاں سے ایک رسالہ ماہنامہ "آج کل" شائع ہوتا تھا جس کے ایڈیٹر حضرت جوش ملیح آبادی تھے اسی رسالے میں بطور معاون مشتاق بھی شامل تھا۔ رسالہ "آج کل" کی وجہ سے دہلی کے شعرا ادبا سے مشتاق کے مراسم بڑھنے لگے مشتاق خود بھی شعر کہتا تھا اور شہر کے مشاعروں میں بھی شریک ہوتا تھا اس وقت حضرت سائل اور حضرت بیخود حیات تھے کہ جنہوں نے غالب اور داغ کو سن رکھا تھا۔

دہلی شہر میں میرے بیٹے حبیب کو گھر ہی میں شعری ماحول مل گیا۔ بڑا بھائی مشتاق خود بھی شعر کہتا تھا اور ماہنامہ آج کل میں بطور معاون بھی وہ شامل تھا۔ یہ راستہ قدرت نے ہی بنایا تھا کہ جس پر حبیب کو چلنا تھا اب وہ اپنے بڑے بھائی مشتاق کے ساتھ شہر کی ادبی محفلوں اور مشاعروں میں بھی آنے جانے لگا تھا۔ مٹی تو زرخیز تھی ہی بس ذرا نم کی ضرورت تھی جو غالب' داغ' ذوق ' سائل ' بیخود کے علاوہ حضرت نظام الدین اولیا اور حضرت امیر خسرو کی دلی نے مہیا کردیا اور پھر یوں ہوا کہ ساتویں جماعت کے اردو کے پرچے میں جب "وقت سحر" کا جملہ بنانے کے لئے حبیب احمد نے جملے کی بجائے شعر کہہ دیا تو وہ حبیب احمد سے شاعر حبیب احمد بن گیا شعر یوں تھا (حبیب جالب کا پہلا شعر)

وعدہ کیا تھا آئیں گے امشب ضرور وہ
وعدہ شکن کو دیکھتے وقت سحر ہوا

حبیب خوش قسمت ہے کہ اپنے حسین گاؤں کے بعد اسے دہلی جیسا شہر نصیب ہوا اور دہلی شہر میں اچھے اساتذہ نصیب ہوئے۔ اینگلو عربک اسکول اجمیری گیٹ میں اس کے استاد جناب احمد حسنی صاحب تھے کہ جو خواجہ حسن نظامی دہلوی کے بھتیجے تھے اور اسکول میں اردو فارسی عربی پڑھاتے تھے۔ جناب احمد حسنی صاحب آج کل لاہور یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے منسلک ہیں اور مسجد نور سنت نگر لاہور میں خطیب ہیں اور درس قرآن وحدیث بھی دیتے ہیں اور یہ خدمات مسجد نور کے لئے رضا کارانہ طور پر انجام دے رہے ہیں۔

میرے ایک بچے کے علاوہ باقی سب نے دہلی ہی میں ہوش سنبھالا۔ مشتاق تو ماشاء اللہ

تقریباً اٹھارہ برس کا تھا کہ جب وہ دہلی آگیا تھا بعد ازاں میرا چھوٹا بیٹا حبیب بھی گیارہ سال کی عمر میں دہلی آگیا میری اکلوتی بیٹی رشیدہ اور حمید انہوں نے بھی دہلی کا زریں ماحول دیکھا ہے جب کہ میرے سب سے چھوٹے بیٹے سعید نے (کہ جو ۱۹۴۷ میں پیدا ہوا۔) کراچی پاکستان میں ہوش سنبھالا۔

دہلی میں ہمارا پہلا قیام چونا منڈی کے علاقہ میں ہوا جہاں ہم سال ڈیڑھ سال تک رہے اس کے بعد ہم پچکویاں روڈ پر بنے ہوئے سرکاری کوارٹروں میں رہنے لگے اس جگہ جامن کے بہت زیادہ درخت ہوتے تھے۔ قریب ہی حضرت باقی باللہؒ کا مزار تھا۔ حضرت باقی باللہؒ بہت جلالی بزرگ گزرے ہیں اور ان کے جلالی مزاج کی طرح ان کے مزار مبارک پر بھی ہیبت و جلال کا سماں ہمہ وقت رہتا تھا۔ ان کے مزار پر دن کے وقت بھی لوگ جاتے ہوئے گھبراتے تھے مگر میرا بیٹا حبیب دن ہو یا رات جب طبیعت چاہتی حضرت باقی باللہؒ کے مزار پر چلا جایا کرتا تھا۔

حضرت باقی باللہؒ

شیخ العارفین صادق کاملین ، عالم دین متین مقبول رب العالمین عارف باللہ حضرت باقی باللہ قدس سرہ نورانی دہلوی آپ کی نسبت نقشبندیہ بزرگ حضرت خواجہ امکنگیؒ سے ہے آپ کی جائے پیدائش کابل ہے جہاں آپ ۹۷۱ ہجری میں پیدا ہوئے آپ بچپن ہی سے تنہائی پسند تھے آپ کا لڑکپن بہت پاکیزہ گزرا اور بچپن ہی سے آپ کی پیشانی پر نورانی شعاعیں ہویدا تھیں۔ آپ نے اپنے زمانے کے جید علما سے علوم ظاہری حاصل کئے اور بہت جلد اپنی پہچان آپ بن گئے ایک روز آپ کسی تصوف کی کتاب کے مطالعہ میں مصروف تھے کہ ایک تجلی سے سینہ منور ہو گیا آپ پر ایک محویت طاری ہو گئی اسی عالم محویت میں حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبند نے تلقین ذکر و اذکار کے لئے فرمایا۔

اس کے بعد حضرت باقی باللہ کسی صاحب باطن کی تلاش میں سرگرداں پھرتے اور تکلیفیں

اٹھاتے رہے اور اس قدر کہ انسان کی طاقت سے بعید ہے۔ آپ نے نفس سے، بہت مجاہدے کئے اور بالآخر منزل مقصود کو حاصل کر لیا۔

حضرت باقی باللہ بڑے پائے کے بزرگ ہوئے ہیں آپ کا مزار فیض آثار دہلی میں محلہ نبی کریم عرف قدم رسول مرجع خلائق موجود ہے۔

۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۷ء دوسری جنگ عظیم کے دوران میں نے متعدد بار حضرت باقی باللہ کے مزار پر حاضری دی اور زیارت کا شرف حاصل کیا۔ وہیں میں نے یہ بات بھی سنی کہ آپ کے روضہ مبارک پر شیر آکر جھاڑو کشی کیا کرتا تھا۔ ایک روایت یہ بھی سنی ہے کہ ایک بار کسی نے آپ سے سوال کیا کہ آپ کو باقی باللہ کیوں کہتے ہیں جب کہ دنیا فانی ہے یہاں سب کو فنا ہے تو آپ نے فرمایا کہ اس سوال کا جواب آپ کو ہمارے دنیا سے پردہ کر جانے کے بعد ملے گا اور وہ بھی ایسے کہ جب ہم دنیا سے پردہ کر جائیں تو ہماری میت کو نہلا کفنا کر قبرستان میں رکھ دینا اور میری نماز جنازہ اس شخص سے پڑھوانا کہ جس کی نماز عصر کی سنتیں کبھی قضا نہ ہوئی ہوں اور جب ایسا شخص مل جائے تو وہی شخص اس سوال کا جواب دے گا۔

جب حضرت باقی باللہ کا انتقال ہوا تو آپ کی وصیت کے مطابق آپ کی میت کو غسل دینے اور کفن پہنانے کے بعد قبرستان میں لے جاکر رکھ دیا گیا اور اعلان کیا گیا کہ آپ کے حکم کے مطابق نماز جنازہ وہ شخص پڑھائے گا جس کی نماز عصر کی سنتیں عمر بھر کبھی قضا نہ ہوئی ہوں۔ یہ اعلان سن کر مجمع میں سے کوئی بھی شخص ایسا سامنے نہیں آیا کہ جو اس معیار پر پورا اترتا ہو آخر مریدین وصیت کے مطابق ایسے شخص کے انتظار میں بیٹھ گئے کچھ ہی دیر بعد جنگل کی طرف سے ایک نقاب پوش گھڑ سوار آتا نظر آیا جب وہ گھڑ سوار قبرستان کے قریب پہنچا تو لوگوں کا اژدھام دیکھ کر رک گیا اور گھوڑے سے اتر کر پوچھنے لگا کہ بھئی جنازہ تیار ہے یا اور کسی کا انتظار ہے۔ اجنبی نقاب پوش کی بات سن کر مریدین نے جواب دیا کہ ہمارے پیر حضرت باقی باللہ کی وصیت کے مطابق وہی شخص نماز جنازہ پڑھائے گا کہ جس کی نماز عصر کی سنتیں کبھی قضا نہ ہوئی ہوں۔ مریدین سے حضرت کی وصیت سن کر اجنبی نقاب پوش بولا کہ میں نماز جنازہ پڑھاؤں گا۔ معتقدین نے متفق ہو کر ان سے نماز جنازہ پڑھوائی بعد

از نماز جب وہ اجنبی گھڑسوار جانے لگا تو مریدین نے اجنبی نقاب پوش کے گھوڑے کی باگ پکڑ کر عرض کیا۔ کہ ہمارے ایک سوال کا جواب دیتے جائیں۔

مریدین کے سوال کرنے سے پہلے ہی نقاب پوش اجنبی نے اپنے چہرے سے نقاب ہٹائی اور کہا وہ فانی فی اللہ تھا اور اب یہ باقی باللہ ہے۔ اجنبی نقاب پوش نے چہرے سے نقاب الٹا تو مریدین نے دیکھا کہ وہ نقاب پوش گھڑسوار خود حضرت باقی باللہ تھے اس کے بعد آپ نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور نظروں سے غائب ہو گئے۔

فنا بغیر بقا کا پتہ نہیں ملتا
خودی مٹائے نہ جب تک خدا نہیں ملتا

**

اٹھ فریدا کوک توں جویں کر راکھا جوار
جب تک ٹانڈہ نہ گرے تب تک حال پکار

**

چچکیاں روڈ سے ہم ملتانی ڈانڈا کے علاقہ میں واقع کلو خان کی بلڈنگ میں اٹھ آئے یہ محلہ بندھانیوں کا تھا جو بڑے جفاکش اور محنتی لوگ تھے اور انتہائی خلوص و محبت والے بھی قیام پاکستان میں ان کی قربانیاں ناقابل فراموش ہیں۔

مشتاق حسین مبارک کی شادی خانہ آبادی

۱۹۴۶ میں مشتاق حسین کی شادی اس کی خالہ زاد مبارک سلطانہ سے ہوئی لڑکی والے جالندھر شہر میں رہتے تھے۔ میرے ہونے والے سمدھی جو میرے ہم زلف بھی تھے محکمہ پولیس میں تھانیدار تھے ان کا نام سندھے خان تھا ہماری بہو مبارک سلطانہ جالندھر جیسے بڑے شہر میں پلی بڑھی تھی تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ خوبصورت بھی تھی۔ ان لوگوں کے مقابلے میں ہم گاؤں کے سیدھے سادے دیہاتی لوگ۔ ویسا ہی ہمارا لڑکا مشتاق بھی سادہ مزاج۔

شادی بخیر و خوبی ہو گئی اور جالندھر شہر سے مشتاق کی بارات دلہن کی ڈولی لے کر جب ہم واپس ٹانڈہ کے اسٹیشن پہنچے تو رات ہو چکی تھی ہم سب گھر والے قریبی عزیز رشتہ دار خواتین سمیت رات کے وقت ٹانڈہ ریلوے اسٹیشن پر کھڑے سوچ رہے تھے کہ رات میں ٹانڈہ سے میانی افغاناں تک کا پانچ میل کا سفر اندھیری رات نئی نویلی دلہن زیوارت سے لدی پھندی ٹانڈہ سے میانی افغاناں کے درمیان ڈاکوؤں کی بہت سی ٹولیاں بھی سرگرم رہتی تھیں کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کیا جائے۔ میرے چھوٹے بھائی صادق علی نے بیل گاڑی کا انتظام کر رکھا تھا اور وہ بالکل مطمئن تھا اور اس کا کہنا تھا کہ دولہا دلہن اور عورتوں کو بیل گاڑی پر سوار کر دیا جائے جب کہ باقی مرد بیل گاڑی کے ساتھ ساتھ پیدل چلیں گے۔ میرا چھوٹا بھائی صادق علی بڑا بہادر اور بڑا صحت مند جوان تھا اور اپنی جوان مردی کے قصوں کے باعث علاقہ بھر میں بڑا مقبول و مشہور تھا۔ صادق علی ہی کا حوصلہ تھا کہ وہ دلہن کی ڈولی کو لے کر آدھی رات کے وقت ٹانڈہ سے میانی افغاناں کی طرف روانہ ہو گیا ہم سب مرد بیل گاڑی کے ساتھ ساتھ پیدل چل رہے تھے جب کہ دلہن اور خواتین بیل گاڑی میں سوار تھے۔ اندھیری رات اور بیل گاڑی کی لالٹین سے چھن کر نکلنے والی مدھم مدھم روشنی بہت بڑا سہارا محسوس ہو رہی تھی۔ صادق علی کی وفادار کتیا بلو بیل گاڑی سے ڈیڑھ دو سو گز آگے چل رہی تھی۔ کبھی کبھی وہ کھڑی ہو کر بھونکنے بھی لگتی۔

آخر وہی ہوا جس کا خطرہ تھا انے دی کھوئی سے ذرا آگے ہی نکلے تھے کہ گھوڑوں پر سوار چند لوگوں نے ہمارے مختصر سے قافلے کو چاروں جانب سے گھیر لیا۔ ان لوگوں نے منہ پر ڈھاٹے باندھ رکھے تھے اور نیزے بھالے ہاتھوں میں اٹھا رکھے تھے۔ ڈاکوؤں کو دیکھ کر ہم سب پریشان ہو گئے مگر میرا بھائی صادق علی ذرا برابر نہیں گھبرایا اور اس نے ڈاکوؤں کو للکارتے ہوئے اپنی لاٹھی کو ہوا میں بلند کیا اس سے پہلے کہ صادق علی بمعہ اپنے ساتھیوں کے ڈاکوؤں سے دو دو ہاتھ کرنے کے لئے آگے بڑھتا۔ ڈاکوؤں ہی میں سے ایک بولا۔

اوئے صادق علی یہ تم ہو

ہاں میں صادق علی ہوں۔

میں تو پہلے ہی اپنے ساتھیوں سے کہہ رہا تھا کہ یہ تو صادق علی کی کتیا بلو کی آواز ہے۔

ادھر میں دل ہی دل میں خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کر رہا تھا کہ ڈاکوؤں سے جان بچ گئی۔

ہاں بھئی صادق علی اس وقت کہاں سے آرہے ہو؟

ڈاکو اپنے گھوڑوں سے نیچے اتر آئے تھے۔

میرے بھتیجے کا بیاہ ہوا ہے اور ہم جالندھر سے ڈولی لے کر آرہے ہیں۔

صادق علی نے بھی ڈاکوؤں کو پہچان لیا تھا اور اس کے بعد ان ڈاکوؤں نے (جو بارات لوٹنے آئے تھے) دولہا دلہن کو سلامیاں دیں اور گاؤں میانی افغاناں تک اپنی حفاظت میں چھوڑنے آئے۔

مشتاق کی شادی سے پہلے ہی ہم -تمارپور کے علاقے بنگالی کوارٹرز الہ آباد لائن میں آگئے تھے جہاں مشتاق کے نام ایک سرکاری کوارٹر سرکار کی طرف سے الاٹ کروایا گیا تھا۔ -تمارپور کے قریب ہی جمنا بہتی تھی۔ تمارپور اور جمنا کے درمیان ایک پہاڑی بھی تھی حبیب اکثر مچھلی کا شکار کھیلنے کے لئے جمنا جایا کرتا تھا۔ یہ بھی خوبصورت اتفاق تھا کہ ہمارے گاؤں میانی افغاناں کے ساتھ بیاس بہتا تھا دلی آئے تو یہاں بھی دریا کا ساتھ رہا۔ بیاس نہ سہی جمنا سہی۔

ہم دریائی لوگ ہیں۔ اسی لئے مچھلی ہمارے گھرانے کی مرغوب غذا ہے اور حبیب بھی مچھلی بڑے شوق سے کھاتا ہے اور اس کی ماں رابعہ بصری مچھلی پکانے میں اپنا ثانی نہیں رکھتی۔ خاندان بھر کے سبھی لوگ رابعہ بصری سے مچھلی ہی کھانے کی فرمائش کرتے ہیں۔

دہلی آکر ہم بہت خوش تھے میں نے چوڑی بازار میں ایک دوکان کرائے پر حاصل کرلی تھی جہاں میں نے پنجابی کھسوں کا کام بہتر انداز میں جاری رکھا دو کاریگر بھی میں نے رکھ لئے تھے۔ دہلی میں میرا کام اچھا خاصا چل نکلا تھا۔ اور روز بہ روز اس میں ترقی ہو رہی تھی، موجودہ حالات میں اپنی خوش بختی پر میں بہت خوش تھا گھر میں بہو بھی آگئی تھی۔ مشتاق برسرروزگار تھا۔ میرا کاروبار بھی چل نکلا تھا۔ حبیب بھی پڑھ رہا تھا اتنے بہت سے کرم ہونے پر ہم سب خدا کے بے حد شکرگزار تھے اور قیام دہلی کے دوران یہ ہمارا معمول رہا کہ ہم سارے گھ

والے ہر جمعرات کو حضرت خواجہ نظام الدین اولیا محبوب الٰہی زری زر بخت کے مزار پر ننگے پاؤں حاضری دیا کرتے تھے۔

۱۹۴۰ء میں ہم دہلی آئے تو سمجھ رہے تھے کہ طویل اور تھکا دینے والی زندگی کے شب و روز دور کہیں دور رہ گئے ہیں اور اب باقی زندگی بہت خوش خوش گزرے گی مگر بہت جلد ہمیں احساس ہو گیا کہ ہماری جدوجہد ابھی ختم نہیں ہوئی۔

یوں ہم بھی پورے ہندوستان کے اکثر مسلمانوں کی طرح اپنے قائد محمد علی جناح کی قیادت میں سبز ہلالی پرچم تلے قیام پاکستان کی جدوجہد میں شامل ہو گئے۔ میرے دونوں بڑے بیٹے مشتاق اور حبیب مسلم لیگ کے جلسے جلوسوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگے۔ حبیب احمد تیرہ چودہ سال کا ہوش مند بچہ تھا اور وہ مسلم لیگ کے جلسوں میں علامہ اقبال اور دیگر شعرا کی نظمیں اپنی مترنم آواز میں پڑھا کرتا تھا۔ اسی دوران ایک مرتبہ محترمہ فاطمہ جناح ہمارے علاقے تیمار پور میں تشریف لائیں اور میری بیوی رابعہ بصری کو خواتین مسلم لیگ علاقہ تیمار پور کی رکنیت دے گئیں۔ یوں ہمارا گھر تیمار پور میں مسلم لیگ کا مرکز بن گیا اور ہم ہندوؤں سکھوں کی نظروں میں بری طرح کھٹکنے لگے۔

بٹ کے رہے گا ہندوستان

بن کے رہے گا پاکستان

اور مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ

یہ وہ نعرے تھے کہ جنہوں نے پورے ہندوستان میں ہندو سکھ اور مسلمانوں کو آمنے سامنے لا کھڑا کیا تھا۔ دونوں جانب بڑا جوش و خروش تھا۔

ہندو اپنے مذہبی گیت گاتے کیرتن کرتے اور ڈھول تاشوں کے ساتھ گیتا اور رامائن گاتے تو دوسری طرف مسلمان میلاد کی محفلیں سجاتے بڑے بڑے خوش گلو مسلمان نوجوان ان میلاد کی محفلوں میں نعت خوانی کے لئے آتے اور مقامی علماء کرام اپنے واعظ سے مسلمانوں کے دل گرمایا کرتے تھے انہی دنوں شاہنامہ اسلام کے خالق حضرت حفیظ جالندھری سے میرے مراسم ہو گئے اور وہ اس طرح کہ حفیظ صاحب کی انگریز بیوی میری دکان کی بنی

ہوئی پنجابی جوتی بڑے شوق سے پہنتی تھیں۔ ایک دن حبیب میری دکان واقع چوڑی بازار میں بیٹھا تھا کہ حفیظ صاحب تشریف لے آئے انہوں نے حبیب کو مسلم لیگ کے کسی جلسہ میں نظم پڑھتے سنا ہوگا اور وہ اسے پہچان گئے اور بولے۔

آپ کا بیٹا چہرے مہرے سے منفرد دکھائی دیتا ہے لگتا ہے اس کے اندر کوئی بڑا انسان چھپا بیٹھا ہے۔

تیمار پور میں مسلم لیگ کی سرگرمیاں

۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۷ تک یہ دور تحریک پاکستان کا انتہائی عروج کا دور تھا اور یہ عرصہ ہم نے دہلی میں گزارا کیونکہ ۱۹۳۹ میں میرے بڑے بیٹے مشتاق کو دلی میں سرکاری نوکری مل چکی تھی اور یوں ہم اپنے گاؤں میانی افغانان سے ہجرت کر کے دہلی آ گئے تھے۔ دہلی میں ہمارا طویل و مستقل قیام بنگالی کوارٹر تیمار پور میں رہا جہاں مشتاق کو سرکار کی جانب سے کوارٹر الاٹ ہوگیا تھا۔

ہندوستان کے چپہ چپہ کی طرح تمار پور دہلی میں بھی مسلم لیگ منظم طور پر کام کر رہی تھی باقاعدہ مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی تھی مشتاق اور حبیب مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی کے سرگرم رکن تھے تیمار پور کے علاقہ میں رہنے والے مسلمان ہر اتوار کو جلسہ منعقد کرتے جس میں مسلم لیگ کی بہتری و ترقی کے لئے قرار دادیں پاس کی جاتیں مسلم لیگ کے اسی طرح کے ایک اجلاس میں باہم رضامندی سے یہ طے پایا کہ ہر ہفتہ کی رات بعد نماز عشاء ایک محفل میلاد کا انعقاد کیا جائے گا اس محفل میلاد میں نبی کریم اور صحابہ رضوان اللہ کے بارے میں علماء کرام تقاریر فرمائیں گے اور شعراء کرام اپنی قومی نظموں سے جوش ایمانی پیدا کریں گے اس کے علاوہ یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ جمنا کے کنارے جو ویران مسجد کھنڈر کی صورت پڑی ہے اس کی صفائی کی جائے مرمت کروائی جائے اور فجر کی نماز باجماعت اس مسجد میں ادا کی جائے ویسے تو رسالہ والی مسجد میں بھی نماز پنجگانہ ادا کی جاتی تھی اور اس کے علاوہ سرکاری

کوارٹروں کے درمیان بھی نماز کے لئے ایک مسجد نما چبوترہ سا اہلیان تیمار پور نے بنالیا تھا جہاں علاقہ کے مسلمان اپنے گھروں کے نزدیک ترین نماز ادا کرتے تھے۔ اس مسجد نما چبوترے پر نمازیوں کی تعداد روز بروز بڑھتی چلی جارہی تھی اس چبوترہ نما مسجد میں باقاعدہ پانچ وقت اذان دی جاتی ادھر جمنا کے کنارے ویران مسجد کی مرمت و صفائی کا کام بھی زور شور سے ہورہا تھا اور ہر ہفتہ کی رات بعد نماز عشا محفل میلاد بھی باقاعدگی سے ہونے لگی تھی۔

محفل میلاد کی ابتدا تلاوت قرآن پاک سے ہوتی اس کے بعد حضور نبی کریمؐ کی شان میں خوش گلو نعت خواں مدح سرائی کرتے علما کرام اپنے وعظ کے ذریعہ اسلام کے زریں اصولوں پر گفتگو کرتے اور یوں اس نورانی محفل کا اختتام صلوۃ وسلام پر ہوتا یہ پاک محفل میلاد تقریباً دو گھنٹہ جاری رہتی اور اس کے اختتام پر مسلم لیگ کی کامیابی کے لئے دعائیں مانگی جاتیں۔

مسلمانان تیمار پور، جس طرح سے مسلم لیگ کی تحریک کو آگے بڑھارہے تھے اس سے علاقہ کے ہندو، سکھ اندر ہی اندر بری طرح سلگ رہے تھے اور پھر انہوں نے بھی عین ہفتہ کی رات کو جب ہم محفل میلاد منعقد کرتے تھے، ڈھول تاشوں کے ساتھ گیتا اور رامائن گانا شروع کردیں۔

ان حالات میں علاقے کا امن و سکون شدید ترین خطرے میں پڑ گیا۔ آخر چند معتبر ہندو اور مسلمان ایک جگہ جمع ہوئے اور علاقہ کے امن و سکون کے بارے میں گفتگو شروع ہوئی مسلمانوں کی جانب سے مطالبہ پیش کیا گیا کہ ہندو اپنا کیرتن ہفتہ کی رات کے علاوہ کسی اور دن کیا کریں اور اگر ہفتہ کی رات ہی میں کیرتن کرنا ہے تو اسے محفل میلاد سے ذرا ہٹ کر کیا کریں مگر ہماری دونوں تجاویز کو ہٹ دھرم ہندوؤں نے رد کرتے ہوئے کہا کہ آپ لوگ محفل میلاد جمعہ کی رات میں منعقد کیا کریں آخر ہم نے ان کی بات تسلیم کرلی اور محفل میلاد جمعہ کی رات میں منعقد کرنے لگے مگر ہندو بھلا چین سے کب بیٹھنے والے تھے اور اس میں ان کا کوئی قصور بھی نہیں تھا اصل میں ان کا سکھ چین ہمارے ان تین نعروں نے لوٹ لیا تھا۔

نعرہ تکبیر

نعرہ رسالت

نعرہ حیدری

یہ نعرے محفل میلاد میں کثرت سے بلند کیے جاتے تھے اور پھر ان نعروں سے تو ہندوستان کے گلی کوچے گونج رہے تھے لہٰذا ہندوؤں نے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس کو لکھا کہ اذان دینے پر پابندی لگائی جائے۔

محفل میلاد میں نعرے بلند کرنے پر پابندی لگائی جائے۔

اور جمنا کے کنارے ویران مسجد میں مسلمانوں کے نماز فجر ادا کرنے پر پابندی لگائی جائے کیونکہ نماز فجر کے بہانے وہاں مسلمان نوجوانوں کو گتکا اور لاٹھی چلانے کی تربیت دی جاتی ہے۔

ہندوؤں کی شکایت پر پولیس نے چبوترہ نما مسجد کا چبوترہ توڑ دیا۔ منزل چونکہ بہت قریب آچکی تھی لہٰذا مسلمان کسی لمبے چوڑے مسئلہ میں پڑنے سے پرہیز کرتے ہوئے درگزر کے عمل کو اپنائے ہوئے تھے جب کہ ہندو چھوٹی چھوٹی سی باتوں پر الجھ الجھ جاتے تھے لیکن مسلمانوں کی نظریں صرف پاکستان پر لگی ہوئی تھیں۔

تحریک پاکستان کا جوش و خروش منزل کے قریب پہنچ کر مزید بڑھتا چلا جا رہا تھا شہر دہلی کے چھوٹے چھوٹے مسلم لیگی جلسوں میں میرے بیٹے مشتاق اور حبیب باقاعدگی سے شریک ہوتے تھے اور خصوصاً حبیب اپنی مترنم آواز میں تلاوت قرآن پاک کے بعد علامہ اقبال یا مولانا ظفر علی خاں وغیرہ کی کوئی بھی ولولہ انگیز نظم پڑھتا جس سے مجمع میں جوش و ولولہ پیدا ہو جاتا اس زمانے میں ایک صاحب خواجہ شفیع محمد دہلوی ہوا کرتے تھے جو اکثر جلسوں مشاعروں اور محفل میلاد میں اسٹیج سیکریٹری کے فرائض انجام دیا کرتے تھے۔ خواجہ صاحب میں یہ خوبی تھی کہ وہ معمولی شاعر کی غزل کے ہر مصرعہ ہر شعر کو یوں دہراتے۔ یوں اٹھاتے کہ بس شعر کو چار چاند لگا دیتے وہ اپنے فن کے بڑے ماہر آدمی تھے ایک بار ایک نعتیہ محفل مشاعرہ ہمارے علاقے تیمار پور میں منعقد ہوئی جس میں شہر کے چیدہ چیدہ شعرا شریک ہوئے شعرا میں حضرت مضطر لدھیانوی بھی شامل تھے کہ جو حبیب کے اندر چھپی ہوئی شاعرانہ صلاحیتوں کے معترف تھے خواجہ شفیع محمد دہلوی اسٹیج سیکریٹری تھے مضطر صاحب نے خواجہ

صاحب سے کہا کہ حبیب کو بھی اسٹیج پر بلواؤ اور نعت پڑھواؤ۔ خواجہ صاحب نے ان الفاظ میں حبیب کو اسٹیج پر بلوایا۔

"اب میں حبیب صاحب سے اللہ کے حبیب کا واسطہ دے کر گزارش کرتا ہوں کہ وہ دربارِ حبیب میں اپنا ہدیۂ عقیدت پیش کریں یہ خواجہ شفیع محمد صاحب کا انداز تھا اور پھر حبیب نے اپنے خوبصورت ترنم میں اساتذہ میں سے کسی شاعر کی نعت پڑھ کر پوری محفل پر سحر طاری کردیا اور فضا نعرۂ تکبیر، نعرۂ رسالت اور نعرہ حیدری سے گونج اٹھی۔

گھروں کو چھوڑ کر جب ہم چلے تھے

ہندوؤں، سکھوں کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف نفرت کی آگ سلگ رہی تھی اس پر جو ہندو سکھ لاہور، سرگودھا راولپنڈی لائل پور (موجودہ فیصل آباد) منٹگمری (موجودہ ساہیوال) سے بھاگ کر آرہے تھے اور جنھوں نے اپنی اور اپنے عزیزوں کی تباہی اور وطن سے بے وطن ہو کر دلی میں پناہ لی تھی ان تباہ حال ہندوؤں اور سکھوں نے اپنی بربادی کے قصے سنائے تو ان حالات میں دلوں میں سلگتی نفرت کی آگ نے بھڑکنا شروع کردیا۔ دہلی آکر شرنارتھیوں نے سلگتی آگ پر تیل کا کام کیا ادھر مسلمان بھی بہار اڑیسہ اور کلکتہ میں ہندو کانگریسیوں کے ہاتھوں مسلمانوں کی تباہی و بربادی اور قتل عام کا حال سن چکے تھے یوں دونوں طرف انتقام کی آگ بھڑک اٹھی۔

تمار پور میں تین بلاک تھے بی سی اور ای تقریباً دو ہزار کوارٹر تھے ہمارے کوارٹر کا نمبر B-68 تھا جو پولیس چوکی کے سامنے تھا۔ ہندوؤں نے ہمارا نماز پڑھنے کا چبوترہ بھی توڑ پھوڑ کر برابر کردیا تھا اور اب اکیلے دکیلے مسلمان کو دیکھ کر قتل بھی کردیا جاتا تھا روزانہ قتل کی کوئی نہ کوئی واردات ضرور ہو جاتی تھی بہت سے معتبر مسلمان گھروں پر بم پھینکے جارہے تھے انہی دنوں ایک ہندو نوجوان نے میرے بیٹے مشتاق پر پیچھے سے چاقو کا وار کیا مگر اس بزدل کا وار بڑا اوچھا تھا اور مشتاق نے اس سے چاقو چھین لیا۔

ہندوستان کی تقسیم کا فیصلہ ہو چکا تھا اور پاکستان کے قیام کا اعلان کردیا گیا تھا۔ لاکھوں کی تعداد میں ہندو سکھ، مسلمان اپنی اپنی جانیں بچانے کی خاطر اپنے بھرے پرے گھروں کو چھوڑ کر انجانے ٹھکانوں کی جانب روانہ ہو رہے تھے۔

ہمارا گھر بھی ایک مرتبہ پھر ہجرت کے مرحلے سے گزرنے کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ ۱۹۳۹ء میں ہم نے اپنے گاؤں میانی افغاناں سے دہلی کی طرف ہجرت کی تھی اور اب ۱۹۴۷ء میں ہم اپنے خوابوں کی تعبیر وطن پاکستان کی جانب ہجرت کر رہے تھے اور ہمیں کراچی کی طرف کوچ کرنا تھا مسلمان سرکاری ملازمین کو پاکستان روانگی کا اشارہ مل چکا تھا میرے بیٹے مشتاق کو بھی اپنے سرکاری محکمہ کی جانب سے ریلوے ٹکٹ مل گئے تھے ہم نے سامان باندھ لیا تھا جس پر سرکاری دفتر کی چھپی ہوئی پرچیاں چسپاں کردی گئی تھیں ۱۳ اگست ۱۹۴۷ کو اسپیشل ٹرین دہلی سے پاکستان جانے کے لئے روانہ ہونے والی تھی ادھر ہندو غنڈے مشتاق اور حبیب کی تاک میں تھے ان کی عین منشاء تھی کہ یہ دونوں بھائی کسی بھی طرح زندہ بچ کر نہ جانے پائیں۔

جوگ راج اور بھٹ ناگر نے دوستی نبھائی

جوگ راج اور بھٹ ناگر مشتاق کے بڑے جگری یار تھے ان کو بڑی پکی اطلاع ملی تھی کہ آج رات مشتاق اور حبیب کو لازماً قتل کرنا ہے یہ اطلاع پاکر جوگ راج اور بھٹ ناگر بے چین ہو گئے اور انہوں نے کسی طرح مشتاق سے مل کر اسے کہا کہ کسی بھی حالت میں تم اور تمہارا بھائی حبیب آج ہی یہ گھر چھوڑ دو کیونکہ آج رات تم دونوں بھائیوں کو قتل کردیا جائے گا۔ دشمنوں نے جو منصوبے بنا رکھے تھے وہ اپنی جگہ درست مگر قدرت کو بچانا مقصود ہو تو انسان کے بنائے ہوئے سارے منصوبے دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں جوگ راج اور بھٹ ناگر نے تو دوستی کا حق ادا کر ہی دیا تھا مگر تیمار پور کے پولیس اسٹیشن پر بھی اس گھناؤنے منصوبے کی مخبری ہو چکی تھی اسی لئے تھانے سے اصغر نامی ایک سپاہی آیا اور مشتاق کو اپنی سائیکل پر

بٹھا کر لے گیا کچھ دیر بعد ایک اور سپاہی آیا اور وہ حبیب کو اپنے ساتھ بٹھا کر لے گیا تھانہ
انچارج مشتاق کا دوست تھا۔ اسی نے یہ کارروائی کی تھی پھر اسی دن دونوں بھائیوں کو پہاڑ گنج
کے ریلوے اسٹیشن پہنچایا گیا۔ جہاں سے اگلے روز اسپیشل ٹرین بخیر و عافیت روانہ ہو گئی۔ بعد
ازاں اصغر نامی سپاہی نے گھر آکر ہمیں مشتاق اور حبیب کے بارے میں اطلاع دی کہ وہ
بخیریت کراچی پاکستان روانہ ہو گئے ہیں۔ پھر اصغر سپاہی نے مجھے بھی مشورہ دیتے ہوئے کہا۔
کہ اباجی آپ بھی اپنی ٹبری (فیملی) لے کر جلد ہی دلی سے چلے جاؤ۔

اور پھر خواجہ کی نگری خون میں نہا گئی

اے وطن تیرے لئے

مشتاق اور حبیب کے بخیریت روانہ ہونے پر ہم ماں باپ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کر رہے تھے۔ اگلے روز صبح کئی ہندوؤں نے مجھ سے مشتاق اور حبیب کے بارے میں پوچھا تو میں نے بتایا کہ سرکاری حکم کے مطابق مشتاق اپنے بھائی حبیب کے ہمراہ پاکستان روانہ ہو گیا ہے۔
مشتاق اور حبیب کی روانگی کے اگلے روز یعنی ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کے دن میرے علاوہ باقی تمام گھر والے بھی میرے چھوٹے بھائی اقبال محمد کے ہمراہ پاکستان کے لئے روانہ ہو گئے۔ اقبال محمد' وائسرائے کے دفتر میں ملازم تھا اور اسے بھی اپنے خاندان کے لئے پانچ ریلوے ٹکٹ ملے تھے میں اپنی دکانداری کے لالچ میں خود اپنی ہی مرضی سے اکیلا دہلی میں رک گیا تھا۔ میری دوکان فراش خانے کے قریب نئی چوڑی میں تھی۔ عید الفطر قریب تھی اور اسی وجہ سے میں نے کاریگروں سے کافی مال بنوالیا تھا۔ کچھ کاروباری لین دین کے معاملات تھے۔ سوچا یہی تھا کہ چند دنوں میں کاروباری معاملات نمٹا کر میں بھی پاکستان روانہ ہو جاؤں گا۔ مگر میرے اندازے بہت غلط نکلے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس قدر تباہی و بربادی کا بازار گرم ہو جائے گا۔ اس طرح انسانی خون بہایا جائے گا۔ میں اپنی فیملی کو پاکستان کے لئے روانہ کر کے سیدھا اپنی دوکان پر آ گیا تھا۔ مگر پھر گھر نہ جا سکا۔ اور شہر کے حالات اچانک ایسے بگڑے کہ میں اپنی دوکان میں مقید ہو کر رہ گیا۔ سارے دہلی شہر میں آگ و خون کی ہولی کھیلی

جارہی تھی مگر پھر بھی شہر کے چند علاقے ایسے تھے کہ جہاں نسبتاً" امن تھا۔ فراش خانہ' نئی چوڑی' پنڈت کوچہ' لال کنواں' بلی ماراں' چاندنی چوک' جامع مسجد' محلہ سوئی والاں' یہ تمام علاقے مسلم آبادی والے تھے۔ اور یہ علاقے مسلمانوں کے لئے خصوصاً پناہ گاہ بن گئے تھے۔ جہاں مسلمان زخمی حالت میں بھاگ بھاگ کر آرہے تھے۔ تباہ حال مسلمانوں کے بھرے ہوئے تانگے ان علاقوں میں آتے تھے ان میں بچے بوڑھے' جوان' عورتیں' مرد سبھی شامل ہوتے تھے۔ انہی لوگوں کی زبانی پتہ چلتا تھا۔ کہ قرول باغ' سبزی منڈی' قطب روڈ' پہاڑ گنج' محلہ پتھر پھوڑاں' اجمیری گیٹ' بازار سیتارام' حوض قاضی' نئی دلی' رائے سینا' یہ تمام علاقے انسانیت سوزی کی مکمل زد میں ہیں۔ انہی علاقوں سے زیادہ تر مسلمان لٹے پٹے' زخمی ادھ موئے تانگوں میں بھرے آتے تھے۔ یہ دل ہلا دینے والے مناظر دیکھ کر میرے حواس ساتھ چھوڑتے ہوئے سے محسوس ہوتے تھے۔ نئی دہلی باراں کھمبا سے بھی تباہ حال لوگ آئے' تو ان سے اپنے واقف کاروں کے بارے میں پوچھا جو اسی علاقہ میں رہتے تھے' تو انہوں نے بتایا کہ وہ سب لوگ مار دیئے گئے' ماسٹر خیر الدین' حاجی صاحب' کارخانے والے' ڈاکٹر حسین بخش' دونوں بھائی تمام کنبہ سمیت' درندہ صفت ہندوؤں کی ستم گری کا نشانہ بن گئے۔

ادھر اپنے آبائی گاؤں میانی افغاناں اور قریبی گاؤں ٹانڈہ اڑمڑ' پر بمباری کے نتیجہ میں بھاری جانی و مالی نقصان کی اخباری خبر پڑھ کر مجھ پر کیا گزری' وہ بیان سے باہر ہے۔ گاؤں کے بارے میں خبر پڑھ کر بار بار مجھے اپنے بوڑھے تایا جی فضل محمد کا خیال آتا تھا۔ ان کے علاوہ میرے دو بھائی مبارک علی اور صادق علی بھی اپنے بال بچوں سمیت گاؤں ہی میں تھے۔ دیگر عزیز و اقارب کا غم' ان حالات نے مجھے بیمار کر دیا۔ میں پیٹ کے درد اور پیچش کے مرض میں مبتلا ہو گیا۔ طبیعت زیادہ ہی بگڑی تو میں فراش خانے حکیم سراج الدین صاحب کے مطب چلا گیا۔ فراش خانہ' مسلم اکثریتی علاقہ ہونے کی وجہ سے محفوظ تھا۔ مطب پہنچا تو دیکھا کہ حکیم صاحب قبلہ گاؤ تکیہ لگائے بیٹھے ہیں۔ سامنے فرشی حقہ' خدام حاضر خدمت عمدہ غالیچہ' میں نے نبض دکھا کر اپنا حال بیان کیا۔

حکیم صاحب نے مجھے پانچ پیسے کی دوا دی۔ اور اسے پانی میں بھگو کر پینے کے لئے فرمایا۔ بفضل خدا اس دوا کے استعمال سے مجھے عین صحت ہو گئی۔

پانڈوں کا ڈھائی ہزار سال پرانا قلعہ

کانگرسی ہندو دلی کے مسلم اکثریتی علاقوں میں بھی گشت کرتے تھے۔ وہ بڑی میٹھی زبان میں گفتگو کرتے ہوئے کہتے۔

میاں جی! شانتی کرو، صبر کرو، دیکھو وقت آئے گا اور پھر ہم آپ کو بحفاظت پاکستان پہنچائیں گے۔

مگر وقت تو ایسا آگیا تھا کہ دنیا سے اعتبار ہی اٹھ گیا تھا۔

شہر میں ایک دو جگہ پر مسلم پناہ گزینوں کے کیمپ قائم ہو چکے تھے۔ مقبرہ ہمایوں بھی کیمپ میں تبدیل ہو گیا تھا۔

ہم آخر کب تک شہر میں مقید رہتے، لہٰذا میرے ساتھ چند اور ہمراہیوں نے مشورہ کرکے ایک کرائے کا ٹرک منگوایا جس کے ذریعے مجھ سمیت بہت سے لوگ مقبرہ ہمایوں کے مسلم پناہ گزین کیمپ میں منتقل ہو گئے۔ اس کے بعد بھارتی سرکار نے کئی ہزار پناہ گزینوں کو پانڈوں کے قلعہ میں منتقل کر دیا۔ پانڈوں کا قلعہ ڈھائی ہزار سال قبل مسیح پرانا تھا۔ آدم نہ آدم زاد برسوں ہوئے کبھی کوئی یہاں سے نہ گذرا ہو گا۔ سانپ، بچھو، اور دیگر زہریلے کیڑوں کا مسکن، اور پھر روزانہ شدید بارش کا سلسلہ بھی جاری۔ پچھتر ہزار انسان وہیں کھاتے اور وہیں رفع حاجت کے عمل سے بھی گزرتے۔ پناہ گزینوں کو روزانہ دو چھٹانک چاول فی کس بطور خوراک دیئے جاتے تھے۔ اس کے ساتھ تھوڑا سا نمک بھی دیا جاتا تھا یہ راشن تھا۔ بس زندہ رہنے کا سہارا تھا۔ اسی قلعہ میں ایک مسلمان ٹھیکیدار کی لاکھوں روپوں کی مالیت کی عمارتی لکڑی پڑی تھی جسے پناہ گزین بطور ایندھن جلاتے تھے اور فراخ دل ٹھیکیدار نے ایسا کرنے کی کھلی چھٹی دے دی تھی۔ بہت سے پناہ گزین ان حالات میں رہتے ہوئے بیمار

ہو گئے تھے۔ یہ پرانا قلعہ دو میل کے علاقے پر پھیلا ہوا تھا۔ اس قلعہ میں رہنے والوں کے لئے ہدایت تھی کہ اگر ایک دروازے سے نکلو تو پھر دوسرے دروازے سے قلعہ کے اندر داخل ہونے دیا جاتا تھا۔ اس طرح میلوں کا فاصلہ طے کرکے اپنے ٹھکانے پر پہنچا جاتا تھا۔ قلعہ کے باہر بھی ضرور جانا پڑتا تھا۔ کیونکہ ضروریات زندگی کی اشیاء قلعہ سے باہر فروخت ہوتی تھیں اور پانی پینے کے نلکے بھی قلعہ سے باہر تھے۔ گھنٹوں لائن میں لگ کر پانی ملتا تھا۔ اس قلعہ کی نگرانی بلوچ رجمنٹ کرتی تھی۔

پانڈوں کے قلعہ میں ڈاک و تار کا نظام

ایک امریکن خاتون نے اس قلعہ میں ڈاک و تار ورسل و رسائل کا نظام قائم کیا تھا۔ پچھتر ہزار مہاجرین کو علاقہ اور وارڈز میں تقسیم کیا گیا۔ اس طرح کیمپ میں رہنے والوں کو ہندوستان و پاکستان میں ہر جگہ خط و کتابت کی سہولت مہیا کی گئی۔ یہ انتظام خاصا کامیاب رہا اور مہاجرین کی اپنے عزیز و اقارب سے خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ایک دن ماسٹر میت اللہ جو درزی تھے۔ اور ہمارے گاؤں کے رہنے والے تھے' نے مجھے کہا کہ قلعہ میں موجود مہاجرین پاکستان کے مختلف علاقوں میں اپنے عزیز و اقارب سے خط و کتابت کے ذریعہ رابطہ کر رہے ہیں۔ لہٰذا تم بھی پاکستان میں اپنے عزیزوں سے رابطہ کرو۔ اور ان کی خیریت معلوم کرو۔ اور اپنے بارے میں بھی انہیں آگاہ کرو۔ ماسٹر میت اللہ نے مزید بتایا کہ جو سرکاری ملازمین پاکستان چلے گئے ہیں وہ اپنے رشتہ داروں کو کہ جو ہندوستان میں رہ گئے ہیں بذریعہ ہوائی جہاز پاکستان بلوا رہے ہیں۔ اس بارے میں ہندوستان اور پاکستان کی حکومتوں نے باہم فیصلہ کیا ہے۔ یوں تمہارا بیٹا' تاق تمہیں بذریعہ ہوائی جہاز پاکستان بلوانے کا انتظام کرسکتا ہے۔ لہٰذا تم اپنے بیٹے کو خط لکھو۔ ماسٹر میت اللہ کی بات سن کر میں نے ان سے کہا کہ جناب آپ کی ہمدردی کا بہت بہت شکریہ' مگر میں پاکستان کیسے جاؤں' جب کہ میں نے اخبارات میں پڑھا ہے کہ میانی' ٹانڈہ' اڈمڑ پر بمباری کی گئی ہے۔ میرے تایا جی فضل محمد اور

میرے دو بھائی بال بچوں سمیت گاؤں میں ہیں۔ میں جب تک ان کے بارے میں مطمئن نہ ہو جاؤں کیسے پاکستان جاؤں میری بات سن کر ماسٹر صاحب بولے "کہ میانی' ٹانڈہ خط لکھنا تو بے کار ہو گا۔ کیونکہ وہاں مسلمانوں کا ایک دانہ بھی نہیں بچا۔ لہٰذا گاؤں میں موجود عزیزوں کے حق میں زندہ بچ جانے کی دعا یا دعائے مغفرت ہی کی جاسکتی ہے۔ اور تم خط اپنے بیٹے ہی کو لکھو۔

ماسٹر صاحب کی بات سن کر میں نے کہا کہ مجھے تو اپنے بیٹے کے محکمہ کے بارے میں علم نہیں ہے۔ کہ وہ کہاں اور کس محکمہ میں کام کر رہا ہے۔ اس پر ماسٹر صاحب بولے کہ محکمہ تو وہی ہو گا کہ جہاں دلی میں تمہارا بیٹا کام کرتا تھا۔ پھر مجھے یاد آیا "کہ مشتاق کے محکمہ کی چٹیں' چھپی ہوئی تھیں جو بوقت روانگی' مشتاق نے تمام صندوقوں اور سوٹ کیسوں پر چسپاں کی تھیں اور وہی چٹ میرے سوٹ کیس پر بھی چسپاں تھی۔ اس طرح میں نے محکمہ اطلاعات و نشریات کراچی پاکستان کے پتہ پر اپنے بیٹے مشتاق کے نام خط لکھا کہ میں پرانا قلعہ میں مقیم ہوں۔

میرے خط لکھنے کے دس بارہ دن بعد چند لوگ مجھے ڈھونڈتے ہوئے آئے اور کہنے لگے کہ آپ کے بیٹے مشتاق حسین نے ہمیں آپ کے پاس بھیجا ہے۔ آپ تیار ہو جاؤ ہم آپ کو بحفاظت کراچی لے جائیں گے۔ میں نے ان لوگوں سے پوچھا کہ میرے اہل خانہ خیریت سے ہیں؟ تو وہ بولے کہ وہ عین خیریت سے ہیں اس پر میں نے ان لوگوں سے کہا' میرے بیٹے مشتاق سے کہہ دینا کہ میں زندہ ہوں اور اگر بچ گیا تو جالندھر اور اپنے گاؤں میانی ہوتا ہوا پاکستان آؤں گا۔ اور میں ان تمام مہاجرین کے ساتھ ہی پاکستان آؤں گا۔ جیسے یہ سفر کریں گے میں بھی انہی کے ساتھ سفر کروں گا۔ اللہ ہم سب کا محافظ ہے۔

شدید بارشیں گندگی' روزانہ دو چھٹانک چاول بطور خوراک' جسے ہم چند افراد مل کر ایک بالٹی میں پکاتے تھے۔ کیمپ کے ماحول نے اکثر مہاجرین کو پیچش کے موذی مرض میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس موذی مرض کی قدرت نے ہمیں ایک دوا بھی مفت مہیا کر دی تھی۔

حضرت نظام الدین اولیا کی بستی پرانے قلعہ کے پاس ہی تھی۔ پرانے قلعہ سے جو سڑک بستی نظام الدین اولیاء کو جاتی تھی اس کے دونوں کناروں پر املی کے درخت لگے ہوئے تھے۔ مہاجرین ان درختوں سے املی اور اس کی کونپلیں توڑ کر لاتے تھے، جنہیں گھوٹ کر کھچڑی میں پکا کر کھانے سے پیچش کی تکلیف میں خاصا افاقہ ہو جاتا تھا۔

اسی اثناء میں اسپیشل ٹرینیں حضرت نظام الدین اولیاء اسٹیشن سے چلنے لگیں۔ اور مہاجرین ٹرینوں کے ذریعہ پاکستان روانہ ہونے لگے روزانہ مہاجرین اسٹیشن جاتے جو طاقت و زور لگا کر ریل گاڑی میں سوار ہو جاتا ہو جاتا باقی مہاجرین واپس پرانے قلعہ میں آجاتے اور اگلے روز کی ٹرین کا انتظار کرتے۔ میں بھی تین چار بار اسٹیشن گیا مگر کمزوری کے باعث میں ٹرین میں سوار نہ ہو سکا۔ مگر جس دن خدا کو منظور تھا۔ اس روز میں نہایت سہولت کے ساتھ ریل گاڑی میں سوار ہو گیا۔

ریل گاڑی، حضرت نظام الدین اولیاء کے اسٹیشن سے روانہ ہوئی۔ تو میں نے بے تحاشا دھڑکتے دل کے ساتھ ہاتھ اٹھا کر اپنے تایا جی فضل محمد اور بھائیوں مبارک علی اور صادق علی، بہن خدیجہ بی بی کے لئے دعا کی کہ خدا ان کو اپنے حفظ و امان میں رکھے اور وہ بھی پاکستان پہنچ گئے ہوں۔

ریل گاڑی دہلی سے روانہ ہو کر سہارنپور، انبالہ، ایک یوم ٹھہری پھر آہستہ آہستہ راستے میں جگہ جگہ کھڑی ہوتی ہوئی پٹیالہ کے راستے موگا پہنچی راستے میں کیا کیا خطرناک لمحے آئے کیا بیان کروں۔ وطن پاک کا عشق تھا کہ جس کی سرشاری میں مہاجرین چلے جا رہے تھے آخر ٹرین جالندھر سے بڑی تیز رفتاری کے ساتھ فاصلہ طے کرتی ہوئی امرتسر پہنچ گئی۔ امرتسر میں ٹرین ایک یوم کھڑی رہی۔ ٹرین کی کھڑکیاں بند تھیں اور چاروں طرف موت رقصاں تھی، کسی بھی لمحہ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ ہم میں کوئی بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ پاکستان زندہ پہنچ سکے گا یا نہیں۔ لیکن اللہ کو یہی منظور تھا۔ کہ ہم نے پاکستان زندہ سلامت پہنچنا تھا، سو ہم واہگہ کے راستے لاہور پہنچ گئے۔

والٹن اسکول میں مہاجرین کو ٹھہرایا گیا پانڈوں کے قلعہ میں دو ماہ کے اذیت ناک دن

گزار کر ہم وطن عزیز پہنچے تھے۔ وطن کی زمین پر پہنچ کر دل و دماغ سے خوف کے سائے یک دم دور بھاگ گئے تھے اور ان کی جگہ آزادی' آزادی اور بس آزادی نے لے لی تھی میں نے اپنا سوٹ کیس ایک جانب رکھا اور ٹوٹا پھوٹا سا بستر ایک طرف بچھایا اور سو گیا' میرے پاؤں میں اپنی ہی دکان کی بنی ہوئی نئی جوتی تھی۔ صبح سو کر اٹھا تو جوتی غائب تھی۔ میں نے اپنا سامان ایک ساتھی کے سپرد کیا۔ اور حاضری کے لئے حضرت داتا گنج بخشؒ کے دربار روانہ ہو گیا۔

داتا کے دربار میں پہنچ کر میں نے سلام عقیدت پیش کیا اور خدا کے نیک بندے کے مزار پر دعا مانگی کہ اے اللہ میرے بہن بھائی اور تایا جی خیریت سے ہوں۔ سلام و دعا کے بعد میں داتا دربار کے احاطے میں کھڑا ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ کہ کوئی ہم وطن قریبی جاننے والا نظر آئے تو میں اپنے بہن بھائیوں کے بارے میں اس سے پوچھوں مگر کوئی جان پہچان والا نظر نہیں آرہا تھا۔ میں مایوس سا ہو کر دربار کے احاطے سے نکل کر باہر بازار میں آ گیا جہاں اچانک میری نظر ایک نوجوان پر ٹھہر گئی۔ جو کھیر بیچ رہا تھا۔ میں نے اسے پہچان لیا تھا وہ میرا بھانجا محمد شریف تھا۔ میں نے اس کا نام لے کر اسے پکارا' اس نے پلٹ کر مجھے دیکھا اور ماما جی کہہ کر میری جانب لپکا اور ہم دونوں ایک دوسرے سے بغل گیر ہو گئے اور پھر وہ دوبارہ کھیر بیچنے میں مشغول ہو گیا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ تمہارے والد کا کیا حال ہے۔ تمہاری ماں کیسی ہے۔ تمہارا بھائی لطیف کیسا ہے۔ تمہارا چچا شیر محمد کیسا ہے۔ مگر محمد شریف نے میرے کسی بھی سوال کا جواب نہیں دیا۔ اور بس یہی کہتا رہا۔ کہ ابھی بتاتا ہوں ماما جی۔

آخر تمام کھیر بک گئی۔ تب میں نے اپنے بھانجے سے دوبارہ ان کے ماں باپ چچا اور بھائی کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتانا شروع کیا۔ ابا جی بیمار اور کمزور ہو گئے تھے اور لاہور آکر فوت ہو گئے۔ چچا شیر محمد بھی بیماری کا مقابلہ نہ کر سکے۔ اور جان ہار بیٹھے اماں اور بھائی لطیف قافلے کے ہمراہ پیدل نہ چل سکے۔ راستے میں ادھ موا سا انہیں بے گور و کفن چھوڑ آیا۔ بس ان کی چند سانسیں ہی اور باقی تھیں۔

یہ ایک خاندان کی کہانی نہیں ہے۔ نہ جانے کتنے خاندان ایسی ہی یا اس سے بھی بڑھ کر

قربانیاں دیتے ہوئے پاک وطن کی چاہت میں پاکستان پہنچے تھے۔

پاکستان پہنچ کر میں اپنے بہن بھائیوں سے ملا جو اپنے بال بچوں سمیت زندہ سلامت پاکستان پہنچ گئے تھے۔ انہی کی زبانی پتہ چلا کہ تایا جی فضل محمد کسی صورت بھی اپنا گاؤں چھوڑنے پر رضامند نہ ہوئے اور ان کا یہی کہنا تھا کہ عنایت اور رابعہ بصری دہلی سے آئیں گے تب دیکھا جائے گا۔ خدا مغفرت کرے بعد میں پتہ چلا کہ ان کو مسجد میں اس وقت شہید کیا گیا جب وہ حالت نماز میں تھے۔

اپنے بہن بھائیوں سے ملاقات کے بعد میں کراچی روانہ ہوگیا۔ اس وقت تک میرے بڑے بیٹے مشتاق کو جٹ لائن میں بلاک نمبر ۳۵ کا کوارٹر نمبر ۳ سرکار کی جانب سے الاٹ ہوچکا تھا۔ ابتدا میں میری فیملی بھی مہاجرین کے ساتھ اک اک اسکول کلفٹن میں قائم مہاجر کیمپوں میں رہی' جہاں بابا عبداللہ شاہ غازیؒ کا مزار قریب ہی تھا' یوں ہم خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے قدموں سے اٹھ کر غازی عبداللہ شاہؒ کے قدموں میں آبیٹھے۔

میں کراچی پہنچا تو میرے گھر والے مجھ سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ کیونکہ وہ تو میرے بارے میں پختہ ہوچکے تھے کہ میں حالات کا شکار ہوچکا ہوں۔ بہر حال ہم سب زندہ تھے مگر زندگی گزارنے کے لئے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ مشتاق ملازم تھا مگر اس کے کاندھوں پر اپنے بال بچوں کا بوجھ تھا۔ ہم میاں بیوی تو محنت مزدوری کے پرانے عادی تھے سو ہم نے اپنی ملبیس پھر سے اپنے کاندھوں پر اٹھالیں' خصوصاً میری اہلیہ رابعہ بصری نے ذمہ داریوں کا خاصا بوجھ اٹھالیا وہ روزانہ جٹ لائن سے پیدل پانچ میل دور بولٹن مارکیٹ جاتی وہاں سے والیس صابن کپڑا خرید کر بیس پچیس سیر وزن سر پر اٹھا کر پیدل ہی واپس آتی اور پھر جٹ لائن' جیکب لائن' ابی سینیا لائن کی گلیوں میں والیس' صابن' کپڑا فروخت کرتی۔ میں نے بھی جٹ لائن کے بازار میں چھوٹی سی دکان کھول لی تھی۔ یوں ہم میاں بیوی نے حبیب' رشیدہ اور حمید کی تعلیم کے سلسلے کو جاری رکھا' سعید اس وقت بہت چھوٹا تھا حبیب کو میں نے جیکب لائن کے اسکول میں داخل کردیا۔ جہاں وہ میٹرک کا طالب علم تھا۔ ہم ماں باپ کی امیدوں کا مرکز اب حبیب تھا۔ ہم چاہتے تھے کہ یہ بچہ بھی میٹرک پاس کرلے' تاکہ اپنے بڑے بھائی مشتاق کی

طرح کسی سرکاری محکمہ میں کلرک بھرتی ہو جائے ہمیں مطلق احساس نہیں تھا کہ ہمارا بیٹا حبیب کوئی شاعر واعر بنے گا۔ مگر ہم دیکھ رہے تھے کہ حبیب میں بڑی تیزی کے ساتھ تبدیلیاں آرہی تھیں۔ اس کے انداز و اطوار بدل رہے تھے۔ اس کی باتیں اس کے شب و روز کی مصروفیات سب کچھ ہماری سمجھ سے بالا تر تھا۔ ابھی وہ اسکول ہی میں تھا۔ کہ شہر کے نوجوان شعراء میں اس کا نام لیا جانے لگا۔ اس کے بال تو گھنے تھے ہی مگر اب اس کے کاندھوں پر باقاعدہ زلفیں جھولتی نظر آنے لگیں تھیں۔ وہ بہت زیادہ گم صم رہنے لگا تھا۔ اور مجھے پتہ چلا کہ اس نے مست تخلص بھی رکھ لیا ہے اور اب وہ حبیب احمد مست ہو گیا ہے۔

حبیب کی یہ تمام حرکتیں ہم والدین کے لئے قطعی ناقابل برداشت تھیں۔ پاکستان نیا نیا بنا تھا ہم بھی سبھی کی طرح شدید معاشی بدحالی کا شکار تھے۔ ایسے میں ہماری امیدوں کا سہارا' ہمارا مستقبل حبیب کی صورت میں ہمیں تاریک نظر آنے لگا۔ ہم والدین نماز کے بعد حبیب کے حق میں خصوصاً دعا کرتے کہ اے خدا اسے سیدھا راستہ دکھا' یہ ہمارا بچہ کس رستے پر چل نکلا ہے۔ دعاؤں کے ساتھ ساتھ ہم نے حبیب سے سختی کا رویہ بھی اختیار کر لیا تھا۔ ہماری سختی کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس نے گھر سے غائب رہنا شروع کر دیا۔ اور پھر یوں ہوا کہ ہم بوڑھے والدین کے لئے ایک اور مصروفیت نکل آئی' اور وہ یہ کہ ہم جوان بیٹے کی تلاش میں مارے مارے پھرنے لگے۔ حبیب نے کراچی ریڈیو اسٹیشن سے پروگرام کرنا شروع کر دیئے جہاں وہ اساتذہ کا کلام ترنم سے پڑھتا' کبھی کبھی ریڈیو سے بیٹے کی آواز سن کر ہم ماں باپ ریڈیو اسٹیشن کی طرف بھاگتے مگر وہاں پہنچ کر پتہ چلتا کہ وہ تو پروگرام کر کے جا چکا ہے۔

ہم ماں باپ تو اس کی جدائی میں تڑپتے ہی تھے۔ مگر اس کی نابینا نانی میری خوش دامن "مائی گوماں" (ان کا اصل نام غلام فاطمہ تھا) نے الگ ہمارا جلوس نکال رکھا تھا۔ وہ دن رات ہمیں برا بھلا کہتی رہتیں کہ تم دونوں ماں باپ نہیں ہو۔ قصائی ہو' تم دونوں میرے بچے حبیب کے دشمن ہو وہ جب گھر آتا ہے تو تم دونوں اسے مارتے ہو اور پھر وہ کیا کرے۔ آخر وہ تم موذیوں سے اپنی جان بچا کر بھاگ جاتا ہے۔

ہمیں برا بھلا بول کر مائی گوماں اپنا ڈنڈا اٹھا کر چل دیتیں۔

لو تم بیٹھو' میں جاتی ہوں۔ اپنے حبیب کو ڈھونڈنے ہائے میرے کانوں میں اس کی آوزیں آرہی ہیں وہ پریشان ہے وہ بھوکا ہے۔

میں آرہی ہوں' حبیب' میں آرہی ہوں۔

حبیب کی نانی کو دراصل اپنے نواسے سے بے پناہ عشق تھا۔ حبیب اپنی نانی کا پرانا ساتھی بھی تھا۔ گاؤں میں ننھا حبیب اپنی نابینا نانی کا ہاتھ اپنے کندھے پر رکھ کر گلی گلی ازار بند' اور پراندے (چٹلے) بیچا کرتا تھا۔ اس کی نانی بینائی نہ ہونے کے باوجود ازار بند' اور پراندے وغیرہ خود بن لیتی تھیں۔ تو حبیب کی نانی' اس کے گھر سے چلے جانے پر دن رات ہمیں برا بھلا کہتی رہتیں تھیں۔

ارے بچہ دشمنوں میں پھنس گیا ہے۔ وہ مصیبت میں گرفتار ہے۔ اسے تلاش کرو۔

اس وقت مائی گوماں کی عمر یقیناً سو سے اوپر تھی حبیب کے بارے میں وہ یوں نقشہ کھینچتی' کہ میں تڑپ اٹھتا اور حبیب کی تلاش میں نکل جاتا۔

صدر کے ہوٹل رسائل کے دفاتر مگر کہیں سے حبیب کے بارے میں کچھ بھی پتہ نہ چلتا۔

ایک بار حبیب کے اسکول ماسٹر نصر اللہ خان (کالم نویس) ہمارے گھر تشریف لائے۔ وہ مجھ سے ہی ملاقات کے لئے آئے تھے۔ وہ کہنے لگے کہ آپ کا بیٹا مست' ماشاء اللہ ذہین نوجوان ہے۔ اور شعر بھی اچھے کہتا ہے۔ میں اس لئے آپ کے پاس آیا ہوں۔ کہ آپ اسے میری سپردگی میں دے دیں' میں اسے اپنے گھر میں رکھوں گا۔ اور اسے پڑھاؤں گا۔ میں نے ذرا سی پس و پیش کے بعد ان کی بات مان لی اور اس طرح حبیب کچھ دن' اپنے ماسٹر نصر اللہ خان کے گھر واقع جہانگیر روڈ سرکاری کوارٹر میں رہا۔

مگر لا حاصل

ہم اسے اپنی جانب کھینچ رہے تھے۔ مگر کوئی اور طاقت اسے کہیں اور لئے چلی جارہی تھی۔

اب میرا حبیب' حبیب احمد مست سے حبیب جالب بن چکا تھا۔ ہم ماں باپ نے ابھی تک ہمت نہیں ہاری تھی اور مست کی طرح ہم نے جالب کا بھی تعاقب جاری رکھا ایک دن

جب حبیب جالب، حبیب احمد مست ہوا کرتے تھے

میں حبیب کو تلاش کرتا ہوا کوکب شادانی کے ہاں پہنچ گیا جو کوئی رسالہ نکالتے تھے۔ میں نے کوکب صاحب سے عرض کیا کہ جناب میرا بیٹا حبیب جالب جو کبھی کبھی آپ کے پرچے میں بھی چھپتا ہے ادھر آپ کی طرف تو نہیں آیا؟

میرے سوال پر کوکب شادانی صاحب نے برا سامنہ بنا کر جواب دیا۔

ارے میاں' اس لونڈے کی کیا مجال کہ میرے پرچے میں چھپے' ہاں البتہ کبھی کبھی آجاتا ہے اور بینچ پر پڑا رہتا ہے۔ بعد ازاں کوکب شادانی کے بڑے بھائی ڈاکٹر عندلیب شادانی نے برگ آوارہ کا دیباچہ لکھا۔ جو پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

اسی طرح ایک بار میں رئیس امروہوی صاحب کے پاس' حبیب کو تلاش کرتا ہوا پہنچ گیا تو رئیس صاحب نے ازراہ مذاق اپنے کسی شاگرد سے کہا۔

بھئی لانا تو ذرا لال جنتری' تاکہ پتہ کیا جائے کہ حبیب جالب اس وقت کہاں ہو گا۔

ہم والدین کی اپنی سوچ تھی مگر حبیب یقیناً اپنا رستہ متعین کر چکا تھا۔ اب وہ کبھی لاہور' کبھی لائل پور اور کبھی بہاولپور' ظہور نظر کے پاس ہوتا۔ اسی دوران کبھی کبھی وہ گھر لوٹ بھی آتا مگر پھر چلا جاتا۔

اسی طرح ایک بار وہ گھر سے فرار تھا۔ اسے گئے بہت دن ہو گئے تھے کہ ہمیں مشتاق نے اطلاع دی کہ آج رات پرانی نمائش (کراچی) پر ایک بڑا مشاعرہ ہو رہا ہے۔ جہاں حبیب بھی آرہا ہے اس وقت تک حبیب خاصا مشہور ہو چکا تھا۔ زہرہ نگاہ اور حبیب اپنی شاعری کے ساتھ ساتھ خوبصورت ترنم کی وجہ سے بھی بڑے مشہور تھے۔ ہم نے جب یہ سنا تو ہم دونوں میاں بیوی نے اسے رنگے ہاتھوں پکڑنے کا پروگرام بنالیا۔ اور پھر پروگرام کے مطابق ہم دونوں میاں بیوی ڈنڈے لے کر مشاعرہ گاہ میں پہنچ گئے۔ مشاعرہ خوب عروج پر تھا۔ ہم دور بیٹھے مشاعرہ سن رہے تھے۔ مگر ہمیں حبیب کہیں نظر نہیں آرہا تھا کہ اچانک اسٹیج سیکریٹری نے حبیب کا نام پکارا اور خدا معلوم وہ کہاں سے مائیک پر آگیا۔

ہمارا بیٹا حبیب ہم سے چند گز کے فاصلے پر اپنے اشعار' جادو بھری آواز میں پڑھ رہا تھا۔

آج اس شہر میں کل نئے شہر میں بس اسی لہر میں

پورے مشاعرے پر وہ چھایا ہوا تھا۔ میں اندر ہی اندر خوش بھی ہو رہا تھا۔ میں نے حبیب کی ماں کو دیکھا۔ وہ بھی بیٹے کے مل جانے پر خوش نظر آ رہی تھی۔ ہم دونوں میاں بیوی آہستہ آہستہ اسٹیج کی جانب کھسک رہے تھے حتیٰ کہ جب حبیب غزل مکمل کر چکا تو ہم اسٹیج کے بالکل قریب پہنچ چکے تھے۔ اور پھر جیسے ہی حبیب اسٹیج سے اترا میں نے اسے دبوچ لیا ادھر حبیب کی ماں نے بھی کھینچ کے اس کی پیٹھ پر ڈنڈا مارا۔ لوگ جمع ہو گئے ان میں سے بعض یہ کہتے ہوئے ہماری جانب بڑھے۔

بڑے میاں

اے بڑی بی

کیا کر رہے ہو یہ جالب صاحب ہیں۔

اس سے پہلے کہ ہم اپنا تعارف کرواتے حبیب نے ہی ان لوگوں سے کہا۔

یہ میرے والدین ہیں۔

ہم دونوں میاں بیوی اسے پکڑ کر گھر لے آئے حبیب کی نابینا نانی' اس کی آمد پر بہت خوش تھی اس نے حبیب کو خوب گلے لگایا۔ ماتھا چوما اور اسے اپنی چارپائی پر ہی اپنے ساتھ بٹھا لیا۔

اب حبیب کی نانی نے پورے معاملے کو اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ اور ہمارے سارے ارادوں کو انہوں نے جیسے ملیامیٹ کر کے رکھ دیا تھا۔ اور وہ الٹا ہمیں کہہ رہی تھیں۔

بچہ تھک ہار کے آیا ہے۔ بھوکا ہے اسے کھانا دو۔ اور تم لوگ بھی سو جاؤ اور اسے بھی آرام کرنے دو۔ نانی گو ماں صاحبہ اس وقت سارے معاملات کو کنٹرول کر رہی تھیں۔ ہم حبیب کی پٹائی کرنے کے موڈ میں تھے مگر اس کی نانی نے اسے یوں سمیٹ رکھا تھا جیسے مرغی اپنے ننھے چوزوں کو اپنے پروں میں سمیٹ لیتی ہے۔

نانی جی کا حکم تھا۔ کہ خبردار اگر میرے بچے کو ہاتھ بھی لگایا۔

نانی جی نے اپنا ڈنڈا ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا۔ اور وہ کہہ رہی تھیں تم ماں باپ ظالم ہو اسی

لئے بچہ تمہارے ظلم سے تنگ آکر بھاگ جاتا ہے۔

حبیب صبح سو کر اٹھا تو اس کی بہن رشیدہ نے اسے چائے کا پیالہ دیا۔ حبیب نے ایک نظر اپنی اکلوتی بہن کو دیکھا، میں اور اس کی ماں قریب ہی بیٹھے قرآن شریف پڑھ رہے تھے حبیب اٹھ کر میرے پاس آگیا۔

ابا جی اب میں کہیں نہیں جاؤں گا۔

حبیب کی بات سن کر میں بڑا خوش ہوا۔ مگر مجھے بڑی حیرانی بھی ہو رہی تھی۔ میں ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ حبیب بولا۔

اب رشیدہ سیانی ہو گئی ہے۔

یوں ہم ماں باپ تو نہیں مگر اس کی بہن رشیدہ حبیب کے پیروں کی زنجیر بن گئی۔ میری صحت بھی جواب دیتی جا رہی تھی پاکستان آکر مجھ پر فالج کا حملہ بھی ہو چکا تھا۔ اسی لئے ایک دن حبیب نے مجھے بھی کام کرنے سے منع کر دیا اور بولا کہ ابا جی آج سے آپ ریٹائر ہو گئے۔

رشیدہ اور حمید اسکول میں پڑھ رہے تھے۔ سعید ابھی چھوٹا تھا۔ حبیب خاصا ذمہ دار ہو گیا تھا۔ اس دوران اس نے جنگ' انجام' اور ڈان اخبار میں بحیثیت پروف ریڈر کام کیا۔ اسی زمانے میں اس نے فلم اسٹوڈیو بھی جانا آنا شروع کر دیا تھا تاکہ اسے فلم کے گیت لکھنے کو مل جائیں۔ مگر حبیب کا قدرتی طور پر ایسا مزاج تھا کہ وہ ملازمت ہو' یا کوئی اور کام' عزت نفس کو وہ مجروح نہیں ہونے دیتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی زندگی میں بڑا اضطراب تھا۔ بے چینی تھی مگر وہ اندر سے بہت ہی مضبوط تھا۔ فولادی۔

حبیب کی شادی

حبیب گو بہت ذمہ دار ہو گیا تھا' مگر ہم نے اسے مزید ذمہ دار بنانے کی خاطر اس کی شادی کا پروگرام بنا لیا۔ یوں بھی وہ اٹھائیس انتیس کا ہو چکا تھا۔ شادی کی عمر یوں بھی گزرتی جا رہی تھی۔
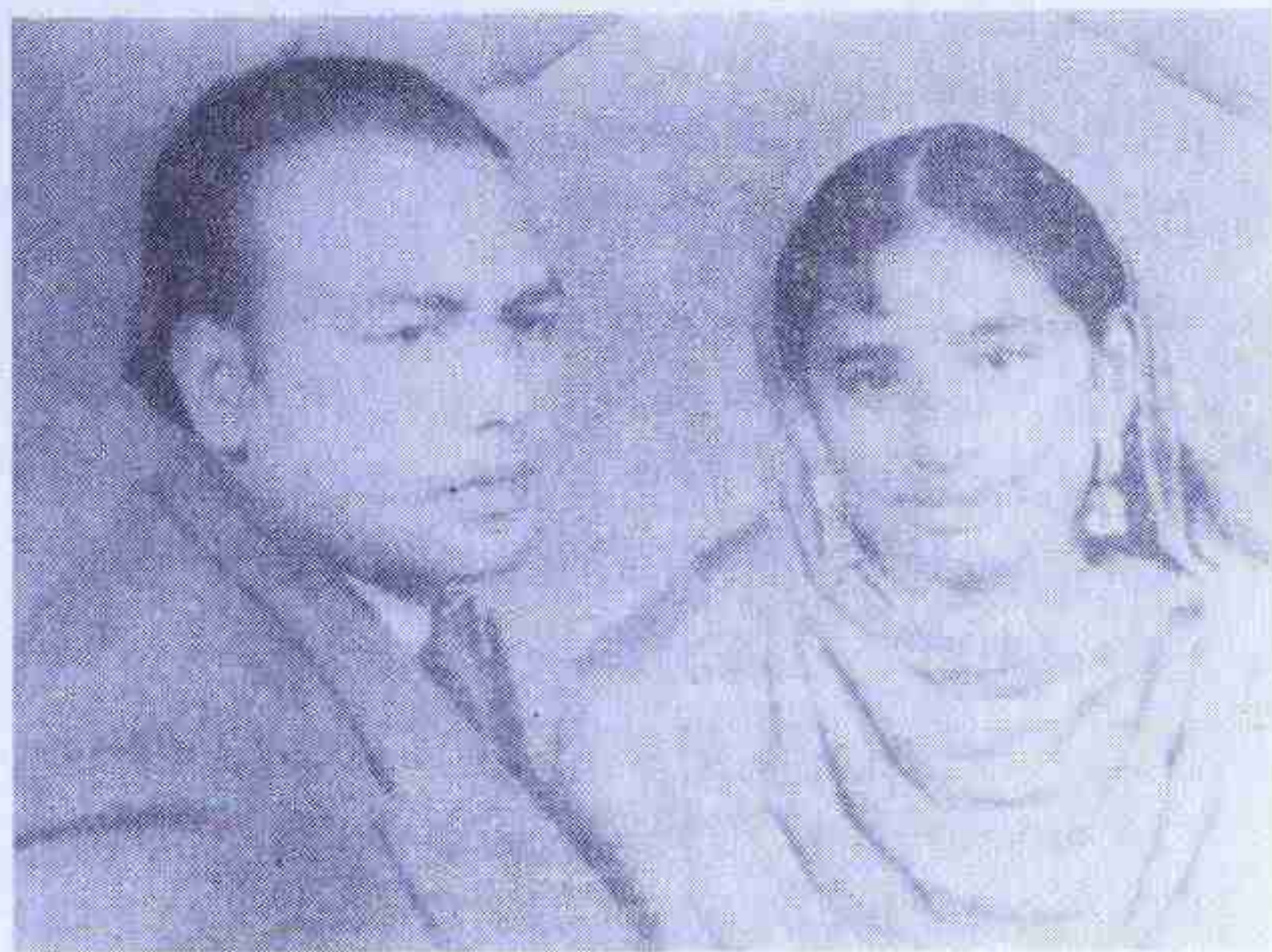
شادی کے ایک ماہ بعد حبیب جالب اور ممتاز بیگم

اپنی شادی کی بات سن کر حبیب غصے میں آگ بگولا ہو گیا۔

اباجی! آپ کیا بات کر رہے ہیں۔ میری جوان بہن ابھی گھر بیٹھی ہے اس کی فکر کریں اس کی شادی کے بارے میں سوچیں۔

حبیب کی بات بہت معقول تھی، مگر میں نے اسے قائل کرنے کے لئے کہا کہ بہو آجائے گی۔ تو رشیدہ کا اکیلا پن بھی دور ہو جائے گا۔ اور وہ میٹرک بھی کر لے گی۔ اس وقت تمہاری شادی ہونا بھی بہت ضروری ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ تمہاری شادی تمہارے چچا مبارک علی کی بیٹی ممتاز سے طے کر دی جائے۔

ہم شادی کا سوچ رہے تھے مگر حبیب کسی صورت رضامند نہیں ہو رہا تھا۔ اب اس نے یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ میں لاابالی قسم کا آدمی ہوں۔ کیوں کسی لڑکی کی زندگی تباہ کرنا چاہتے ہیں۔ میں سیلانی آدمی ہوں، آج یہاں، کل وہاں اور میری زندگی کے مقاصد کچھ اور ہیں۔ لہٰذا آپ لوگ میری شادی کے چکر میں نہ خود پڑیں اور نہ ہی مجھے اس چکر میں ڈالیں۔

لیکن ہم نے اس کی ایک نہ سنی، شادی کے نام سے وہ بھاگ بھاگ جاتا تھا مگر وہ کہاں تک بھاگتا، آخر ہم اسے گھیر کر ملتان لے ہی آئے۔ اور انتہائی سادگی کے ساتھ حبیب کی شادی میری بھتیجی ممتاز بیگم سے ہو گئی۔

رشیدہ کی شادی اور حبیب کا کردار

حبیب کی شادی کے بعد ہم کراچی آ گئے۔ حبیب کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ مگر وہ کسی طرح بھی شادی شدہ نہیں لگتا تھا۔ نہ بیوی سے بات کرتا تھا، بلکہ بہت بے چین رہتا تھا۔ میں اس کی بے چینی کا سبب جانتا تھا آخر اس نے خود ہی مجھ سے کہا کہ رشیدہ کی شادی بہت ضروری ہے۔ مگر ہماری مجبوری یہ تھی کہ ہمارے عزیز رشتہ دار پنجاب کے شہروں میں آباد تھے۔ کراچی میں ہمارا کوئی عزیز رشتہ دار نہیں تھا۔ اسی لئے حبیب نے یہ فیصلہ کیا کہ ہم لاہور شفٹ ہو جائیں۔

یوں ۱۹۵۸ء میں ہم میاں بیوی حبیب ان کی نئی نویلی دلہن ممتاز' رشیدہ اور سعید لاہور شفٹ ہو گئے۔ میرا بیٹا حمید' اس وقت تک نیشنل بینک آف پاکستان میں میرے چھوٹے بھائی اقبال محمد کی معرفت ملازم ہو چکا تھا۔ مشتاق اپنی فیملی اور حمید کے کراچی میں تھے اور ہم باقی افراد خانہ لاہور آ گئے۔ جہاں شہر کی مضافاتی بستی سانده شمس الدین میں ایک کمرے کے مکان میں بیس روپیہ ماہوار کرایہ پر رہنے لگے۔

جلد ہی رشیدہ کے لئے نہایت مناسب رشتہ مل گیا۔ مختار علی بہت لائق بچہ تھا۔ اور بر سرروزگار تھا۔ خدا اس کی عمردراز کرے اور ہر قسم کے شرو شیطان سے بچائے۔

رشیدہ کی بات چیت تو پکی ہو گئی۔ مگر اصل مرحلہ شادی کے اخراجات کا تھا۔ مشتاق کی تنخواہ کم اور اس پر اپنے بال بچوں کی ذمہ داریوں کا بوجھ' حمید بھی معمولی تنخواہ لیتا تھا۔ شادی کے اخراجات پہاڑ نظر آ رہے تھے۔ اور اب یہ ساری بازی حبیب ہی کے کاندھوں پر تھی۔

خدا کے قربان جاؤں وہ ذات واقعی قادر مطلق ہے اور خدا نے حبیب کو ہمارا وسیلہ بنا کر یوں ہماری مدد کی کہ ہم حیران رہ گئے۔ حبیب کو اسی زمانے میں لاہور کی بڑی بڑی فلموں میں گیت لکھنے کا کام مل گیا۔ حبیب نے رائج معاوضہ سے تین گنا طلب کیا۔ تو پروڈیوسروں نے اسے دیا۔ اسی دوران حبیب کی شہرت بحیثیت شاعر ہندوستان تک پہنچ چکی تھی۔ لہٰذا انہی دنوں وہ ہندوستان کے اہم شہروں میں مشاعرے پڑھنے لگا۔ اور بہت ہی فکرمندی کے ساتھ میرے حبیب نے ایک ایک پائی لا کر ہمارے ہاتھ میں رکھی یوں حبیب نے اپنی اکلوتی بہن رشیدہ کی شادی کا فرض ادا کرنے میں بڑا رول ادا کیا۔ مشتاق اور حمید بھی بہن کے فرض کی ادائیگی میں شامل تھے۔ مگر اصل بوجھ حبیب نے اٹھایا۔

ملتان شریف والا مکان اور حبیب

ملتان شریف پیروں' بزرگوں کا شہر ہے۔ ابتدا ہی سے یہ شہر مجھے بہت اچھا لگتا ہے اسی لئے میں نے پاکستان پہنچتے ہی یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ مستقل رہائش ملتان شریف ہی میں رکھوں

گا۔ اور اس مقصد کے لئے میں نے ایک مکان اور ایک دوکان ملتان شریف میں الاٹ کروائی تھی مگر میری فیملی کراچی میں تھی لہٰذا ملتان شریف والا مکان اور دکان میری عدم توجہی کے باعث میرے قبضے سے نکل گئے یوں میری خواہش کہ ہم مستقل رہائش ملتان شریف میں رکھیں گے پوری نہ ہو سکی۔ مگر خدا کی مدد سے ۱۹۶۰ء اور ۱۹۶۳ء کے دوران گل گشت کالونی ملتان شریف میں ایک مکان ساڑھے سات مرلہ زمین پر ڈبل اسٹوری بن کر تیار ہو گیا۔ اس مکان کی تعمیر میں میرے بیٹوں (علاوہ سعید کے) نے حصہ لیا' میری خوش دامن کے ڈھائی ہزار روپے بھی اس میں شامل ہیں مگر زیادہ پیسہ حبیب کا لگا جب کہ پلاٹ کے الاٹمنٹ کی منسوخی کے بعد بحالی بھی حبیب ہی کی وجہ سے ہوئی۔ اس زمانے میں کہ جب یہ مکان زیرِ تعمیر تھا سیمنٹ' سریا کی بہت قلت تھی' یہ بھی حبیب ہی کی کوششوں سے ملا تھا۔

پلاٹ کی منسوخی اور بحالی

میرے بہنوئی بابو شفیع محمد صاحب نے گل گشت کالونی ملتان شریف میں دو پلاٹ ساڑھے سات سات مرلے کے مہاجرین کوٹہ میں الاٹ کرائے۔ ایک میرے نام اور دوسرا اپنے نام پلاٹوں پر مکانات تعمیر کرنے کی ایک میعاد تھی جب یہ پلاٹ اس میعاد کے دوران تعمیر نہ ہو سکے' تو حکومت نے دونوں پلاٹ منسوخ کر دیئے۔ میرے بہنوئی شفیع محمد صاحب نے پلاٹوں کی بحالی کی ہر چند کوشش کی۔ مگر وہ اس میں ناکام رہے۔ میں مورخہ ۹ جنوری ۱۹۶۰ء کو جھنگ سے ملتان پہنچا تو بابو شفیع محمد کی زبانی معلوم ہوا کہ دونوں پلاٹ منسوخ ہو چکے ہیں۔ یہ خبر سن کر میں بڑا رنجیدہ ہوا۔ اگلے روز میں دفتر الاٹمنٹ جو ملتان کچہری میں واقع تھا۔ پہنچا اوورسیئر اور دیگر افسران سے ملا میں نے ان سے کہا کہ مجھے رجسٹر دکھایا جائے۔ لیکن چار گھنٹوں کی تگ و دو کے بعد محکمہ کے افسران نے مجھے کہا کہ اب آپ اپنا وقت یہاں ضائع نہ کریں۔ اور کسی وکیل کے ذریعہ کمشنر ملتان کے نام درخواست جمع کرائیں۔ کیونکہ اب پلاٹوں کی منسوخی کے بعد بحالی کے احکامات وہی جاری کر سکتے ہیں ممکن ہے آپ کے پلاٹ

بحال ہو جائیں۔

میں مایوس و ناکام سا کچہری میں گھوم رہا تھا۔ کہ ایک جگہ میں نے سیاہ کوٹ پہنے وکلاء کا ایک جھمگٹا سا دیکھا میں نے اسی طرف رجوع کیا' تاکہ کسی وکیل سے اپنے مسئلہ کے بارے میں بات کروں۔ میں جب ان وکلاء کے نزدیک پہنچا تو میں حیران و ہکا بکا رہ گیا۔ وکلاء کا یہ جھمگٹا میرے بیٹے حبیب کے گرد لگا ہوا تھا۔ تمام وکلاء حبیب کو گھیرے اس سے گفتگو کر رہے تھے۔

میں آگے بڑھا۔

حبیب نے مجھے دیکھا تو وہ وکلاء کے گھیرے کو توڑتا ہوا میری جانب بڑھا۔

السلام علیکم اباجی' آپ کہاں گھوم رہے ہیں۔

حبیب مجھ سے مخاطب ہوا' تو سارے وکلاء بھی میری طرف متوجہ ہو گئے۔ میں نے اپنا مدعا بیان کیا اور کہا کہ مجھے ایک وکیل کی ضرورت ہے۔ میری بات سن کر حبیب بولا یہ سب وکیل آپ کے بچے ہیں۔ انہیں آپ اپنا مسئلہ بتائیں پھر حبیب تمام وکلاء اور میں کچہری میں واقع ہوٹل میں آبیٹھے میں نے دونوں پلاٹوں کی منسوخی کے بارے میں مفصل بتایا اور ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ اب کمشنر صاحب ہی مذکورہ پلاٹوں کی منسوخی کو بحالی میں تبدیل کر سکتے ہیں۔

میری بات سن کر حبیب بولا موجودہ ڈی سی تو میرے بڑے مہربان دوست ہیں۔ میں ابھی کچھ دیر پہلے انہی کے پاس بیٹھا تھا۔ درخواست بھی لکھ لیں گے۔ پہلے ان سے زبانی بات کر لیتے ہیں۔ یوں حبیب مجھے ڈپٹی کمشنر صاحب کے پاس لے گیا۔ اور انتہائی بے تکلفانہ ان سے بولا۔

جناب مجھے تو فن شاعری سے شغف ہے۔ مگر میرے والد کو فن تعمیر سے دلچسپی ہے۔ ڈی سی صاحب غالباً مختار مسعود تھے بڑی ہی خندہ پیشانی سے ملے اور تمام موجود لوگوں سے توجہ ہٹا کر مجھ سے مخاطب رہے۔

تمام معاملات سمجھ کر ڈپٹی کمشنر صاحب نے اوورسیئر کو بلایا۔ اوورسیئر نے جب مجھے ڈی سی صاحب کے سامنے یوں عزت و وقار کے ساتھ بیٹھے دیکھا تو وہ ڈی سی صاحب سے تھوڑی دیر

کی اجازت لے کر اپنے کمرے میں گیا اور چند ہی منٹ بعد واپس آ کر ڈی سی صاحب سے بولا۔

جناب! آپ کے حکم پر ہم نے منسوخ شدہ پلاٹوں کی جگہ دو نئے پلاٹ انہیں الاٹ کر دیئے ہیں۔

اس طرح ساڑھے سات سات مرلے کے دو پلاٹ' پلاٹ نمبر سی ۵۱۶ میرے نام اور پلاٹ نمبر ۵۱۷۔ سی میرے بہنوئی بابو شفیع محمد کے نام الاٹ کر دیئے گئے' بعد ازاں اسی پلاٹ پر میں نے اپنے بیٹوں کی مالی معاونت کے ساتھ اپنے والد میاں شرف الدین کے نام سے "دارلشرف" نام کا مکان تعمیر کیا۔ جس کی تعمیر میں اغلب حصہ حبیب نے لیا۔

کہاں تو میں بالکل مایوس و ناکام سا کچہری میں گھوم پھر رہا تھا۔ اور کہاں حبیب کی وساطت سے دو پلاٹ دوبارہ الاٹ کر دیئے گئے۔ خداوند کریم حبیب کی عمر دراز فرمائے۔ خدا اولیاء کرام و بزرگان عظام و غوث بہاء الحق کے طفیل جالب کو ہر شر و شیطان سے محفوظ رکھے۔

حبیب اسم بامسمیٰ

اولاد تو ماں باپ کی نظروں میں برابر ہوتی ہے۔ ماں باپ کے لئے سارے ہی بچے ان کی آنکھ کا تارا ہوتے ہیں مگر بعض بچے خود سے ماں باپ کے زیادہ قریب آنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور پھر دیکھنے والوں کو یوں لگتا ہے کہ والدین اس بچے سے زیادہ پیار کرتے ہیں۔ کچھ ایسا ہی حبیب اور ہم والدین کا معاملہ بھی تھا۔ ایک تو یہ بچہ شروع ہی سے اپنے بہن بھائیوں سے مختلف تھا' اور دوسرا اپنے ہونے کا احساس دلانا اس کی جبلت میں شامل تھا۔

حبیب چار پانچ سال کا ہوگا۔ کہ جب میں اسے پیار سے حبیب کی بجائے "ببی" کہتے ہوئے پیار میں کہا کرتا تھا۔

"توں میری ببی اے ناں' میں تینوں پیسے دواں"

یعنی تم میری ببی ہو ناں' میں تمہیں پیسے دوں گا۔ تو میری پیار بھری بات کے جواب کا انتظار کئے بغیر فوراً حبیب مجھ سے پلٹ کر کہتا۔

توں میری ببی اے ناں' میں تینوں پیسے دوں یعنی میری ہی بات مجھے لوٹا دیتا کہ تم میری ببی ہو' ناں میں تم کو پیسے دوں گا۔

یہ تھا چار پانچ سال کے حبیب جالب کی سوچ کا انداز کہ وہ پیسے لینے کی نہیں دینے کی بات کرتا تھا۔ خدمت لینے کی نہیں خدمت کرنے کی بات سوچتا تھا کم سنی ہی میں میرا حبیب عملی زندگی میں داخل ہوگیا تھا کہ جب وہ چوتھی جماعت میں پڑھ رہا تھا۔ اور وہ اپنی نابینا نانی مائی گوماں (غلام فاطمہ) کے ساتھ گاؤں گاؤں ازار بند اور پراندے (چٹلے) گھوم پھر کر بیچا کرتا تھا۔ گاؤں سے پرائمری پاس کر کے جب حبیب دلی آیا تو یہ ۴۰-۱۹۳۹ء کا زمانہ تھا۔ اس وقت دوسری جنگ عظیم جاری تھی۔ اس زمانے میں حبیب فوجی بیرکوں میں جا کر دوسرے بچوں کی طرح چنے کی تھیلیاں بھرنے کا کام کرتا۔ سو تھیلی بھرنے کا معاوضہ بارہ آنے ملتا تھا۔ حبیب فوجیوں کو علامہ اقبال' مولانا ظفر علی خان اور دیگر اساتذہ کا کلام بھی ترنم میں سناتا اور چنے کی تھیلیاں بھی بھرتا۔ اس طرح میرا حبیب حقیقتاً بچپن ہی سے ہمارا حبیب بن چکا تھا۔ پھر اپنی اکلوتی بہن رشیدہ کی شادی کی اسی فیصد ذمہ داریاں حبیب نے تن تنہا پوری کیں۔ اپنے سب سے چھوٹے بھائی سعید کی تعلیمی ذمہ داریوں کو بھی پورا کیا سعید نے میٹرک حبیب کے پاس لاہور میں رہ کر کیا اسے ملازمت بھی حبیب نے دلوائی۔

مشتاق مبارک کے آخری ایام کا ساتھی حبیب

اپنے بڑے بھائی مشتاق کی تجہیز و تکفین اور اس کی زندگی کے آخری ایام بھی حبیب ہی کے حصے میں آئے۔ مشتاق کی وفات ۲۹ جولائی ۱۹۶۹ء کے دن ہوئی۔ وفات سے دس بارہ روز پہلے مشتاق لاہور' اپنے بھائی حبیب کے پاس آگیا تھا۔ اس کی حالت بہت خراب ہو چکی تھی۔ میرے بیٹے عبدالحمید خان کی شادی ۱۲ جولائی ۱۹۶۹ء کے دن ملتان میں ہوئی۔ ڈاکٹروں

کے منع کرنے کے باوجود مشتاق کراچی سے ملتان بغرض شرکت شادی آگیا تھا۔ ملتان میں شدید گرمی' ڈاکٹروں نے اسے دیکھا تو بتایا کہ ان کے اندر کچھ نہیں رہا۔ شوگر نے تباہی مچادی ہے بس اب چند دن کا یہ مہمان ہے اور وہی ہوا جو ڈاکٹروں نے کہا تھا۔ مشتاق بھائی کی شادی میں شریک ہوا اس کا سہرا شادی کی تقریب میں پڑھا۔ شادی کی تقریبات سے فارغ ہو کر مشتاق ہمراہ اپنی بیگم مبارک سلطانہ کے فیصل آباد چلا گیا۔ وہاں سے لاہور اپنے چھوٹے بھائی حبیب کے پاس پہنچ گیا۔ دو ایک دن بعد اس کی بیگم کراچی چلی گئی۔ ہم دونوں میاں بیوی ملتان ہی میں تھے۔ حبیب نے بیمار بھائی کو میو ہسپتال میں داخل کروادیا دوستوں کے جھرمٹ میں بھرپور زندگی گزارنے والے مشتاق کے آخری چند روز میو ہسپتال کے جنرل وارڈ میں تنہا گزرے حبیب اپنے بھائی کے دوا دارو کے لئے پیسوں کی جستجو میں بھی رہتا اور اس کو دیکھنے ہسپتال بھی جاتا۔ مگر ۲۹ جولائی ۱۹۶۹ء کو جب حبیب ہسپتال پہنچا تو بھائی کا بستر خالی پڑا تھا۔ مشتاق اس دنیا فانی سے کوچ کر چکا تھا۔ اس کا جنازہ حبیب کے گھر واقع مقیت منزل چوک سنت نگر لاہور سے اٹھایا گیا۔ اور کرشن نگر کے قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔ مشتاق بہت اچھا شاعر تھا۔ اپنے بارے میں خود اس کا تجزیہ یوں تھا۔

دوستوں کی ستم ظریفی کو
ہم فقط اپنی سادگی سمجھے
دوست میرے خلوص کو اکثر
میرا احساس کمتری سمجھے

بے دام بک جانے والا انمول حبیب جالب

حبیب بڑا باادب بچہ ہے۔ اس کی ماں آج بھی کبھی غصے میں آجائے۔ تو اس کی پٹائی کردیتی ہے۔ خدا اسے ہر شر سے محفوظ رکھے۔ اس وقت حبیب جالب ایک بڑا نام ہے۔ ایوب خان اور نواب امیر محمد خان آف کالا باغ جیسے حکمران اس کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکے۔ وہ

خدا کی طرف سے انمول پیدا کیا گیا ہے۔ اس کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ مگر عوام کے لئے وہ بے دام بکتا ہے۔ اقبال کا مومن حبیب کی صورت ڈھل کر مجسم سامنے آگیا ہے۔

ہو حلقہ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

بس اس کی ایک بات سے مجھے دکھ پہنچتا ہے اور میں دن رات اس کے لئے دعا کرتا رہتا ہوں۔ وہ جو مرزا غالب نے کہا ہے۔

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

اکثر میرے ملنے جلنے والے، مجھ سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ماشاء اللہ آپ کا بیٹا حبیب بڑا شیردل ہے حق گوئی و بے باکی میں اس کا کوئی ثانی نہیں اور اسی طرح کی دوسری تعریف و توصیف کی باتیں میں یہ سب کچھ سن کر بہت خوش ہوتا ہوں۔ اور پھر بڑی تیزی کے ساتھ ماضی کے واقعات میری نظروں میں گھوم جاتے ہیں۔ ہمارے مورث اعلیٰ بابا خیر الدین، بابا حسین شاہ، نوشاہی بزرگ پیر امام الدین، بابا میرے شاہ، میرے والد میاں جی شرف الدین، میری والدہ عمر بی بی، مولوی غلام رسول عالم پوری، اور بابا دولے شاہ صاحب اور میری اہلیہ رابعہ بصری کا تعلیم کی طرف اپنے بچوں کو راغب کرنا اور دلی شہر۔

ابن الوقت لوگ

بعض ایسے لوگ بھی مجھ سے ملتے ہیں، جو کہتے ہیں کہ حبیب جالب کو سیاست نے کیا دیا، یہ تو جاگیرداروں وڈیروں اور خانوں، سرداروں کا کھیل ہے، کوئی کہتا ہے کہ سیاست دان مطلب پرست لوگ ہوتے ہیں اور حبیب جالب بھوکے غریب لوگوں کی پارٹی سے منسلک ہے (نیشنل عوامی پارٹی) اگر یہ حکومتوں سے مل کر رہتا۔ تو بڑے اعزاز و اکرام سے نوازا جاتا۔ آپ اپنے بیٹے کو سمجھاؤ کہ یہ حکومتوں کے خلاف نہ بولا کرے۔ خاموش رہے اپنے خیالات

بدل دے خواہ مخواہ قید و بند کی صعوبتیں اٹھاتا ہے۔ اس کو ان لیڈروں سے کیا ملے گا۔ کل کو وہ تو وزیر بن جائیں گے۔ اسے کیا ملے گا۔

میں ان کم نظر لوگوں کی باتیں بھی سن لیتا ہوں یقیناً یہ ناسمجھ ہیں۔ ابن الوقت قسم کے لوگ سچائی سے بہت دور۔

مگر میں ان معززین سے یہی کہوں گا کہ میرے حبیب کو خدا نے دردمند دل عطا کیا ہے۔ خدا اس کی عمر دراز کرے یہ کسی بھی قیمت پر خریدا نہیں جاسکتا۔ یہ وہ انمول موتی ہے جسے خدا نے اپنی رحمت کے خزانے سے دنیا کو عطا کیا ہے۔ یہ غریبوں، مزدوروں، ہاریوں، کسانوں کا حبیب ہے، اور یہ ان کی حمایت کرتا رہے گا۔ کرتا رہے گا۔ کرتا رہے گا۔ اس کا مقصد حیات حق گوئی و حق پرستی ہے۔ اور وہ کہتا ہے۔

مرے ہاتھ میں قلم ہے، مرے ذہن میں اجالا
مجھے کیا دبا سکے گا، کوئی ظلمتوں کا پالا
مجھے فکر امن عالم، تجھے اپنی ذات کا غم
میں طلوع ہو رہا ہوں، تو غروب ہونے والا

والد محترم کی تحریر کے عکس پر مشتمل چند صفحات

دوآبہ بہشت کا ٹکڑا ہے

ہمارا آبائی وطن میانی افغاناں ضلع ہوشیارپور پنجاب جوکہ
ساحل دریائے بیاس واقع ہے۔ میانی افغاناں میں بکثرت
مہمند پٹھانوں کی بستی تھی۔ یہ بادشاہ لوگ اور خاندانی لوگ تھے
پٹھان قوم بہادر اور مردِ میدان مانے ہوئے ہیں۔ یہ حقیقتاً
عرب سے ہجرت کر کے کابل قندھار غزنی ہند سندھ بلوچستان
کے مختلف علاقوں میں آباد ہو گئے۔ یہ قبیلہ قریش سے
تعلق رکھتے تھے۔ مورخین انہیں بنی اسرائیلی بھی لکھتے
ہیں۔ انگریزوں کے زمانے میں فوجی خدمات کے عوض
جاگیریں اور منصب عطا ہوئے تو میانی کو اپنا وطن بنا کر آباد
ہو گئے۔ میانی یا میادھی کے دریائے بیاس کے کنارے
ملاحوں کی چند بستیاں آباد تھیں یہ لوگ مچھیرے یا ماہی گیر
کہلاتے تھے یہ پرانے اصلی باشندے ہی تھے۔ جب پٹھانوں

کا تسلط ہو گیا تو میانی افغاناں کے نام سے یہ قصبہ
مشہور ہو گیا - میانی افغاناں کی آبادی تقریباً ۶ ہزار
کے لگ بھگ تھی جہاں میونسپل کمیٹی مڈل سکول
ہسپتال پولیس چوکی بھی تھی - یہ عروج اور رونقیں
ان زندہ دل پٹھانوں کے دم قدم سے تھیں ...

میانی افغاناں دریائے بیاس کا خوبصورت منظر، بڑے بڑے کھیت
یہ باغوں اور مرغزاروں کا علاقہ جہاں کوئل کوکتی اور
مور ناچتے تھے - جہاں ندیاں نالے جسے دوآبہ بشت
کا ملکہ بھی کہتے تھے - جہاں حبیب جالب نے جنم
لیا - یہ مولوی غلام رسول عالمپوری کا وطن یہ
شعرائے کرام کا دیس جہاں نامور موسیقار بھی تھے

اس دیس کا رنگ انوکھا تھا
اس دیس کی شان نرالی تھی

میانی افغاناں میں بہت رونقیں اور کئی دلچسپیوں کے بھی
سامان تھے - یہ ایک واقعہ ہے کہ گرمیوں کی رات
سے دریائے بیاس یا اس ہی بہہ رہا ہے جس کے پانی کو
چاٹ کر ٹھنڈی اور فرحت بخش ہوا کے جھونکے

آرہے ہیں جنکی خنکی سے دل و دماغ تازہ ہو رہے

ہیں - کبھی کبھی بہار قمقمے فن کا رسا زندگی نواز

میاں نبی بخش عرف ننھے خاں جب اپنے بالاخانے

پر بیٹھکر رات کے سمے سارنگی پر پہاڑی بجاتے تو

جنکی دردبھری آواز سے ٹھنڈی گھٹاؤں کا

کا منظر سامنے آجاتا جسکی گونج سے لوگ گلیوں

میں کھڑے ہوکر سنتے اور لطف اٹھاتے - اسکے علاوہ ایک

منگارہ مائی ولدیت طوائف جسکی آواز میں جادو تھا اور

اسکے گلے میں قدرتی لطافت تھی وہ بھی جب کبھی رات کے

وقت جوگ یا ملکگرہ گاتی تو سننے والوں کو مسحور کر دیتی

وہ شب بیدار اور اللہ والی بھی تھی پابند صوم و صلوات تھی

خدا انکو غریق رحمت کرے میں اچانک رات کا چاند

حسب احمد غالب صاحب کی تاریخ پیدائش تو مینے لکھی نہیں ہے

لیکن انکو اتنی سی یاد ہے تقریباً ۱۹۲۸ء کو یہ کہ پیدا ہوا تھا وہ عید الفطر

کا دن تھا یعنی عید سعید کو پیدا ہونے والا بچہ جسکے کانوں میں

نعرہ تکبیر اور نعرہ رسالت

کے فلک شگاف نعرے بلند ہوتے سنے تھے - اور ملک ہندوستان میں

آزادی کی دلیس کا جذبہ تھا - ہندو مسلم اتحاد کا زمانہ تھا لیڈران

قوم کو ملک و ملت کا درد تھا۔ ہمارے میاں افغاناں میں
ہر مذہبی تہوار بڑے ذوق و شوق سے منایا جاتا تھا ہولی
دیوالی عیدین ہندو مسلم سب مل جل کر مناتے تھے خاص کر
رمضان کا مہینہ جس میں ایک نوجوان ٹولی قصبے کی گلی کوچوں
میں سحری کو نعتیں پڑھتے گشت کرتے لوگوں کو جگاتے
یہ رحمتوں کا مہینہ بڑی رونق سے گذرتا جب عید آتی تو
ایک میاں قصبہ میاں محمد رضا صاحب کے دیوان خانے میں جمع ہو کر
جلوس کی شکل میں نماز عید پڑھنے جاتے جلوس کی قیادت میاں
محمد رضا صاحب کرتے ہمراہ جلوس نعت خوانی ہوتی نعرہ
تکبیر کے فلک شگاف نعرے بلند کئے جاتے .... (باقی)

اس نوجوان نعت خوان ٹولی کے لیڈر ماسٹر محمد الدین رحمانی
ہوتے تھے۔ میاں افغاناں میں یہ بھی ایک مشہور شخصیت تھے
انکی دوکان بازار میں بارونق جگہ تھی یہ درزی کا کام کرتے
تھے۔ انکی دوکان پر قصبے کے چھوٹے بڑے اعلیٰ ادنیٰ ہر طبقے
کے اور ہر مذاق کے آدمی بیٹھتے تھے۔ ماسٹر محمد الدین ملنسار
خوش اخلاق آدمی تھے انکی خوش گفتگو سے ہر ایک متاثر تھا
ماسٹر محمد الدین کے اندر ایک کشش تھی اللہ جاذبیت تھی
دوسرے کو فوراً رام کر لیتا تھا انکی دوکان پر دو چار
شاگرد کام سیکھنے ہمیشہ رہتے تھے کنوارے مجرد آدمی تھا

اُن شاگردوں کو یہ حقیقی بچوں کی طرح جانتا تھا یہ زندہ
دل آدمی تھا اسکی دکان ہر دن رات رونق لگی رہتی تھی
رمضان المبارک میں محمد الدین دودھ دہی کی دوکان
کر لیتا تھا۔ سحری کے وقت دودھ دہی بنا کے اچھا دیتا
تھا۔ اسلئے یہ گروہ میں بھی مقبول تھا ناشتہ۔ تین
بچوں کو جگا کر کنٹینی ہے محمد الدین قصائی کی دوکان
سے جلدی دھی اپنی ٹوکری جائے گا رمضان المبارک میں ماسٹر
محمد الدین کی ذمہ داریاں بہت بڑھ جاتی تھیں محمد الدین کی
دکان متصل جامع مسجد ہوتی دوکان کی تیسری منزل پر نقارہ
رکھا ہوتا تھا جسکو سحری اور افطاری کے علاوہ جھڑک کا ختم
زیادہ بجانا اسکی اہم ذمہ داری ہوتی تھی راستے ایک بجے
لوگوں کو گروہوں نے جگا کر قصبہ کی گلی کوچوں میں سحری کے وقت
نقارہ کے سنبھال اسکی ذمہ داری ہوتی تھی۔ تراویح کے وقت بھی
نقارہ بجایا جاتا تھا یعنی ماہ رمضان میں یہ ایک کام کئے
ہمہ وقت مصروف رہتا۔ دور دور روزہ داروں کے لئے جھوٹا کام
بھی ہوتا تھا مثلاً بعض ایسے روزہ دار حقے کے شائقین اس پر
اعتراض کرتے رہتے تھے کہ یہ بہت جلدی سحری کے وقت بند کرنے
کا نقارہ بجاتا ہے۔ بعض ایسے روزے دار بھی تھے جو اس کے
نقارہ بجانے کی پرواہ نہیں کرتے تھے اٹھ جاتے ماسٹر جی سحری

معاملات کے سلجھانے یا الجھانے میں ساتھ جھگڑا رہتا تھا
یہ رنگیلا آدمی جب عید آتی تو سر شام چار سو تر بیٹھ کر چاند
کا انتظار کرتا۔ جب چاند نظر آ جاتا تو چاند دیکھتے ہی
خوب زور زور سے نقارہ بجاتا۔ عید کے چاند کا اعلان
کرتا اس کے شاگرد نعت خوان نعرۂ تکبیر نعرۂ رسالت ﷺ
بلند کرتے ہوئے گشت کرتے یہ چاند رات روزے داروں
کی خوشی کی رات جاگ کر گزرتی صبح دم یہ محمد الدین
نئے کپڑے پہنے ہوئے جلوس کی شان بڑھاتا
ہمراہ جلوس جاتا
اللہ اسے غریق رحمت کرے
پھولا نہ سماتا۔ خوشیاں مناتا۔ ایک دفعہ دلی سے
فتویٰ آ گیا کہ امسال عید کا چاند ۲۹ تاریخ کا ہوگا
محمد الدین نے وفور خوشی میں دن ہوتے [illegible] لے کے شام
کو ہی نقارے پر چوٹ لگا دی عام لوگوں نے نقارہ سنتے
ہی روزے افطار کر دیئے۔ جب یہ خبر میاں محمد اکبر خان کے
کے دیوان خانے [illegible] پہنچی تو فوراً ماسٹر محمد الدین کو بلا لیا
پوچھا کہ تم نے یہ کیا ظلم کیا جو روزے داروں کے روزے ضائع
کروا دیئے۔ تمہاری کیا سزا ہے۔ تو عبدالواحد خان نے
بھی زور لگا دی تھی کہ اسکو سزا دینا تو [illegible] کے لیے
پہلے [illegible] اس مسئلے پر غور کر لو کہ جن روزے داروں کے روزے
جاتے رہے ہیں وہ کفارہ دیں گے۔ دونوں وکیلوں [illegible] نے

بہرحال روزے پورے دوبارہ رکھے محمد الدین کو ثواب یا
عذاب خدا کے سپرد یہ مسئلہ باز رکھے اور بقول
عبدالواحد خان - سب کو پھریاں ششکستان میں

(باقی)

حسب دستور ایک چاند رات کا ذکر ہے عید کا چاند
نظر آ گیا اعلان عید کیلئے ماسٹر محمد الدین نے نقارے
پر چوٹ لگا کر روزے دار مچا ہوئی کہ عید سعید کی
خوشی میں سرشار کر دیا نعرہ تکبیر گونجی تو سے چلے

بارہ بجے نقارے تو بجے کیونکہ صبح عید تھی اہل
اسلام عید کی خوشی میں ساری رات جاگتے ہیں کوئی
عید کی خوشی میں کوئی عید خرید و فروخت میں اور کوئی عبادت
و ریاضت میں چاند رات جاگنے کی رات ہوتی ہے
ایک چاند رات ہم نے بھی جاگ کر گزاری تھی - کیونکہ میری
اہلیہ کی طبیعت کچھ ناساز تھی کہ صبح سوا آٹھ بجے میاں
کے دیوان خانے میں نماز عید کا اعلان ہو چکا تھا لوگ
جمع ہو رہے تھے جلوس کی تیاری ہو رہی تھی میرے میاں محمد اکبر
خان سے مراسم اچھے تھے انہوں نے میری غیر حاضری کو محسوس
کیا - لیکن مجبوراً میں شامل جلوس نہ ہو سکا - جلوس دیوان
خانے سے نکل کر پولیس چوکی پر پہنچا ہو گا میں صحن میں بیٹھا

پردۂ غیب میں منتظر تھا۔ اسی اثناء میں کسی نے اندر سے
آکر مجھے مبارکباد بھی دی کہ بفضلِ خدا آپکے گھر بچہ
پیدا ہوا ہے۔ یہ خوشخبری سنکر میں دوڑ کر شامل جلوس
ہو گیا۔ عید پڑھی بارگاہِ الٰہی میں سجدۂ شکر ادا کیا۔ وہ
مبارک عید سعید تھی جس عید سعید کو خدا کی رحمت سے
میرے گھر میں شیر دل بیٹے حبیب احمد طالب نے جنم لیا
حقیقتاً یہ چاند رات کا چاند ہے خدا اسکی عمر دراز کرے
آمین

۲۰ اپریل ۶۵ء

وصیت نامہ

باعث تحریر آنکہ جو کہ ایک مکان ڈبل سٹوری 516 بی بلاک C
واقع گلگشت کالونی ملتان جسکی تعمیر ۱۹۶۵ء میں مکمل
ہوئی ہے ساتھ میرے قطعہ زمین میرے نام الاٹ تھی میری بیوی کی
والدہ نے اپنا کلیم فروخت کرکے 2800 روپے نقد وصول کرکے
1900× انیس سو روپیہ میری بیوی کو اسکی حق الخدمت کے بخشش کیلئے تھے یہ رقم
اور اسکے علاوہ مجھے اپنے بھائیوں سے کلیم کے حصے میں کچھ رقم ملی تھی
یہ تقریباً ساڑھے تین ہزار روپے کے لگ بھگ برائے تعمیر مکان خرچ ہوئے تھے

میری ساس نابینا تھی اور بیوہ تھی کئی برسوں سے ہمارے ہمراہ رہتی تھی
اس کا ہر طرح کا اخراجات ہمارے ذمے تھا۔ بعوارضِ ... بیگم
جس کا انتقال ۱۹۸۱ء میں کراچی میں ہمارے ہی یہاں چلی۔ تدفین و تکفین
کرکے ہم لوگ سبکدوش ہو گئے وہ محترمہ مرحومہ ہم سے خوش خوش خدا سے
جا ملی خداوند کریم اسے جنت نصیب فرمائے آمین

مکان کی تعمیر پر میرا ذاتی سرمایہ صرف ہوا جاں نثار احمد کا خرچ ہوا باقی میرے
تین بیٹوں نے تعمیر مکان پر خرچ کیا۔ سب سے زیادہ حبیب خان نے
تعمیر مکان پر خرچ کیا مکان کی تعمیر میں اپنی نگرانی میں ہم نے ایک
ڈبل سٹوری بنوانے کے لیے میرے بڑے بیٹے مشتاق حسین نے فنانس
کارپوریشن سے سولہ ہزار روپیہ نام قرضہ لیکر پانچ ہزار خود خرچ 16000 5000
کر دیا اسلئے انصاف یہی ہے کہ تعمیر مکان میں مسٹر مشتاق حسین نے وقتاً
فوقتاً جو بھی رقم [illegible] دی تھی وہ مبلغ پانچ ہزار روپے لیکر حساب
بے باک کر دیا مشتاق حسین مرحوم نے اس مکان مذکور کے حصے لینے
سے بھی انکار کر دیا تھا۔ اب اس مکان مذکور کا جو سولہ ہزار قرضہ ہے 16000
جس کی ماہوار قسط ۱۳۸-۶۳ روپے ذمہ ہے قسطاً ادا ہوتی ہے
~~[illegible]~~
میں ادا کرتے ~~[illegible]~~ اب سب سے چھوٹا سعید بھی برسرِ روزگار ہے ~~[illegible]~~
قسط قرضہ ~~[illegible]~~ اور ہم لوگ ضعیف والدین کی ہر طرح کی
خدمت بھی ان تینوں جیسے احمد خان و عبدالحمید خان و سعید احمد خان
کے ذمہ ہے۔ لہٰذا میں بخوشی و خواہش ان تینوں بیٹوں سے خوش

ہوں کہ ان تینوں بیٹوں کے نام وصیت کرتا ہوں کہ میری زندگی
کے بعد یہ مکان نمبر B-5/6 ملکیت ان کی ہے یہی مالک و مختار ہیں اور
یہ وصیت نامہ تحریر کرتا ہوں کہ بشرطیکہ ضرورت [illegible] ایک
ضروری خیال ہے کہ جیب جالب نے مکان مذکور پر زیادہ خرچ کیا لہٰذا
چھوٹے بھائیوں کو اپنے سے ترجیح ضرور دیں مورخہ ۲۰ اپریل ۱۹۶۵ء

بقلم خود صوفی عنایت اللہ
۳۵/۳ جٹ لائن کراچی
حال مقیم B-117-N نارتھ ناظم آباد کراچی

نوٹ:۔ اور والد صاحب کی زندگی ہی میں ہم بہن بھائیوں نے مکان جالب بھائی کے نام کر دیا، جسے فروخت کر کے بھائی صاحب نے سرو یا گارڈن لاہور والا مکان خریدا۔

❋

مشہور درویش تذکرہ حضرت سید محمد دیوان شاہ صاحب صابری چشتی رحمتہ اللہ

ہمارے علاقہ پنجاب ضلع ہوشیارپور و ضلع گورداسپور میں مختلف جگہ پر چار دیوان ہوئے ہیں۔

پنجاب کے چار دیوان

دیوان کے معنے بلند مقام کے ہیں یعنی کرسی وزارت یہ خطاب خدا کی طرف سے باطنی ہے۔ ظاہری خطاب ہر ملک میں بادشاہ اپنے خاص منظور نظر باشعور بندوں کو منصب عطا کرتا ہے دیوان ایک بڑا بھاری اور اونچا عہدہ ہے خدا جسے چاہے نوازے

① حضرت سید شاہ بدر دیوان رح (پہلے دیوان) میانیاں شریف ضلع گورداسپور

② حضرت سید شاہ لال دیوان گڑھی افغاناں ضلع گورداسپور

③ حضرت سید غازی دیوان ماڑی بچیاں " "

④ حضرت سید محمد دیوان شاہ صابری رح محلہ تیرن ضلع ہوشیارپور
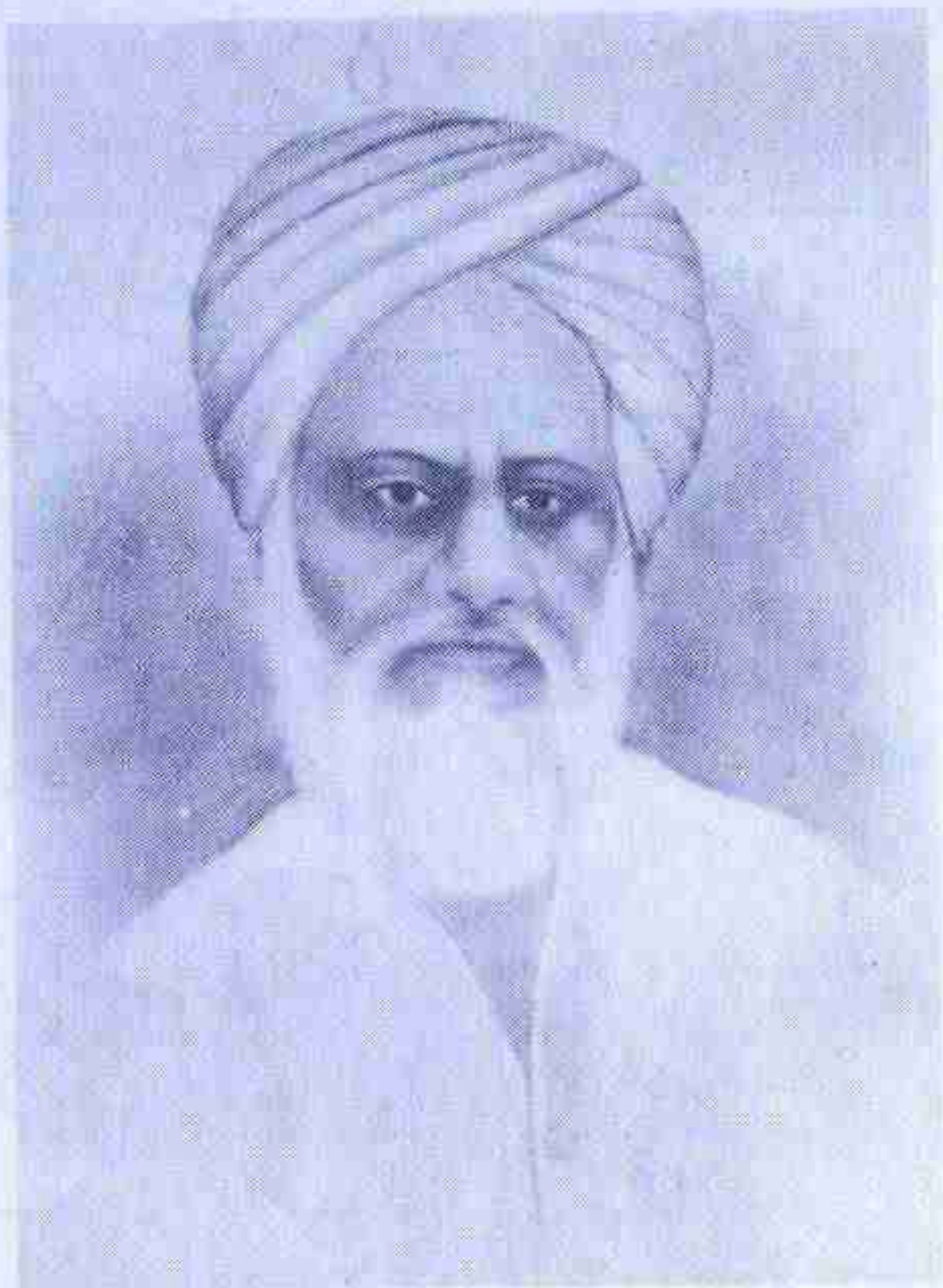
حضرت بابا دیوان شاہؒ صاحب

حضرت پیر محمد دیوان شاہ صابری
چشتی تھلے شریف ضلع ہوشیار پور

آپکی پیدائش تقریباً ۱۸۵۵ء قصبہ کا ٹھعان دوسو ہے پنجاب میں ہوئی ہے۔ حضرت محمد دیوان شاہ صابری چشتی رحمۃ اللہ کے والدین ہندو سنار تھے سبحان اللہ جب حضرت نے ہندو مذہب میں جنم لیا ہوگا تو آپکے والدین کو اپنے نور نظر کی پیدائش کی بے حد خوشی ہوئی ہوگی۔ آپ اپنے والدین کی خوشیوں کا باعث بنے آپکے والدین اس اپنے چشم و چراغ کے پیدا ہونے میں کتنے شاد ہوئے۔ پر والدین کو بچے کی پیدائش کی خوشی ہوتی ہے۔ انکو کیا خبر تھی کہ یہی ہمارا ہونہار فرزند ارجمند جو کہ ہوش سنبھالتے ہی کہ دین کل ختم رسل جناب محمد رسول مقبول صلے اللہ وسلم کے سچے عشق میں سرشار ہو کر مسلمان ہو جائیگا کسے خبر تھی کہ یہ عشق رسول کو مشعل راہ بنا کر اپنے آبائی ہندو مذہب کے اندھیرے سے نکلکر

سبھی مذہب اسلام کے ادیان میں فتح پائے گا

اور دین محمدی میں منسلک ہوکر عاشق رسول کہلائے گا
دین اسلام کی روشنی سے اپنے دل کو منوّر کرے گا
جو کہ چشتیہ عالیہ کے گروہ میں منسلک ہوکر اپنی نیکی و پاکیزگی
کا نمونہ دنیا میں پیش کرے گا
خدا کی قدرت کا یہ جیتا جاگتا کرشمہ ہے۔ اسے کہتے ہیں
کفر میں اسلام کا ظہور (پڑھئے جس پر نظر پڑی سب مولا کر دیا)
یہ خاص نمایاں بات ہے۔ جبکہ حضرت محمد دیوان شاہ صاحب رحمۃ
مذہب اسلام میں داخل ہو گئے تھے تو اس زمانے شباب میں
جہاں جہاں کبھی عرس ہوتے تو حضرت بڑے ذوق و شوق
سے محفل سماع میں جاتے اسلام کا والہانہ شوق تھا
جہاں کبھی عرس ہوتا آپ پہلی رات کو محفل میلاد منعقد
کرتے خود ذوق و شوق سے نعت خوانی کرتے اور محفل کو
نور و سرور کر دیتے آپکو نعت رسول پڑھنے کا عشق تھا
آپ ہر مجلس میں بلا روک ٹوک بڑی خوش الحانی سے
نعت رسول مقبول پڑھتے آپکو حضور پر نور ؐ سے

سچا عشق تھا آپ نے دین اسلام کو سچا اور مکمل
دین سمجھ کر قرآن کی روشنی میں آیاتِ قرآنی پر
عمل کیا (قرآن المائدہ)

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ
نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا

فرمایا خدا نے اے نبی آج سے میں نے تمہارے لئے
دین اسلام کو مکمل اور اکمل فرما دیا اور تم پر
نعمت پوری کر دی جتنے بھی انعامات تھے خداوند
قدوس نے سب حضور پر نور سید الانبیاء کو تفویض
فرما کر آپ کیلئے دین اسلام پسند کیا
حضرت محمد دیوان شاہ نے بھی اسی دین اسلام کو پسند
کیا پھر حضرت کی یہ حالت ہو گئی کہ آپکو دنیا اور دنیا
کے جھمیلوں سے بھی نفرت ہو گئی آپکو فقیروں
کے جھونپڑوں میں خدا نظر آنے لگا۔ نتیجہ یہ ہوا
آپ دنیا سے الگ ہو کر اللہ والوں کی محفلوں
کو پسند کرنے لگے تھے مگر دنیا والے مرتے [illegible]

جج ہدایت رئیس اعظمؒ ان کی طرف جھکنے لگے
لیکن آپکو ابھی کسی مرد حق مرشد کی تلاش تھی
آپ اس ابتی لگن میں دنیا والوں سے متنفر تھے

آپ اسی والہانہ شوق میں حضرت سید میر حسین علی شاہ رحمتہ اللہ
کی خدمت میں بھی کچھ عرصہ رہے۔ حضرت سید میر
حسین علیؒ کا بھی اُن دنوں ستارہ عروج پر تھا
پنجاب بھر میں آپکے لوگ پرستار تھے اور فیض
یاب تھے۔ حضرت شاہ صاحبؒ سے بھی آپ نے فیض حاصل کیا
حضرت سید حسین علی شاہ صاحبؒ نے بھی اپنی صحبت سے محمد دیوان
شاہ صاحبؒ کو سرفراز فرمایا
ایک روایت ہے کہ حضرت محمد دیوان شاہ صاحبؒ نے رحیم شاہ صاحبؒ
سے بیعت ہونے کی آرزو کی مگر جناب سید میر حسین علی شاہ صاحبؒ
نے حضرت محمد دیوان شاہ صاحبؒ کو فرمایا کہ آپکے مقام کی
تکمیل دوسری جگہ سے ہوگی۔ البتہ شاہ صاحب رحمتہ اللہ نے حضرت شاہؒ
کو اُن کی بھی حضرت شاہ قطب رحمتہ اللہ کے مزار پر جانے کا حکم
کیا تھا۔ حضرت میر محمد دیوان شاہ صاحب رح حضرت شاہ صاحبؒ
کے حکم سے روزانہ الصبح شاہ قطبؒ کے مزار پر جاکر مراقبہ کرتے تھے

اس راز کو وہ اللہ والے بزرگ ہی جانتے تھے کہ شاہ صاحب رحمۃ اللہ
نے حضرت محمد دیوان شاہ صاحب رح کو کیا وظیفہ بتایا تھا بہرحال
یہ ایک مصدقہ بات ہے کہ حضرت پیر سید حسین علی شاہ رح
کے حکم سے حضرت محمد دیوان شاہ صاحب رحمتہ اللہ ننگے پاؤں
پیر حسین علی شاہ صاحب رحمتہ اللہ کے آستانے سے اچی لبی شاہ قطب رح
کے دربار پر بڑے ذوق و شوق سے
تین میل روزانہ جاتے مراقبہ میں بیٹھ کر حسب ارشاد وظیفہ
کرتے رہتے تھے۔ جب وظیفہ ختم ہو جاتا پھر حضور پیر
محمد دیوان شاہ صاحب رح اُسی طرح ننگے پاؤں واپس حضرت شاہ
صاحب رح کے دولت خانے پر تشریف لے آتے تھے
سنا ہے کہ یہ چلہ آپ رح نے چالیس یوم کیا تھا یہ مجاہدہ
کرنے کے بعد آپ رح کو دین و دنیا کے سربستہ راز کا انکشاف
ہو گیا آپ صاحب ولایت ولی بن گئے۔ روایت ہے کہ
یہ مقام درجہ آپ کو ان دنوں حاصل ہو گیا تھا جبکہ آپ کو
عام لوگ ایک معمولی درویش سمجھتے تھے سبحان اللہ
یہ بڑے دل گردہ کی بات ہے روزانہ تین میل جانا
اور قطب زمان کے آستانے پر جا کر بموجب ارشاد

وظیفہ کرتا ہے اپنے نفس کو بڑا جہاد ہے

ولایت کے درجے تک پہنچنے کیلئے بڑی بڑی کٹھن منزلیں

طے کرنا پڑتی ہیں۔ حضور پیر محمد دیوان شاہ صاحب رحمۃ اللہ

نے اپنے نفس عمارہ سے مقابلہ کر کے اُسے پست کر دیا

آپ نے اپنے نفس پر قابو پا کر نفسانی خواہشات ترک

کر کے پھر یہ عزت و شرف حاصل کیا حضرت محمد دیوان

شاہ صاحب رحمۃ اللہ خدا کے مقبول ولی تھے آپ نے بارگاہ

ربّ العزت میں بڑی شان پائی جو بھی آپ کا نورانی چہرہ

دیکھتا تھا گرویدہ ہو جاتا تھا آپ شجاع اور مرد مجاہد

تھے۔ آپ اپنے نفس پر قادر تھے

نفس بھی چار قسم کے ہیں

ان چار کے نام ہیں انکی الگ الگ خصلتیں ہیں

(۱) — نفس عمارہ

(۲) نفس مطمئنہ

(۳) نفس لوامہ

(۴) نفس الہیٰ

ایک روایت ہے کہ حضور اعلیٰ شاہ قطب کے بعد مکیریاں مائی بھاگن شاہ کے
آستانے پر بھی جاکر وظیفہ فرماتے رہے۔ منصور پور بھنڈا یرہ مست کا
سکرالے والوں سے بھی فیض حاصل کیا۔ سب نے بڑھائی تقویٰ
کی یہ حد کہ ۱۳ سال اناج نہیں کھایا چودہ سال تک روزہ
بڑی بیادریں اور بردی سے محفوظ زندہ رہنے کے لئے کچھ تھوڑا
دودھ پی لیا کرتے تھے پھر بحکم حضرت پیر رشید حسن علی شاہ رح
ہوشیار پور جناب قبلہ حافظ جی رحمتہ اللہ کے دست بیعت
ہوئے اور آپکو اپنی چشتیہ صابریہ سلسلہ میں شامل ہونے سے
آپکو وہ رنگ عطا ہوا کہ آپ نور اعلیٰ نور ہو گئے آپکو بھی
خدائے تعالیٰ نے چشتیہ سلسلہ میں عزت عطا کی آپ
کا اسم گرامی غریب پرور عاشق رسول حضرت خواجہ پیر محمد دیوان
شاہ رحمتہ اللہ مشہور ہو گیا۔ آپ نے ضلع ہوشیار پور
کے کئی گاؤں میں صابری آستانے بنائے ہوئے تھے
جہاں آپ مقررہ تاریخوں میں مختلف جگہوں پر عرس
کرایا کرتے تھے جہاں آپ صابری چشتی آستانہ بناتے تھے
وہاں آپ مسجد بھی ضرور تعمیر فرماتے تھے آپ صوم و صلوات
کے بڑے پابند تھے۔ جہاں حضور جاتے پنجگانہ نماز و

کا اہتمام ضرور فرماتے۔ آپ کا شغلہ اور طریقہ

یہ تھا کہ جس جگہ جہاں خواجگانِ چشت کا عرس

کراتے اوّل رات کو محفلِ میلاد منعقد کراتے جسمیں

اچھے عالم کی واعظ ہوتی اور خوش الحان نعت

خوان نعتِ رسول پڑھتے یہی آپکی غذا تھی قوالی

آپ بالکل نہیں سنتے تھے صرف چند منٹ ختم

کے وقت تشریف لاتے اس تھوڑے عرصے میں

اس موقعے قوال کو سینکڑوں روپے مریدین نچھاور

کر دیتے حضرت محمد دیوان شاہ رح جس پر آپ توجہ

ڈالتے وہ خوش قسمت ہو جاتا آپکی شکل اختیار کرلیتا

وہ مرید اپنی ہستی کو بھول کر پیر کی ہستی میں گم ہو جاتا پھر وہ

مرید سراپا دیوان شاہ بن جاتا۔ یہ ایک مسلمہ ثبوت

ہے آپ کا نظر کردہ سینکڑوں میں پہچانا جاتا آپکے

مرید کی صبح و شام تمام عام و خاص لوگوں سے الگ

نظر آتی تھی ہر ذی شعور اسکے حال و قال کہہ دیتا تھا کہ

یہ غلام صابری ہے آپکے مرید کی طرز گفتگو چلنے

ہر ایک کا موضوع ہی الگ ہوتا تھا۔ آپ کے مریدوں کی

پہچان فوراً ہو جاتی تھی۔ حضور سید محمد دیوان شاہ

اپنے مریدوں کو فنا فی الشیخ کے مرتبے تک فوراً

فائز کر دیتے تھے۔ کیونکہ آپ کے مریدوں میں دیوان شاہ کی

جھلک نظر آ جاتی تھی۔

✲

نہ ڈگمگائے کبھی ہم وفا کے رستے میں

چراغ ہم نے جلائے ہوا کے رستے میں

حبیب جالب

جنرل ضیاء کے دور میں حبیب جالب پر پولیس تشدد

میں ہوں شاعر زمانہ میرا اور ہے فسانہ
تمہیں فکر اپنے گھر کی مجھے ہر گلی کا غم ہے

حبیب جالب اپنے دوست حمید خان کے ساتھ
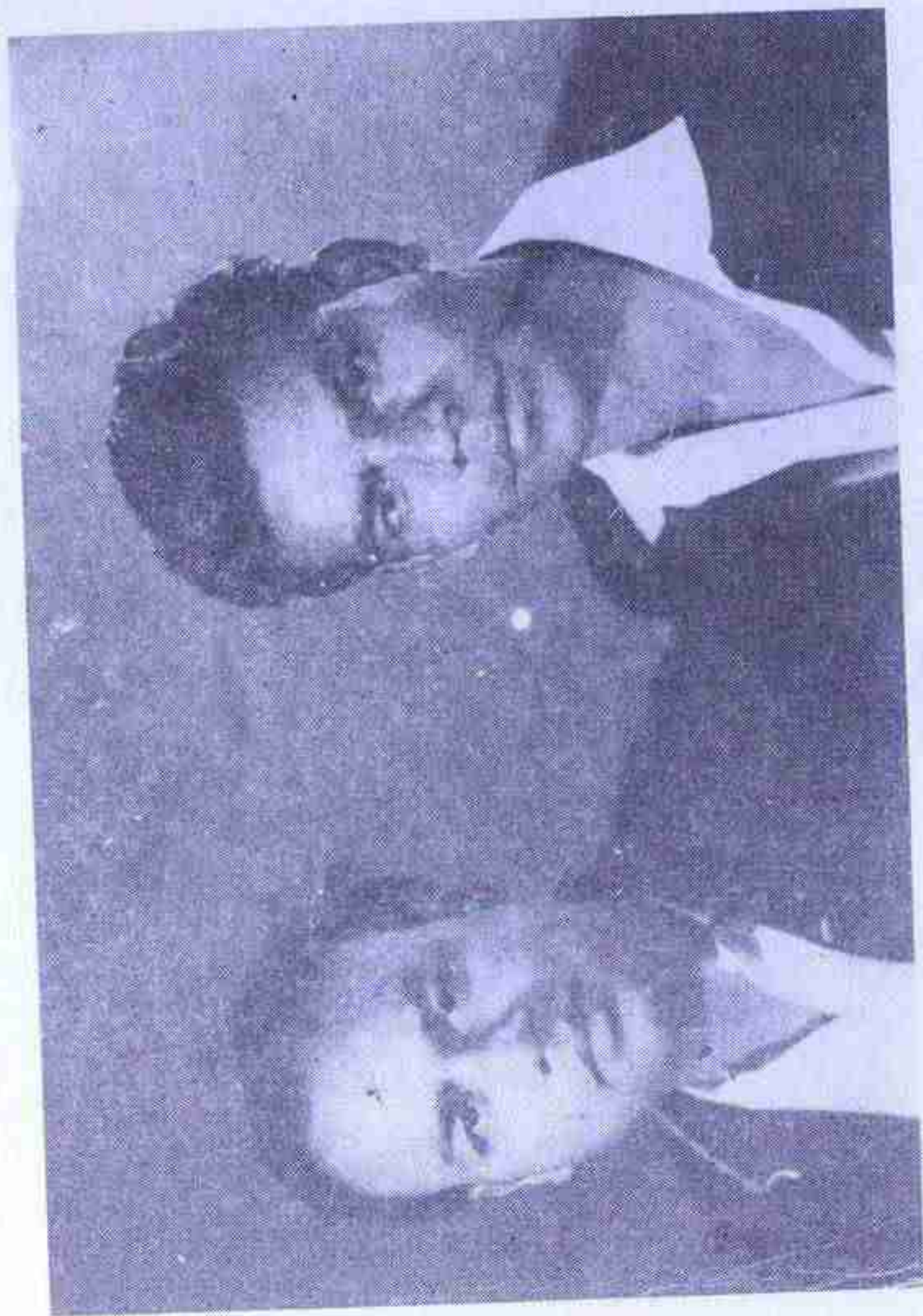
حبیب جالب اور مشتاق گزدر

آرٹس کونسل کراچی کے مشاعرہ منعقدہ ۱۹۶۰ء کے موقع پر
حبیب جالب اپنے دوستوں حمید خان اور اللہ والا کے ساتھ
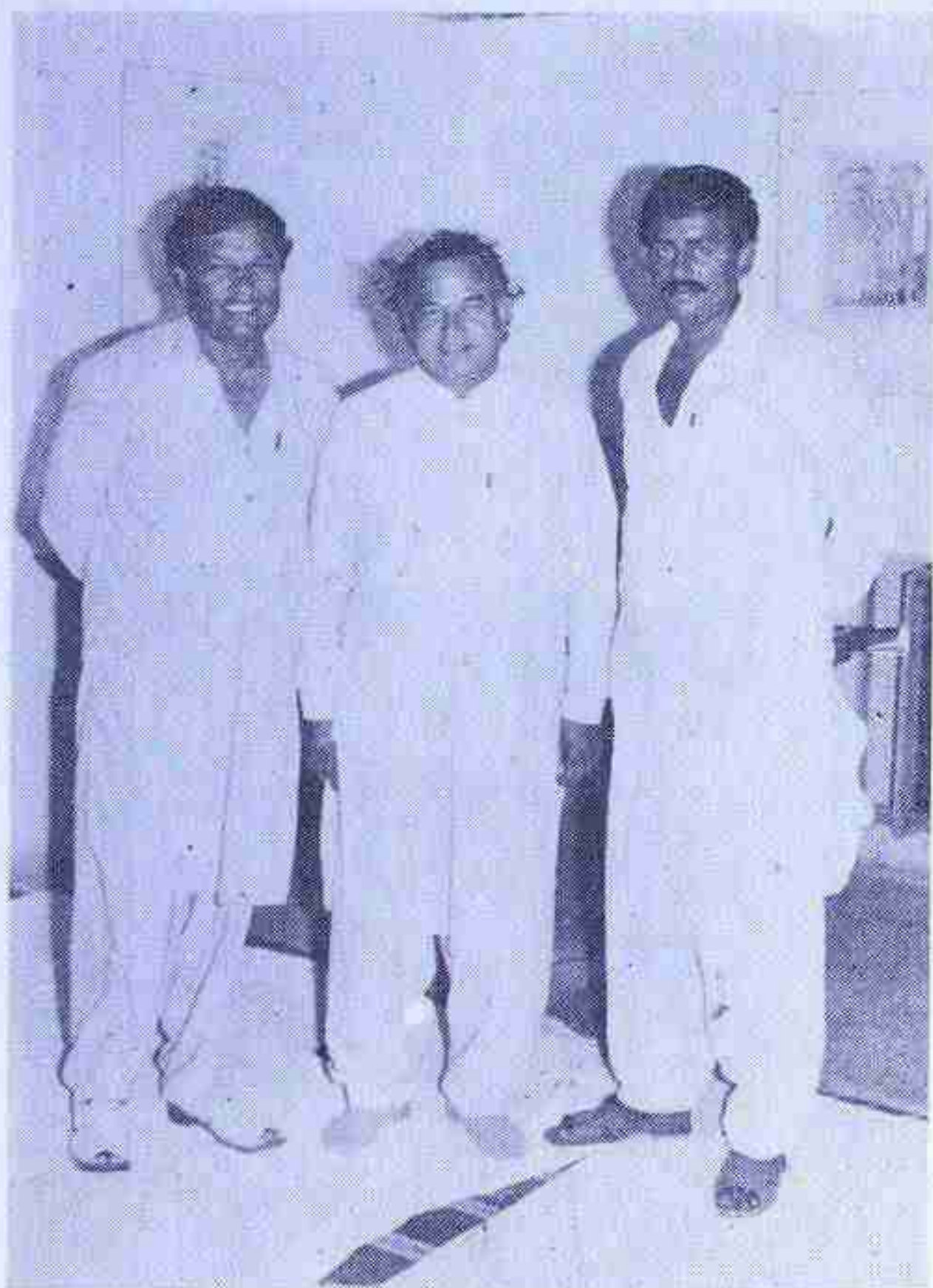
ناصر جالب۔ ایس، ایم انعام اور سعید پرویز
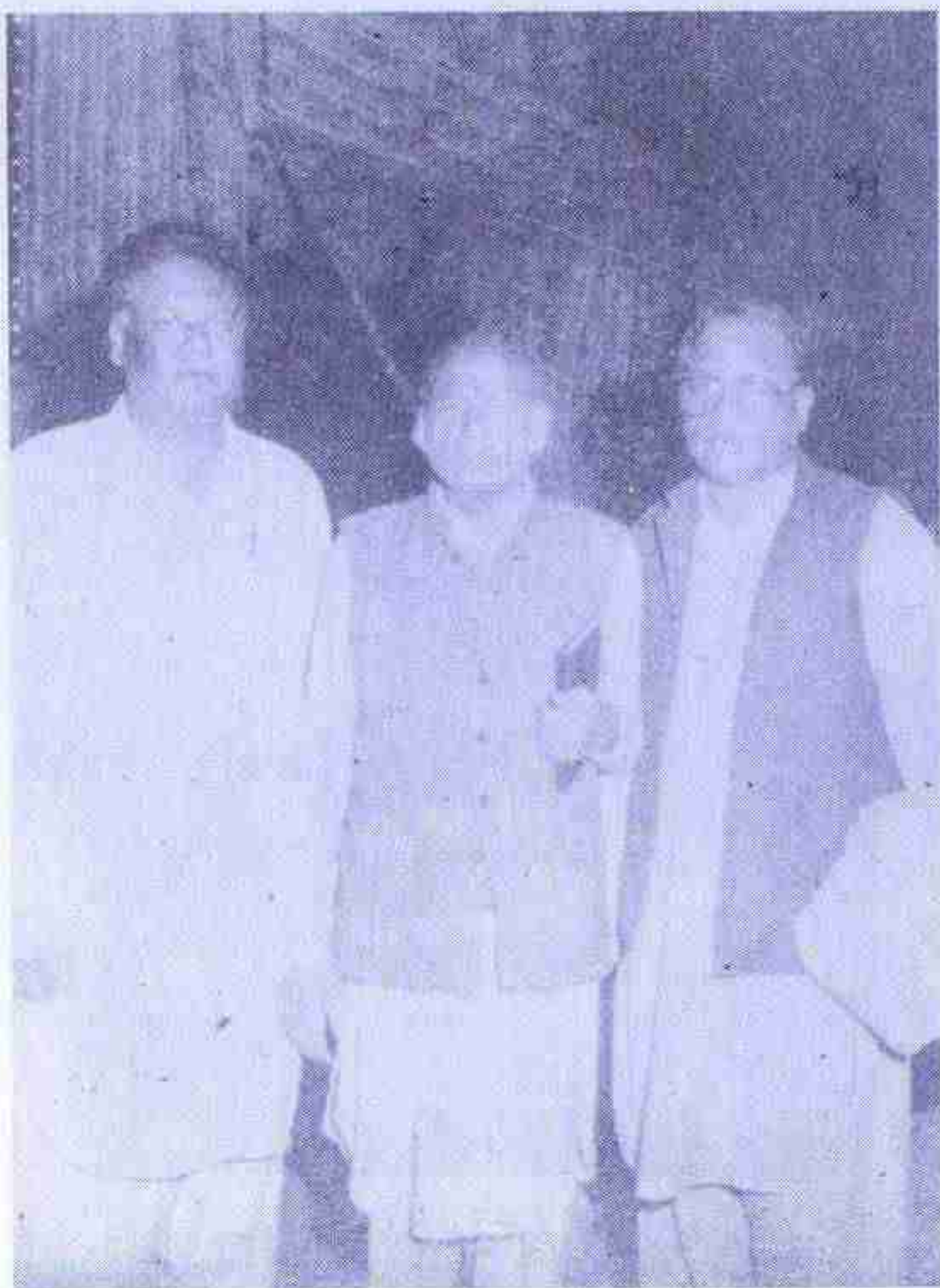
سعید پرویز اور محمود الحسن کے ساتھ حبیب جالب
عالمی مشاعرہ، نیشنل اسٹیڈیم کراچی (۱۹۸۸ء)

حبیب جالب اپنے گھر میں پوتی عینی کو اٹھائے ہوئے
ہمراہ فرحان، ردا، رخشندہ، حجاب

ہمارے والدین

حبیب جالب کے ساتھ سعید پرویز

میرا بھائی میرا جالبؔ

میرا بھائی میرا جالب

۱۰ جنوری ۱۹۴۷ء میری تاریخ پیدائش ہے۔ اس دن میں بھی اپنے دیگر بہن بھائیوں کی طرح اپنے آبائی گاؤں میانی افغاناں میں پیدا ہوا۔ وہی زمین ' وہی مٹی ' وہی خمیر جس نے حبیب جالب کو جنم دیا۔

میں بہت چھوٹا تھا ' یہی چھ سات برس کا۔ کہ جب میں نے پہلی بار اپنے گھر میں ایک شخص کو دیکھا ' کشادہ پیشانی ' بڑی بڑی روشن آنکھیں ' اور گھنے سیاہ بال کاندھوں پر جھولتے ہوئے۔ پہلی بار اس شخص کو دیکھا ' تو اس نے سرمئی رنگ کی پتلون پر چیک دار کوٹ پہن رکھا تھا اور قمیض کا گریبان چاک تھا۔ اس کے چہرے پر بلا کا اطمینان و اعتماد تھا۔ بے حد چمکدار تھا اس کا چہرہ وہ شخص پہلی نظر میں ہی مجھے بہت منفرد سا لگا۔

اماں! یہ کون ہے؟

اس سے پہلے کہ اماں میرے سوال کا جواب دیتیں ' اس منفرد شخص نے مجھے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔

بیٹا! یہ بھی تمہارا بڑا بھائی ہے۔ حبیب۔

(میں بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹا ہوں)

چند لمحوں پہلے تک بھی وہ شخص مجھے بہت اپنا اپنا سا لگا تھا' بھائی کے رشتے سے بھی بڑھ کر اپنا۔

حبیب نام سن کر میں نے حبیب بھائی کی گود میں بیٹھے بیٹھے ان کے چہرے کو پھر غور سے دیکھا۔ ان کے چہرے کی چمک' اطمینان و اعتماد' اور ان کا نام سن کر چھ سات سال کا بچہ سعید پختہ ہو گیا کہ ہو نہ ہو۔ یہ میرا بھائی حبیب بہت دولت مند' امیر کبیر شخص ہے۔ اور حبیب بینک کا مالک ہے۔ ایک عرصہ یہ تاثر میرے ساتھ ساتھ پروان چڑھتا رہا کہ حبیب بینک میرے بھائی حبیب کا ہے۔

باقی بھائیوں اور حبیب بھائی میں یہ فرق نمایاں تھا۔ کہ وہ تو مجھے گھر پر ہی نظر آتے' مگر حبیب بھائی گھر سے غائب ہوتے تو مہینوں ان کی صورت نظر نہ آتی۔ بھائی حبیب گھر سے چلے جاتے تو میں ان کا انتظار کیا کرتا۔ اور جب وہ گھر واپس آجاتے تو میں بہت خوش ہوتا۔ ان کے آجانے سے مجھے گھر' گھر لگنے لگتا یہ میرا ہی نہیں' سبھی بہن بھائیوں کا حبیب بھائی سے ایسا ہی محبت کا رشتہ تھا۔ یقیناً اس محبت میں حبیب بھائی کا اپنا بہت زیادہ عمل دخل تھا۔ خود وہ سارے ہی بہن بھائیوں سے بے حد خلوص و محبت سے پیش آتے تھے۔

مگر ہمارے ابا اور اماں' حبیب بھائی سے شدید ناراض رہتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ حبیب بھائی' بھی مشتاق بھائی کی طرح میٹرک پاس کرلیں اور پھر کسی دفتر میں کلرک بھرتی ہو جائیں۔ مگر بھائی میں تو کوئی بھی بات ایسی نظر ہی نہ آتی تھی۔

یہ ۵۵۔۱۹۵۴ء کی بات ہے۔ اس وقت تک جالب بھائی ایک غزل گو رومانی شاعر کی حیثیت سے اپنی خاص پہچان بنا چکے تھے۔ اور ان کا نام کراچی کے ادبی حلقوں سے نکل کر دوسرے شہروں کے ادبی حلقوں تک تیزی سے پہنچنے لگا تھا۔ ان کے نام سے زیادہ ان کے اشعار تیزی کے ساتھ سفر کر رہے تھے۔

ایک ہمیں آوارہ کہنا' کوئی بڑا الزام نہیں
دنیا والے دل والوں کو اور بہت کچھ کہتے ہیں

یہ اعجاز ہے حسن آوارگی کا
جہاں بھی گئے داستاں چھوڑ آئے

میر جواد حسین کی بیٹھک

میر جواد حسین صاحب نابینا تھے۔ میر صاحب بہت بڑے سخن فہم تھے۔ انہیں یہ اعزاز بھی حاصل تھا۔ کہ حضرت جگر مراد آبادی اپنی ہر تازہ غزل پہلے میر صاحب کو سناتے۔ اور اگر میر صاحب کسی شعر پر اعتراض یا ناپسندیدگی کا اظہار کرتے تو جگر صاحب اس شعر کو تبدیل' یا غزل سے نکال دیتے تھے۔

قیام پاکستان کے اوائل سالوں میں کراچی کی جو ادبی بیٹھکیں' بہت اہمیت حاصل کر سکیں' ان میں نہایت اہم ادبی بیٹھک میر جواد حسین صاحب کی سمجھی جاتی تھی۔ اس کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ کہ میر صاحب کی ادبی بیٹھک میں اظہر نفیس' فرید جاوید' جمال پانی پتی' عارف جلالی' طفیل احمد جمالی' اور حبیب جالب جیسے شعراء شامل تھے۔ جب کہ جمیل الدین عالی کا بھی اکثر میر صاحب سے رابطہ رہتا تھا۔ میر جواد حسین کی بیٹھک کے شعراء میں دو شاعر نسبتاً زیادہ تیکھے اور ہردلعزیز شاعر سمجھے جاتے تھے۔ فرید جاوید اور حبیب جالب' فرید جاوید صاحب کا ایک شعر دہرا کر انہیں خراج تحسین پیش کرتے ہوئے آگے بڑھوں گا۔

گفتگو کسی سے ہو' تیرا دھیان رہتا ہے
ٹوٹ ٹوٹ جاتا ہے سلسلہ تکلم کا

اس زمانے میں کراچی کے مشاعروں میں پسند کیے جانے والے شعراء میں فرید جاوید اور حبیب جالب کے نام بھی شامل ہوتے تھے۔

جٹ لائن (کراچی) میں ہمارے گھر کے سامنے ہی میر جواد حسین صاحب ایک ٹینٹ کے بنے ہوئے گھر میں اپنے اہل خانہ کے ساتھ رہتے تھے۔ روزانہ شام کو میر صاحب کی بیٹھک لگتی' اور شعراء اپنا اپنا روزنامچہ میر صاحب کی خدمت میں پیش کرتے۔

"نیا نیا ملک بنا تھا' سبھی خانہ برباد' لٹے پٹے لوگ تھے۔ ایک ہی جیسے لہٰذا محبتیں بہت تھیں" مصروفیت کوئی نہ تھی' وقت ہی وقت تھا' سو گھنٹوں ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھ کر گزرتے۔

کہو بھئی فرید جاوید آج ریڈیو اسٹیشن گئے تھے۔ کیا رہا؟

ہاں بھئی جالب فلم اسٹوڈیو گئے تھے۔ کچھ بات بنی؟

میر صاحب ہر شاعر سے اس کی دن بھر کی مصروفیت کے بارے میں پوچھتے جالب بھائی' اسی زمانے میں فلمی نغمہ نگاری کے لئے بھی کوشش کر رہے تھے۔ پھر ایک دن میں نے اداکار آزاد صاحب کو اپنے گھر میں دیکھا۔ ان کے ساتھ ایک دبلا پتلا' نوجوان بھی تھا۔ جس سے وہ پوچھ رہے تھے۔

میاں ہارمونیم بجانا جانتے ہو؟

نوجوان نے اثبات میں سر ہلایا۔

تو بس ٹھیک ہے۔ آج سے تم میوزک ڈائریکٹر ہو یوں خلیل احمد موسیقار بن گئے۔

آزاد صاحب اس زمانے میں ایک فلم بنا رہے تھے "طوفان کے بعد" اس فلم کے نغمہ نگار حبیب جالب اور موسیقار خلیل احمد تھے۔ جالب بھائی نے اس فلم کا تھیم سانگ لکھا تھا۔

فلک والے' تماشہ دیکھتا جا' غم کے ماروں کا

برگ آوارہ کی اشاعت

جالب بھائی' شروع سے ہی بڑے مست ملنگ قسم کے انسان واقع ہوئے تھے۔ اپنی ذات کے حوالے سے اپنے مفاد کے لئے انہوں نے زندگی بھر کبھی کوئی منصوبہ بندی نہیں کی۔ وہ انفرادیت کے نہیں اجتماعیت کے قائل تھے ان کا شروع سے ہی یہ مزاج تھا۔

۵۷-۱۹۵۶ء میں جالب بھائی لاہور سے اچانک کراچی آئے اور اپنے ساتھ یہ خبر لائے کہ 'مکتبہ کارواں' میری کتاب شائع کر رہا ہے۔

یہ خبر سنانے کے بعد انہوں نے اپنی بیاض کے بارے میں سوچا۔ مگر بیاض کہاں تھی۔
کب بنائی تھی انہوں نے بیاض
ان کی زندگی تو عمل سے عبارت تھی' بس کام کرتے جاؤ' اس سے آگے انہوں نے کبھی سوچا ہی نہ تھا۔ شہرت وغیرہ کے چکر میں وہ کبھی پڑے ہی نہیں۔
اب کیا ہوگا۔ چند غزلیں' چند اشعار۔ جو انہیں ازبر تھے وہ انہوں نے لکھ لئے۔ اور پھر سوچنے لگے۔ کہ یہ سب کچھ تو کتاب کے لئے کافی نہیں ہے۔ یہ تو چند صفحات ہی بنتے ہیں۔
ہماری اکلوتی بہن رشیدہ آپا اسکول سے آئیں۔ اور انہوں نے بھائی کو پریشان دیکھا تو پوچھا۔
بھائی خیریت ہے' کیوں پریشان ہیں؟
جالب بھائی جس کرب میں مبتلا تھے' اور جو ان پر بیت رہی تھی۔ ایسے میں انہیں رشیدہ آپا کا پریشانی کی وجہ پوچھنا انتہائی زہر لگا۔ اور انہوں نے رشیدہ آپا کو بری طرح جھڑک دیا۔
چلو' جاؤ اپنا کام کرو۔
شاید زندگی میں پہلی بار۔ جالب بھائی نے رشیدہ آپا سے اس لہجے میں بات کی تھی۔
رشیدہ آپا خاموش سی ہو کر بیٹھ گئیں۔ وہ بھی جالب بھائی کے رویئے پر حیران تھیں۔
جالب بھائی نے بہن کو خاموش اداس بیٹھے دیکھا۔ تو انہیں اپنے رویئے پر افسوس ہوا' اور وہ رشیدہ آپا سے اپنی پریشانی کی وجہ بیان کرنے لگے۔
میری کتاب چھپ رہی ہے۔ ملک کا بہت بڑا پبلشنگ ادارہ میری کتاب چھاپنے پر رضامند ہوگیا ہے۔ مگر کتاب کے لئے میرے پاس کچھ بھی موجود نہیں ہے۔ سوائے ان چند غزلوں اور نظموں کے۔
یہ کہہ کر جالب بھائی نے لکھے ہوئے چند صفحات رشیدہ آپا کے سامنے رکھ دیئے۔
ارے بھائی! آپ اس لئے پریشان تھے!
رشیدہ آپا کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ اٹھیں اور صندوق سے ایک پوٹلی نکال کر بھائی کے سامنے رکھ دی۔

یہ لیں بھائی! آپ کی شاعری۔

یہ کیا ہے؟

بھائی جالب نے حیرانی سے کپڑے کی پوٹلی کو کھولا۔

اس میں کاغذات کے پرزے تھے۔ سگریٹ کے پیکٹ تھے۔ اور ان پر جالب بھائی کی شاعری بکھری ہوئی تھی۔ یہ سب کچھ دیکھ کر جالب بھائی دیوانوں کی طرح کاغذات کے پرزوں کو الٹنے پلٹنے لگے۔

رشیدہ یہ سب کچھ تم نے کیسے سنبھالا میری بہن؟

جالب بھائی! جب آپ بستر سے سو کر اٹھتے تھے۔ تو آپ کے تکئے کے نیچے سے جو کاغذات ملتے تھے۔ انہیں میں سنبھال لیتی تھی۔ اور اسی طرح آپ کے کپڑوں کی جیبوں سے ملنے والے کاغذات بھی میں سنبھال کر رکھ لیتی تھی۔ یہ سب وہی کاغذات ہیں۔

اس طرح جالب بھائی کی پہلی کتاب "برگ آوارہ" کی اشاعت میں ہماری اکلوتی بہن رشیدہ آپا نے کلیدی رول ادا کیا۔

اٹھائیس سال کی عمر میں جالب بھائی صاحب دیوان شاعر بن گئے تھے۔

ہمارے والد صوفی عنایت اللہ بہت ہی متقی و پرہیز گار تھے۔ خاندان کے بڑے بوڑھوں سے میں نے ان کے بارے میں یہی سنا ہے کہ سن بلوغت کو پہنچنے کے بعد جو داڑھی کے بال قبلہ والد صاحب کے نکلے انہوں نے رکھ لئے اور وہ کبھی داڑھی منڈھے نہیں رہے۔ اور تمام عمر مٹھی بھر داڑھی۔ ان کی شخصیت کا حصہ رہی قبلہ والد صاحب کو میں نے تمام زندگی صوم و صلواۃ کا انتہائی پابند دیکھا۔ ہمارا گھرانہ پیروں بزرگوں سے بے پناہ عقیدت رکھنے والا ہے۔

ہم قیام پاکستان کے بعد کراچی جٹ لائن کی بیرک نمبر ۳۵ کے کوارٹر نمبر ۳ میں رہائش پذیر ہوئے' وہیں بیرک نمبر ۲۲ کے کوارٹر نمبر ۲ میں ایک بہت نیک بزرگ' حضرت پیر ضیاء القادری بھی رہتے تھے۔ ان کے ہاں ہفتہ وار نعتیہ مشاعرہ کی نشست بھی ہوتی تھی۔ ہمارے والد صاحب پابندی سے ان نشستوں میں شریک ہوا کرتے تھے۔ اور والد صاحب کی انتہائی

خواہش ہوا کرتی تھی۔ کہ جالب بھائی بھی پیر ضیاء القادری صاحب کے ہاں منعقدہ شعری نشستوں میں شرکت کیا کریں۔ پیر ضیاء القادری صاحب معروف شاعر شکیل بدایونی کے چچا تھے۔ اور خود بھی قادر الکلام شاعر تھے۔

جالب بھائی باقاعدہ نعت گو شاعر کبھی نہیں رہے۔ لیکن جب جب انہوں نے حضور سرور کائنات کی شان میں اشعار کہے ہیں تو اپنے رنگ ولہجہ میں کہے ہیں۔ اور خوب کہے ہیں۔ پیر ضیاء القادری صاحب کی نعتیہ نشستوں کے لئے کہی گئی چند نعتیں اور منقبت زیر نظر کتاب میں شامل ہیں۔ جو اس سے پہلے کسی کتاب میں شامل نہیں ہوئیں پیر ضیاء القادری صاحب بھی جالب بھائی سے بہت عقیدت و محبت رکھتے تھے اور ان کی صلاحیتوں کے معترف تھے۔

حبیب احمد مست میانوی

قیام پاکستان کے بعد ہم لوگ ۱۹۴۷ء میں دہلی سے کراچی پہنچے جالب بھائی کی عمر اس وقت ۱۹ سال تھی اور وہ جیکب لائن (کراچی) کے ہائی اسکول میں درجہ دہم میں پڑھتے تھے۔ اور کراچی شہر کے ابھرتے ہوئے نوجوان شعراء میں ان کا نام بھی لیا جاتا تھا۔ اس وقت ان کا تخلص مست ہوا کرتا تھا' اور اپنے آبائی گاؤں میانی افغاناں کی نسبت سے نام کے آخر میں میانوی بھی لگاتے تھے۔ گھر کے معاشی حالات بہت خراب تھے اور بھائی صاحب کا پڑھائی کی طرف دھیان تھا ہی نہیں۔ ہمارے ابا' اماں' بہت پریشان رہتے تھے۔ کوئی کام کاج بھی نہیں تھا اور مستقبل بھی حبیب احمد مست بن گیا تھا۔

ایسے میں ایک دن بھائی کے اسکول ٹیچر نصر اللہ خان صاحب (سینئر کالم نویس) گھر تشریف لائے' اور والد صاحب سے بولے۔ کہ ماشاء اللہ آپ کا بیٹا مست' ذہین طالب علم ہے اور شعر بھی اچھے کہتا ہے۔ آپ اجازت دیں' تو میں اسے اپنے گھر لے جاؤں یہ وہیں رہے گا۔ اور میں اس کی پڑھائی کا بھی خیال رکھوں گا۔ والد صاحب ذرا سی پس و پیش کے بعد مان گئے۔ اور بھائی جالب' اپنے اسکول ٹیچر نصر اللہ خان کے گھر رہنے لگے۔ نصر اللہ خان اس

زمانے میں جہانگیر روڈ کے سرکاری کوارٹر میں رہتے تھے۔ انہوں نے مست صاحب کا بستر برآمدہ میں لگوادیا۔ نصراللہ خان صاحب نے روزنامہ حریت کے ایک کالم میں انہی دنوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا (کالم کا نام "ہمارے اسکول کے ہونہار طلبا" تھا) اس کالم میں انہوں نے صرف دو ہی طلباء کا ذکر کیا تھا۔ ایک حبیب جالب کا اور دوسرا تحریک پاکستان کے صف اول کے رہنما' سردار عبدالرب نشتر کے صاحبزادے جمیل نشتر صاحب کا۔

نصراللہ خاں نے اپنے کالم میں لکھا۔

ایک رات مست نے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ ہم گہری نیند سو رہے تھے۔ بیگم نے مجھے اٹھایا۔

دیکھو مست دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے۔

میں بھی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میرے دل میں خیال آیا کہ ہو سکتا ہے مست کی طبیعت خراب ہو گئی ہو' بہرحال میں نے بستر پر بیٹھے بیٹھے ہی مست سے پوچھا۔

ہاں بھئی مست کیا بات ہے؟

اور میرے سوال کے جواب میں مست بولا۔

حضور ایک غزل ہو گئی ہے۔ ذرا سن لیجئے۔

میں نے کہا کہ ابھی سو جاؤ مست۔ صبح دیکھا جائے گا۔

مگر مست پھر بولا۔

نہیں حضرت ابھی سن لیجئے۔

آخر ہم دونوں میاں بیوی اٹھے' دروازہ کھولا' اور مست کی غزل سنی۔

ایک تو اس کی غزل اور پھر اس کا مسحور کن ترنم' مست تو اپنی غزل سنا کر' مست ہو کر گہری نیند سو گیا۔ اور ہم میاں بیوی نے اس کی غزل کے سحر میں تارے گنتے بقیہ رات گزاری۔

❁

مست سے جالب ابن انشاء کا کمال

ریگل چوک صدر کراچی میں ایک ہوٹل ہوا کرتا تھا۔ کیفے جارج اب تو کبھی کچھ حالات و زمانے کی نذر ہو گیا' خیر پچاس کی دہائی میں کیفے جارج ادیبوں' شاعروں' مصوروں' دانشوروں' موسیقاروں اور نوجوان ذہین سیاسی طلباء کی بیٹھک ہوا کرتا تھا۔ مشتاق یوسفی' صادقین' عالی جی' موسیقار رفیق غزنوی اور ابن انشاء' مجید لاہوری' اور بہت سے اسی کیفے جارج کے مستقل بیٹھنے والوں میں شامل تھے۔ اسی کیفے جارج میں حبیب کا مست' ابن انشاء کے کہنے اور دوستوں کی تائید سے جالب بنا دیا گیا۔ حبیب مست اور حبیب جالب' بات تو ایک ہی ہے۔ مگر حبیب جالب یہ دونوں لفظ گھڑے ہوئے نہیں۔ ''اترے'' ہوئے لگتے ہیں۔
جالب بھائی کی شاعری' اور شہر شہر گاؤں گاؤں' ان کا گھومنا پھرنا۔ کبھی لاہور' کبھی لائل پور' کبھی ڈچکوٹ' کبھی بہاول پور۔

آج اس شہر میں کل نئے شہر میں' بس اسی لہر میں
اڑتے پتوں کے پیچھے اڑاتا رہا' شوق آوارگی

ہم آوارہ' گاؤں گاؤں' بستی بستی پھرنے والے
ہم سے پریت بڑھا کر کوئی' مفت میں کیوں غم کو اپنا لے

اسی قسم کی شاعری نے ہمارے سادہ لوح اماں اور ابا کو بہت پریشان کر رکھا تھا۔ دوسری طرف حیدر بخش جتوئی کی ہاری تحریک سے بھائی صاحب کا باقاعدہ عملی تعلق۔ یہی عوامل تھے' جن کی وجہ سے اماں ابا نے بھائی کی شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔
بھائی کو اماں ابا کے پلان کا پتہ چلا' تو وہ سراپا احتجاج بن گئے۔ اور انہوں نے اماں ابا کے شادی پلان کا رخ جوان بہن رشیدہ کی طرف موڑتے ہوئے کہا۔ کہ پہلے اس کے بیاہ کی فکر کی جائے۔

جالب بھائی کی سوچ بہت درست تھی' مگر سادہ لوح والدین کے نزدیک زیادہ نازک مسئلہ جالب بھائی کی آزاد روی کا تھا۔ جس کا واحد حل ان کے نزدیک شادی ہی تھا۔ جالب بھائی بڑے روئے دھوئے' گھر سے بھاگ گئے۔ مگر کہاں تک بھاگتے۔

بھائی نے آخر والدین سے صاف کہہ دیا' کہ وہ شادی کے جھمیلے میں پڑ کر کسی لڑکی کو اپنے ساتھ عذاب میں مبتلا نہیں کرنا چاہتے۔ میری زندگی کا مقصد کچھ اور ہے۔ پر خطر رستے میرا مقدر ہیں۔ لہٰذا آپ میری شادی کے ارادے سے باز آجائیں۔

مگر اماں ابا نے ایک نہ سنی اور زبردستی بھائی صاحب کو گھیر کر ملتان لے گئے۔ محرم کا مہینہ تھا۔ دو دن بعد نکاح تھا۔ بھائی جالب نکاح سے دو دن پہلے ملتان سے بھاگ کر ڈِچکوٹ چلے گئے۔ مگر وہاں سے بھی پکڑے گئے اور بالآخر محرم کی چھ تاریخ کو انتہائی سادگی سے (بلکہ سادگی بھی میں نے کچھ زیادہ ہی لکھ دیا) ہماری چچا زاد بہن ممتاز بیگم سے نکاح پڑھادیا گیا۔ بھائی کی شادی ۱۹۵۷ء میں ہوئی تھی۔

کراچی سے لاہور کی جانب کوچ

شادی کے بندھن میں بندھ کر تو جالب بھائی پابند نہ ہو سکے۔ مگر جوان بہن رشیدہ' ان کے پاؤں کی زنجیر بن گئی۔ اور وہ سب کچھ بھول گئے اور صرف یہی یاد رہ گیا۔ کہ جوان بہن کے ہاتھ کیونکر پیلے کئے جائیں۔ مشکل یہ تھی کہ ہمارے سبھی عزیز رشتہ دار پنجاب میں آباد تھے لہٰذا آپا رشیدہ کے فرض سے سبکدوش ہونے کے لئے ہمیں کراچی سے لاہور کی جانب کوچ کرنا پڑا۔

۱۹۵۸ء میں اسی مقصد کے تحت بھائی جالب' آپا رشیدہ' بھابی ممتاز اور اماں ابا سمیت لاہور شفٹ ہو گئے' میں بھی ان کے ہمراہ تھا۔

اماں ابا کی نیک نیتی اور جالب بھائی کا خلوص تھا۔ کہ لاہور آنے کے چند ہی دن بعد آپا رشیدہ کے لئے بہت اچھا بر مل گیا۔ مختار بھائی بہت لائق انسان تھے۔ انہوں نے میٹرک کے

امتحان میں پورے پنجاب بورڈ میں اول پوزیشن حاصل کی تھی۔ جالندھر شہر کے معروف استاد' پروفیسر محمود صاحب' مختار بھائی کے استاد تھے اور مختار بھائی اکاؤنٹنٹ جنرل پنجاب کے دفتر میں ملازم تھے۔ دونوں طرف کے بزرگوں نے باہم مل کر رشتے کی بات پکی کر دی۔ اور شادی کی تاریخ طے ہو گئی۔

اب اصل مسئلہ شادی کے اخراجات تھے۔ جن کے لئے نہ کوئی وسیلہ تھا نہ سبیل' مشتاق بھائی اپنے بیوی بچوں کی ذمہ داریاں بمشکل پوری کر پاتے تھے۔ حمید بھائی کو ملازم ہوئے بھی ایک دو سال ہی ہوئے تھے۔ اب لے دے کے ایک جالب بھائی رہ گئے تھے جن کے پلے کچھ بھی نہ تھا۔

۱۹۵۸ء میں جالب بھائی کی شہرت بحیثیت شاعر ہندوستان تک پہنچ چکی تھی۔ بہن کے نصیب اس کی قسمت کہ اسی سال' جالب بھائی کو ہندوستان کے لئے کئی مشاعروں کے دعوت نامے ملے۔ جنہیں انہوں نے قبول کیا۔ اس کے علاوہ لاہور کے بہت بڑے بڑے فلم سازوں نے بھی جالب بھائی سے اپنی فلموں کے گیت لکھوائے۔ جالب بھائی نے رائج معاوضہ سے تین گنا مانگا۔ تو فلم سازوں نے دیا۔ یہ سب آپا رشیدہ کا نصیب تھا۔

یوں اپنی اکلوتی بہن رشیدہ کی شادی میں جالب بھائی نے نمایاں کردار ادا کیا۔

آپا رشیدہ کی رخصتی رام نگر کے ایک مکان سے ہوئی تھی جو ہمارے ہونے والے بہنوئی مختار بھائی کے کسی دوست کا تھا۔

بہن کی شادی کے بعد ہم سانده خورد کے علاقہ میں چلے آئے جہاں بیس روپیہ ماہوار کرائے کے ایک کمرے والے مکان میں ہم نے رہائش اختیار کر لی تھی۔ اس کا صحن کچا تھا اور سرخ اینٹوں والا کمرہ بغیر پلستر کے تھا۔

ارجن روڈ کرشن نگر لاہور کے کارپوریشن پرائمری اسکول میں' میں پانچویں جماعت میں داخل ہو گیا۔ وہیں میرے ساتھ ٹسٹ کرکٹر شفیق پاپا بھی پڑھتا تھا۔ ۱۹۶۰ء میں پانچویں جماعت پاس کر کے میں مسلم ماڈل ہائی اسکول لاہور میں آ گیا۔

سانده خورد کے بیس روپیہ ماہانہ کرایہ والے گھر میں میں نے ساحر صدیقی کو دیکھا درمیانہ

قد' بھرا بھرا جسم' چہرے پر چھوٹی سی سیاہ داڑھی۔ وہ جالب بھائی کے ساتھ آئے تھے۔ افسوس کہ وہ عین جوانی کے عالم میں انتقال کر گئے۔ مرحوم اس زمانے میں بہت مقبول شاعر تھے۔ ایک بار مری مشاعرے میں گئے۔ ساحر اور جالب بھائی ایک ہی کمرے میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ رات گئے جالب بھائی ہوٹل پہنچے۔ تو ساحر صدیقی صاحب پہلے سے کمرے میں سو رہے تھے۔ جالب بھائی بھی ان کے ساتھ بستر پر لیٹ گئے۔ جالب بھائی بے خبر تھے۔ جب کہ ساحر صاحب سوتے ہی میں انتقال کر چکے تھے۔ اور جالب بھائی' رات بھر مردہ ساحر صدیقی کے ساتھ لیٹے رہے۔ صبح سو کر اٹھے تو انہیں معلوم ہوا۔ کہ ساحر تو انتقال کر چکے ہیں۔

چند ماہ اس مکان میں رہ کر ہم اس گھر سے نسبتاً بہتر گھر میں چلے آئے۔ مگر وہ بھی ایک ہی کمرے کا گھر تھا۔ چند ماہ وہاں رہ کر ہم ملک ظہور الدین صاحب' جن کے نام سے ظہور اسٹریٹ بھی تھی۔ انہی ملک ظہور دین کے عزیز قریب ہی رفیق منزل کے نام سے عمدہ کوٹھی میں رہتے تھے۔ رفیق منزل والوں نے اپنی کوٹھی کے پچھواڑے ایک ایک کمرے والے کوارٹر بنا رکھے تھے۔ انہی کوارٹروں میں سے درمیان والا کوارٹر ہم نے تیس روپے ماہانہ کرایہ پر لے لیا ہم نے خاصا طویل عرصہ اس گھر میں گزارا۔ جو اب تاریخ کا حصہ بن چکا ہے۔

✲

ہماری نانی گوماں (غلام فاطمہ) جن کا انتقال ۱۳۰ برس کی عمر میں ہوا، کا آخری دیدار

نانی گوماں

ہمارے گھر کی کہانی (حوالہ خواہ کوئی بھی ہو) نانی گوماں کے بغیر مکمل ہو ہی نہیں سکتی۔ اس بات سے اندازہ لگالیں کہ نانی گوماں کس طرح سے ہمارے گھرانے پر چھائی ہوئی تھیں۔

ہمارے گھرانے میں نانی گوماں کے اس اہم مقام کی بہت سی وجوہات تھیں۔ ایک تو یہی کہ وہ ہماری نانی تھیں دوئم یہ کہ ان کو خصوصاً" اپنی سب سے چھوٹی بیٹی یعنی ہماری اماں رابعہ بصری اور اس کی اولاد سے پیار ملا بھی اور انہوں نے دیا بھی

اسی پیار و محبت کی عملی مثال نانی کا اپنے نواسے حبیب جالب سے انتہا کا عشق تھا۔

جالب بھائی نانی گوماں کے پرانے کاروباری شراکت دار بھی تھے۔ ۱۹۳۹ء میں ہمارے بڑے بھائی مشتاق مبارک نے میٹرک پاس کیا اور پھر وائسرائے ہند کے دفتر دہلی میں بابو بھرتی ہو گئے۔ یوں ہمارا گھر گاؤں میانی افغاناں ضلع ہوشیار پور سے دہلی منتقل ہو گیا۔ مگر جالب بھائی اس وقت گاؤں ہی کے پرائمری اسکول میں پانچویں جماعت میں پڑھ رہے تھے۔ اس لئے گھر والے جالب بھائی کو نانی گوماں کے پاس چھوڑ گئے۔ اسکول سے آنے کے بعد یہ دونوں نانی نواسہ گلی گلی گاؤں گاؤں ازار بند چٹلے جنہیں پراندے بھی کہتے ہیں' بیچا کرتے تھے۔

نانی گوماں اسّی برس کی عمر میں نابینا ہو گئیں تھیں' اور ۱۹۳۹ء میں بھی وہ نابینا ہی تھیں۔ مگر ازار بند' اور پراندے وغیرہ بن لیتی تھیں۔ نانی گوماں کا اصل نام غلام فاطمہ تھا۔ میں نے ۵۲ء' ۵۳ء میں ہوش سنبھالا۔ تو انہیں دیکھا۔ ان کی آنکھیں بجھی نہیں تھیں۔ تب بھی ہلکے سبز رنگ کے خوب صورت نگینے ان کی آنکھوں میں چمکا کرتے تھے۔ اس وقت تک وہ ایک سو بیس برس کی ہو چکی تھیں۔ چہرہ جھریوں سے اٹا ہوا' درمیانہ قد' اتنی عمر کے باوجود کمر بالکل سیدھی جس میں کوئی خم یا جھکاؤ رتی برابر بھی نہیں' آواز بڑی بارعب گرجدار' ذہن بالکل

تندرست پورے گھر میں ایک ڈنڈے کے سہارے چلتی پھرتی تھیں۔ کہاں غسل خانہ ہے کہاں بیت الخلاء ہے صحن کہاں ختم ہوتا ہے۔ برآمدہ کہاں سے شروع ہوتا ہے۔ باورچی خانہ کدھر ہے۔ کمروں کے دروازے کہاں کہاں ہیں۔ یہ سب کچھ نانی کو دیگر گھر والوں کی طرح معلوم تھا۔ غسل خانے میں نہانے کو جاتیں تو اپنے کپڑے بھی دھوڈالتیں۔

نانی گوماں کی تین بیٹیاں' لائل پور (موجودہ فیصل آباد) میں رہتی تھیں۔ جن سے ملنے کے لئے نانی کبھی کبھار وہاں جایا کرتی تھیں۔ کراچی سے کوئی نہ کوئی نانی کو لائل پور چھوڑنے جاتا مگر لائل پور سے ہمیشہ نانی اکیلی ہی ریل گاڑی میں بیٹھ کر کراچی آجایا کرتی تھیں۔ نابینا ہونے کی وجہ سے ان کا کرایہ بھی معاف ہوتا تھا۔ وہ آرام سے کراچی کینٹ اسٹیشن اترتیں' نانی کے پاس تھوڑے بہت پیسے تو ہوتے ہی تھے' تو وہ قلی سے سامان اٹھواکر اسٹیشن کے باہر تانگہ اسٹینڈ تک جاتیں جہاں سارے تانگے والے نانی کو دیکھتے ہی ان کی طرف دوڑتے

نانی آگئی

نانی آگئی۔

ایک شور مچ جاتا' اب جس تانگے والے نے نانی کا ہاتھ پہلے پکڑلیا۔ نانی اسی کے تانگے میں سوار ہوجاتیں۔ اس زمانے میں تانگے کینٹ اسٹیشن سے جٹ لائن ابی سینیا لائنز' ٹیونیشیا لائنز' جیکب لائن کے لئے چلا کرتے تھے اور اکثر تانگے والوں کے گھر' گھرکیا جھونپڑے جٹ لائن میں ہوتے تھے۔ جہاں ہم بلاک نمبر ۳۵ کے کوارٹر نمبر ۳ میں ۱۹۴۷ء سے آباد تھے۔ اور ہمارے سب سے بڑے بھائی مشتاق علاقے میں خاصے مشہور تھے' وہ محکمہ فلم و مطبوعات مرکزی حکومت میں بڑے افسر تھے' کلاس ۱ آفیسر اور ان کا معمول تھا کہ وہ روزانہ گھر سے تانگے میں بیٹھ کر دفتر جایا کرتے تھے۔ اسی لئے سارے تانگے والے "بابوجی" مشتاق مبارک اور ان کے گھر والوں کو خوب پہچانتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ہماری نانی کو بھی تانگے والے پہچانتے تھے۔ اور بالفرض محال اگر کسی تانگے والے نے نانی کو نہیں پہچانا۔ تو وہ خود اس سے کہہ دیتیں۔

"وے کاکا مینوں باؤ مشتاق دے گھر جٹ لین لے چل" ۔ (ارے بیٹا مجھے بابو مشتاق کے

گھر جٹ لائن لے چل) اس طرح نانی گوماں نے لائل پور سے کراچی تک ریل گاڑی کے کئی سفر تنہا بخیر و عافیت کیے۔

نانی گوماں بیک وقت بہت سی صلاحیتوں کی مالک تھیں' اتنی طویل عمر کی وجہ سے انہیں برصغیر (ہندوستان) کے کئی ادوار یاد تھے۔ اور بہت سے خود انہوں نے دیکھے بھی' انگریزوں کی برصغیر میں آمد کے واقعات اور سکھوں کا دور حکومت' یہ سب انہیں خوب یاد تھے' مختلف ادوار کے رسم و رواج' شاعری اور زندگی کے تجربات' ان تمام موضوعات پر نانی گوماں گھنٹوں گفتگو کیا کرتیں اور گھر کے بڑے یعنی ابا جی' اماں' بھائی مشتاق' بھائی جالب وغیرہ ہمہ تن گوش انہیں سنا کرتے تھے۔

میں اور محمود (مشتاق مبارک بھائی کا بڑا بیٹا) ہم دونوں چچا بھتیجے تقریباً ہم عمر ہیں' میں محمود سے چھ سات ماہ بڑا ہوں۔ ہم دونوں سردیوں کی راتوں میں نانی کے لحاف میں گھس جاتے' اور نانی سے کہانی سنانے کو کہتے۔

نانی کہانی

نانی کہانی سنا۔

نانی تو کسی کا کہا ٹالتی ہی نہیں تھیں۔ ہاں اگر بہت ہی موڈ خراب ہے۔ تو بات دوسری ہے۔ مگر ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا تھا۔

اچھا پت اچھا

یہ کہہ کر نانی کہانی سنانا شروع کر دیتیں۔ ہر کہانی کی ابتداء اس فقرے سے ہوتی تھی۔

اک سی بادشاہ۔ ساڈا' تہاڈا خدا بادشاہ تے اک چڑا چڑی سی (اور ایک چڑا چڑیا تھی)

وہی ایک کہانی' ایک بادشاہ اور چڑا چڑی' جس نے ساری دنیا کو پریشان کر رکھا ہے۔ ہر نانی کی طرح ہماری نانی گوماں بھی داستان گوئی کے فن میں ماہر تھیں۔ پہلے فقرے کی ادائیگی کے ساتھ ہی نانی گوماں سننے والوں کو اپنے حصار میں لے لیتی تھیں۔ چڑا چڑی دے جدوں بچے ہوئے' تاں انہاں نے ٹاہلی دے درخت تے آلنڑاں پالیا (چڑا' چڑی کے جب بچے ہوئے تو انہوں نے شیشم کے درخت پر گھونسلا بنا لیا)۔

کہانی سنانے کے دوران نانی حقے کا کش لینے کے لئے ذرا دیر کو رکا بھی کرتی تھیں۔

گڑ گڑ کی ہلکی سی آواز حقے سے نکلتی۔ جس کے نتیجہ میں معمولی سا ہوا برابر دھواں نانی کے منہ سے نکلتا' اور بس۔

اگے کی ہویا نانی (آگے کیا ہوا نانی)

میں اور محمود نانی سے بیتابانہ کہتے۔

صبر کرپت' صبر کر' سنا تاں رئیں آں (صبر کر بیٹا' صبر کر سنا تو رہی ہوں) جدوں چڑا' چڑی نے اپنے بچیاں لئی آلنڑاں پالیا' تے او' اوتھے رہن لگ پے' چڑا چڑی سارا دن دانے لے کے گھر آوندے بچے ماں پیو نوں دیکھ کے اپنے نکے نکے منہ کھول دیندے۔

گڑ گڑ۔

نانی چونکہ داستان گوئی کے فن سے خوب آشنا تھیں۔ اسی لئے وہ آج کے قسط وار دکھائے جانے والے ٹی وی ڈراموں کی طرح ایسی جگہ حقے کا کش لیتے ہوئے کہانی چھوڑتیں کہ سننے والا تڑپ کر رہ جائے۔

نانی اگے کی ہویا (نانی آگے کیا ہوا)

ہم نانی کو جھنجھوڑ ڈالتے۔

وے کاکا صبر کرو۔ (ارے بیٹا صبر کرو)

نانی اپنی اہمیت کا احساس دلاتے ہوئے کہتیں۔ ہم دونوں نانی کے اور ساتھ اور قریب ہو جاتے۔

ہاں' تاں میں سنا رہی سی' کہ چڑا' چڑی' اپنے بچیاں نال۔ خوشی خوشی ٹاہلی دے درخت تے رہ رہے سی' کہ اک دن راجہ اپنے سپائیاں (سپاہیوں) دے نال' جنگل وچ آ نکلیا' تے اوسے ٹاہلی دے درخت دے نیچے راجہ تاں اوہدے سپاہی گھوڑے لے کر کھڑے ہو گئے۔

راجہ نے اپنے شپائیاں نوں حکم دتا کہ ٹاہلی دے درخت نوں وڈ سٹو (کاٹ ڈالو) شپائیاں نے راجہ دا حکم سندے ای درخت نوں وڈنا شروع کر دتا۔ اے دیکھ کے چڑا' چڑی پریشان

ہوگئے۔ آخر چڑی نے راجہ دے اگے (راجہ کے سامنے) فریاد کیتی اور اب نانی جی باقاعدہ لحن میں چڑیا کی فریاد سنانا شروع کر دیتیں۔

وے راجہ

ٹاہلی میرے پیڑے

لک ٹنو ٹنو

مینہ آؤ بھج جان گے (بارش آئی تو بھیگ جائیں گے)

لک ٹنو ٹنو

وا' آؤ آؤ اڈ جان گے (آندھی چلی' تو اڑ جائیں گے' مر جائیں گے)

لک ٹنو ٹنو

نانی کے لحن میں چڑیا کی فریاد' کہانی کو عروج پر پہنچا دیتی۔ لاکھ کہانیاں' سنیں' پڑھیں' مگر جو مزا نانی گوماں کی چڑا چڑی کی کہانی میں ملا' وہ کہیں اور نہیں ملا۔

اسی طرح ایک بار میں اور محمود نانی کے لحاف میں گھسے ان سے کہانی سن رہے تھے۔ کہانی بھی جنوں بھوتوں والی

سردیوں کی رات اور گھر میں سوائے نانی اور ہم دونوں کے کوئی بھی نہ تھا۔ نانی کے فن داستان گوئی نے سارے جہان کے آسیبوں' اور جنوں' بھوتوں کو جمع کر رکھا تھا۔ کہانی عروج پر تھی۔ کہ دروازے پر کسی عورت کی آواز ابھری۔

ارے سعید

ارے ببے (محمود کا پیار کا نام)

آواز بڑی تیکھی اور لہجہ غصیلا تھا

ہم دونوں ہائے نانی کہہ کر ان سے لپٹ گئے۔

دروازے پر مسلسل کوئی عورت ہمارے نام لے کر ہمیں پکار رہی تھی۔

ارے سعید باہر آؤ۔

ارے ببے باہر آؤ

میں اور محمود سمجھتے تھے کہ یہ کوئی چڑیل ہے۔ جو ہمیں بلا رہی ہے۔ ڈر کے مارے ہم دونوں کا برا حال تھا' ادھر نانی اپنا ڈنڈا ہاتھ میں لے کر اٹھنے کی کوشش کر رہی تھیں تاکہ باہر جا کر اس چڑیل سے دو دو ہاتھ کر سکیں۔ مگر ہم نے نانی کو دبوچ رکھا تھا۔

نانی سانوں چھڈ کے نہ جائیں (نانی ہمیں چھوڑ کر مت جانا)

اب نانی اپنی چارپائی سے ہی اس چڑیل سے مخاطب ہو کر کہہ رہی تھیں۔

نی مینوں بلا' میرا ناں گوماں' مینوں سد (ارے مجھے بلا' میرا نام گوماں ہے مجھے بلا)

آوازیں مسلسل گھر کے دروازے سے آ رہی تھیں۔

ارے سعید' کہاں ہو باہر آؤ

ارے بچے کہاں ہو باہر آؤ

چڑیل بڑے ہی مرصع اردو لہجے میں ہمیں بلا رہی تھی اور ادھر ہماری نانی گوماں بھی پنجابی زبان و بیان کا اعلیٰ نمونہ پیش کر رہی تھیں

حرام جادیئے' اندر آجا' میرے کول (اری حرام زادی اندر آجا میرے پاس)

اور پھر ہم نے دیکھا۔ کہ سیاہ برقع پہنے۔ چڑیل اندر آ رہی تھی۔ اس کے قدموں کی آواز جوں جوں قریب آتی جا رہی تھی۔ ہمیں اپنا سانس رکتا ہوا سا محسوس ہو رہا تھا۔ نانی نے بھی "ناد علی" کا ورد شروع کر دیا تھا۔

اب تو چڑیل بالکل ہمارے سامنے کھڑی تھی اور وہ اب بھی کہہ رہی تھی۔

ارے سعید کہاں ہو۔

ارے بچے کہاں ہو۔

ہم دونوں تو نانی کے لحاف میں دبکے بیٹھے تھے۔ مگر نانی نے گھما کر چڑیل کے ڈنڈا مارا اور چیخ کر بولیں۔

چل دفع ہو جا۔ نکل جا۔ نانی آیات پڑھ پڑھ کر چڑیل پر پھونک رہی تھیں

ارے ارے نانی کیا کر رہی ہیں۔

یہ میں ہوں میں۔

چڑیل کی آواز مجھے کچھ کچھ مانوس سی لگ رہی تھی۔ میں نے ہمت کر کے لحاف میں سے منہ نکالا۔ تو ہمارے ایک دوست کی والدہ سامنے کھڑی تھیں۔ نانی مسلسل انہیں برا بھلا کہہ رہی تھیں یہ تو شکر ہے کہ خالص لکھنوی ہونے کی وجہ سے ہمارے دوست کی والدہ کو ہماری نانی کی خالص پنجابی سمجھ ہی نہیں آ رہی تھی۔ ورنہ بڑا خون خرابا ہوتا میں نے اپنے دوست کی والدہ کو سلام کیا اور نانی کے ڈنڈا مارنے پر معذرت چاہی۔ تو وہ بولیں

شاید نانی مجھے پہچانی نہیں۔

میں نے نانی کو بتایا کہ یہ ہمارے دوست کی والدہ ہیں مگر نانی میرے بیان سے مطمئن نظر نہیں آ رہی تھیں۔ اور مجھے کہہ رہی تھیں۔

پُت سعید ایدے پیراں کو دیکھ کِتے جنگل پیری تاں نئیں (بیٹا سعید اس کے پیروں کو دیکھ کہیں جنگل پیری تو نہیں)

نانی کی بات سن کر میں سرتاپا کانپ گیا اور میں نے اپنے دوست کی والدہ کے پیروں کو غور سے دیکھا۔ اور دل ہی دل میں شکر ادا کیا۔ کہ وہ حقیقت میں میرے دوست کی والدہ ہی تھیں۔

ارے سعید! راشد ابھی تک گھر نہیں آیا۔ شام کو تو تم لوگ اکٹھے ہی کھیل رہے تھے۔ میں اس کا پتہ کرنے آئی تھی۔

میرے دوست کی والدہ بولیں ہم نے راشد کے بارے لاعلمی کا اظہار کیا۔ اور پھر وہ نانی کو سلام کر کے چلی گئیں مگر نانی دیر تک ہمیں دم درود کرتی رہیں۔

نانی گو ماں کبھی کبھی بیمار بھی ہو جایا کرتی تھیں۔

"خود ساختہ بیمار"

ایسے میں وہ آنکھیں بند کر کے بے ہوش سی ہو کر لیٹ جاتیں۔ اس خاص موقع پر بچے نہیں۔ صرف بڑے ہی' جیسے ہمارے ابا جی' اماں بھائی مشتاق یا بھائی جالب ہی ان سے بات کیا کرتے تھے' اور ایسا جان بوجھ کر کیا جاتا تھا کہ نانی جی کے احساسات مجروح نہ ہوں اور ان کے دل میں خیال نہ آئے کہ میں بیمار ہوئی تو کسی بڑے نے مجھے پوچھا تک نہیں' بلکہ میری

بیماری کو بہانہ سمجھ کر بچوں پر ٹال دیا۔

نانی بیمار بے ہوش پڑی ہیں۔ اور ہمارے ابا جی بڑی فکر مندی کے ساتھ بے ہوش نانی جی کے کان کے قریب ہو کر ان سے پوچھتے۔

ہاں' تو اماں جی! دسو ہن کی علاج کریئے۔ (ہاں تو اماں جی بتائیں اب کیا علاج کریں۔)

بے ہوش نانی ابا جی کی بات سن کر انھیں ہاتھ کے اشارے سے قریب بلاتیں۔ اور پھر ابا جی اپنا کان نانی کے ہونٹوں کے بالکل قریب لے جاتے۔

جی' بولو اماں جی۔

اور پھر نانی گوماں ابا جی کے کان میں سرگوشی کے انداز میں اپنی دوا کے بارے میں بتاتیں۔

پا پکا گھی' سیر پکا دودھ' پا پکی جلیبیاں۔ (ایک پاؤ گھی۔ ایک سیر دودھ اور ایک پاؤ جلیبیاں)

ابا جی نانی کا نسخہ سمجھ کر سنجیدگی کے ساتھ ہٹتے اور نانی پھر بے ہوش ہو جاتیں۔

نانی کے بتائے ہوئے نسخے کے مطابق دوا تیار کی جاتی۔ سیر پکا دودھ' اس میں پاؤ پکا گھی' اور اس زمانے میں گھی کے معنی اصلی دیسی گھی کے ہوتے تھے بناسپتی گھی کو کوئی نہیں جانتا تھا۔ ان دونوں کو ملا کر گرم کیا جاتا اور پھر پاؤ پکی جلیبیاں اس میں شامل کر دی جاتیں۔ اب اس دوا کو ذرا دیر کے لئے ٹھنڈا ہونے کو رکھ دیا جاتا اور پھر ڈول نما برتن میں ڈال کر دوا نانی کے پاس لائی جاتی۔ ابا جی ایک مرتبہ پھر بے ہوش نانی کے کان میں کہتے۔

اماں جی! اٹھو دوا تیار ہو گئی آ۔

ماحول میں حقیقت کا رنگ بھرنے کو اماں' بھائی مشتاق اور بھائی جالب نانی کو سہارا دے کر اٹھاتے۔ اور پھر نانی ڈول منہ کو لگا کر ساری دوا غٹا غٹ پی جاتیں۔

دوا پیتے ہی نانی بالکل ٹھیک ٹھاک چاق و چوبند ہو جاتیں' اور ہاتھوں پر لگی دوا کو اپنے گلے پر ملتے ہوئی کہتیں۔

اصل وچ میرا معدہ خشک ہو گیا سی۔ ساریاں آندھڑاں (آنتیں) خشک ہو گیاں سی اللہ دا شکر آہن میں ٹھیک آں۔

ہمارے ابا' اماں کہا کرتے تھے کہ نانی گوماں کے قبضے میں جن تھے۔ یا جنوں کا ان پر سایہ

تھا۔ بہرحال نانی دواپی کر اسے ہضم بھی کر لیتی تھیں

نانی گوماں کو کھجوریں بھی بہت مرغوب تھیں۔ وہ کھجوریں گٹھلی سمیت کھایا کرتی تھیں اور اس بارے میں ان کا کہنا تھا کہ یہ سوہنے نبی دے دیس دا میوہ ہیں۔ لہٰذا گٹھلی زمین پر نہیں گرنا چاہئے۔ کھجوریں وہ بہت کھاتی تھیں۔ ایک وقت میں سیر دو سیر کھجوریں کھا جاتی تھیں۔ وہ اکثر اپنی زبان دکھا کر کہا کرتیں تھیں۔

دیکھو۔ میری زبان تے کھجور دا درخت بنا ہویا اے۔

اور واقعی ان کی زبان کے بیچوں بیچ ایک گہری لکیر سی حلق کے اندر کو جاتی ہوئی موجود ہوتی تھی اور اس لکیر کے دونوں طرف کھجور کے درخت کی مانند لکیریں موجود ہوتی تھیں۔

نانی میں زور بھی بہت تھا۔ وہ اگر کسی کا ہاتھ پکڑ لیتی تھیں۔ تو ہاتھ چھڑانے کے لئے خاصا زور لگانا پڑتا تھا۔

جالب بھائی سے نانی کو بہت پیار تھا۔ بلکہ عشق تھا۔ اور نانی جالب بھائی کو "سانوریا" بھی کہا کرتی تھیں' اکثر ایسا ہوا کہ جالب بھائی ابھی گھر سے ڈھائی تین میل دور صدر ایمپریس مارکیٹ کے پاس ہیں اور نانی ان کے قدموں کی چاپ سن لیا کرتی تھیں اور پھر کہتیں میرا حبیب آرہا ہے۔ اور پھر کچھ ہی دیر بعد واقعی جالب بھائی گھر آجاتے۔

جالب بھائی "ظاہرہ" بھی بہت خوب صورت تھے۔ اور نانی بھی ان کے حسن کی معترف تھیں مگر میں سوچا کرتا تھا کہ بھلا نانی کو کیا معلوم کہ کون حسین ہے اور کون نہیں اس بارے میں ابا جی کہا کرتے تھے کہ نانی گوماں بہ باطن بینا ہیں۔

جب جالب بھائی کی شادی ہوئی۔ تو ان کی دلہن (آپا تاج) سلام کے لئے نانی کے پاس لائی گئیں۔ نانی نے دعائیں دیں اور پھر دلہن کے چہرے پر ہاتھ پھیرنے میں مصروف ہو گئیں۔ ناک' آنکھیں' ماتھا' رخسار' تھوڑی' گردن' سر اور بال نانی جائزہ لے چکیں' تو ان سے دلہن کے بارے میں پوچھا گیا۔ کیسی ہے دلہن؟ مگر نانی کچھ نہ بولیں اور خاموش رہیں۔ جب بہت اصرار کر کے نانی سے دلہن کے بارے میں پوچھا گیا تو نانی نے یہ کہہ کر آپا تاج کو رد کر دیا۔

کہاں میرا سانوریا اور کہاں یہ بد شکل تاج

نانی کا تبصرہ سن کر آپا تاج (بیگم حبیب جالب) ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہو رہی تھیں۔ ہنستے ہنستے وہ رکیں۔ اور نانی سے کہا چلو نانی۔ میں سوہنی نہ سہی۔ میرا میاں تو سوہنا ہے۔

اس پر نانی تنک کر بولیں۔

نی شکر کر دھن بھاگ تیرے کہ حبیب ورگا میاں تینوں ملیا۔ (اری شکر کر۔ کیا اچھے نصیب ہیں تیرے کہ حبیب جیسا شوہر تجھے ملا)

آپا تاج نے نانی کی بہت خدمت کی۔ اور نانی سے بہت دعائیں لیں۔

نانی گوماں کو پرانی شاعری بھی خود یاد ہوتی تھی۔ جسے وہ اپنے انداز' اپنے لہجے میں سنایا کرتی تھیں۔

ہم نے دل صنم کو دتا پھر کسی کو کیا
دتا تو دتا آپے دتا پھر کسی کو کیا
ہم نے دل صنم کا بھونا پھر کسی کو کیا
بھونا تو بھونا آپے بھونا پھر کسی کو کیا
ہم نے دل صنم کا ساڑا پھر کسی کو کیا
ساڑا تو ساڑا آپے ساڑا پھر کسی کو کیا

انتقال سے ایک سال قبل ۱۹۵۹ء میں نانی گوماں ایک مرتبہ لاہور آئیں۔ اس زمانے میں وہ ہر وقت اپنے ریشم جیسے سفید بالوں پر ہاتھ پھیر پھیر کر کچھ جھاڑتی رہتیں تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ ابرک یعنی چاندی ان کے بالوں سے جھڑ رہی ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ ہاں ان کے بال آہستہ آہستہ کالے ضرور ہونا شروع ہو گئے تھے۔ انہی دنوں میں ایک بار اداکار علاؤ الدین ہمارے ہاں آئے۔ صحن میں نانی کی چارپائی تھی۔ اصل میں جالب بھائی کا گھر بھی کیا تھا۔ بس ایک کمرے کا گھر۔ علاؤ الدین صاحب کو نانی نے اپنی چارپائی پر ہی بٹھالیا۔ اور اپنے بالوں کے ابرک جھاڑ جھاڑ کر ان کی ہتھیلی پر رکھنا شروع کر دیئے۔ اور پھر بولیں۔

وے کاکا! میرے گھر والے میری گل نئیں مندے۔ آہن توں ابرک ایناں نوں دکھا۔

(ارے بیٹا میرے گھر والے میری بات نہیں مانتے' اب تو یہ ابرک ان کو دکھا) علاؤ الدین صاحب کو جالب بھائی نے اشارے سے سمجھا دیا تھا اور وہ خود بھی بڑے اداکار تھے۔ لہٰذا وہ نانی کی چارپائی سے یہ کہتے ہوئے اٹھے۔

اوہو نانی جی! میرے ہتھ بھر گئے۔ میں ذرا ابرک باہر سٹ آواں (اوہو نانی جی میرے ہاتھ تو بھر گئے ہیں۔ میں ذرا ابرک باہر پھینک آؤں۔)

اللہ تیرا بھلا کرے۔ جیوندا رو! (زندہ رہو)

نانی نے علاؤ الدین صاحب کے تائیدی بیان پر انہیں دعا دی۔ اسی طرح ایک بار حمایت علی شاعر بھی نانی کے قابو آ گئے تھے۔ اور وہ منظر بھی دیکھنے کے قابل تھا۔ حیدر آباد دکن اور پنجاب کی تہذیبوں کا ملاپ۔

نانی لاہور سے کراچی جانے لگیں۔ تو سب سے گلے مل کر بولیں۔

لو بھئی ساڈا آخری پھیرا سی۔ اللہ حافظ۔ (لو بھئی ہمارا آخری چکر تھا۔ خدا حافظ)

اس وقت کسی نے بھی نانی کے فقرے کا نوٹس نہیں لیا۔ شاید موت کا لفظ نانی کے حوالے سے ہمارے ذہنوں سے محو ہو چکا تھا۔ نانی لاہور سے کراچی آ گئیں۔ وہ بالکل تندرست تھیں۔ آخری رات بھی وہ حسب عادت اپنے وفات پا جانے والے اعزا' سے باتیں کر رہی تھیں' اس رات بھائی مشتاق کو بخار تھا۔ نانی مسلسل بول رہی تھیں۔ نانی ہن سو جا (نانی اب سو جاؤ) بھائی مشتاق نانی سے بولے۔

بھائی مشتاق کی بات سن کر نانی نے ان سے کہا۔ ہاں پت ہن سونڑاں ای آ۔ پر توں ڈریں ناں (ہاں بیٹا! اب سونا ہی ہے مگر تم ڈرنا نہیں)

یہ کہہ کر وہ خاموش لیٹ گئیں۔ گھر میں خاموشی چھا گئی۔

رات میں نانی کی سرگوشیوں کی مدھم مدھم آواز کا گھر عادی ہو چکا تھا۔ برسوں کا معمول تھا' نانی کی خاموشی کچھ اچھی نہیں لگ رہی تھی' بھائی مشتاق کے دفتر کے ملازم محمد بخش نے چائے بنائی' رات کا پہلا ہی پہر تھا' حمید بھائی بھی اردو کالج (نائٹ شفٹ) سے گھر آ چکے تھے۔ انہوں نے نانی کو خاموش بے سدھ سوتے دیکھا' تو انہیں بھی عجیب سا لگا۔ محمد بخش چائے کا

پیالہ لے کر نانی کے پاس گیا۔

نانی، لو چائے پی لو۔ محمد بخش نے نانی کی چارپائی کے قریب جا کر کہا مگر وہاں تو مکمل خاموشی تھی۔ اسے کچھ شک سا گزرا۔ محمد بخش نے غور سے نانی کو دیکھا، اور پھر اس کا شک یقین میں بدل گیا۔ اس نے بھائی مشتاق کو جگایا۔

صاحب، اٹھو۔

صاحب جی اٹھو۔

نانی گزر گئی۔

مشتاق بھائی بخار میں تپ رہے تھے۔ ہڑبڑا کر اٹھے، دیکھا تو واقعی نانی گزر چکی تھیں۔

لاہور میں نانی کی موت کی اطلاع بذریعہ تار موصول ہوئی۔ تو اماں ابا اور جالب بھائی فوراً کراچی کے لئے روانہ ہو گئے، ادھر کراچی میں مشتاق بھائی اور حمید بھائی تدفین کے انتظامات میں مصروف تھے۔ ہمارے خالہ زاد بھائی منیر اور خالہ زاد بہن بشیر بیگم کے صاحبزادے ضمیر بھی تدفین کے دن موجود تھے۔ نانی گوماں کی وصیتیں مشتاق بھائی کو یاد آ رہی تھیں۔

۱۔ میری موت پر خوشی کے اظہار کے طور پر ڈھول تاشے بجائے جائیں۔

۲۔ میری میت کو کوئی غیر ہاتھ نہ لگائے۔

۳۔ میری تدفین کے بعد، دوبارہ کوئی بھی میری قبر پر نہ آئے۔

نانی گوماں تو واقعی حوصلہ مند اور باہمت تھیں کہ اپنی موت کا جشن مناتیں، مگر مشتاق بھائی اس درجہ حوصلہ مند نہیں تھے۔ نانی نے ایک دن کو بیمار پڑ کے بھی کسی کی خدمت کا احسان اپنے سر نہ لیا اور ۱۳۰ سال کی عمر میں چلتے قدموں اس جہان فانی سے رخصت ہوئیں۔

نانی گوماں کا انتقال ۱۹۶۰ء میں ہوا۔ اور انہیں سوسائٹی (پی ای سی ایچ ایس) کے قبرستان میں دفن کیا گیا۔

ان کی وصیت کے خلاف جب گھر والے دوسرے روز قبرستان گئے۔ تو وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ قبر کا نام و نشان دور دور تک نہیں تھا۔ سوائے چٹیل زمین کے اطراف میں بھی کوئی تازہ

قبر نہیں تھی۔

سب پھٹی پھٹی آنکھوں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ قبرستان کا سناٹا اور گہرا ہو گیا تھا۔ اور سب خاموش کھڑے نانی گوماں کی آواز سن رہے تھے جیسے وہ کہہ رہی ہوں۔ ”میں منع کیتا سی! کہ میری قبرتے نہ آنا......“ (میں نے منع کیا تھا کہ میری قبر پر مت آنا)

مگر نانی! قبریں دلوں میں بھی تو بن جاتی ہیں۔

شورش کاشمیری کی جوہر شناس نگاہیں

۱۹۶۱ء میں ہفت روزہ ”چٹان“ کے کسی شمارے کے ٹائٹل پر شورش کاشمیری صاحب نے جالب بھائی کی تصویر اس عبارت کے ساتھ شائع کی تھی۔ ”جواں سال شاعر حبیب جالب جو اپنے ہم عصروں کی صفوں کو چیرتا ہوا بڑی تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے“ اور پھر اگلے ہی سال ۱۹۶۲ء میں شاعر حبیب جالب نے جنرل ایوب خان کے خود ساختہ آئین کے خلاف پہلی آواز بلند کی۔

دیپ جس کا محلات ہی میں جلے
چند لوگوں کی خوشیوں کو لے کر چلے
وہ جو سائے میں ہر مصلحت کے پلے
ایسے دستور کو، صبح بے نور کو

۱۹۶۱ء میں ”چٹان“ کے پہلے صفحہ پر یہ تصویر شائع ہوئی
جسے شورش کاشمیری بانی ایڈیٹر چٹان نے خود بنوایا تھا

میں نہیں مانتا' میں نہیں جانتا

یہ نظم کیا تھی' ایک طوفان تھا کہ جس کے سامنے کوئی آمر' کوئی جابر ٹھہر ہی نہ سکا۔ اس نظم پر سب سے بہترین تبصرہ ۱۹۶۲ء کے دستور کے خالق اور ممتاز قانون داں منظور قادر صاحب کا ہے۔ مرحوم نے جب اس نظم کے بارے میں سنا' تو فوراً اپنے دوست ملک غلام جیلانی صاحب کو بلوایا' جیلانی صاحب' جب منظور قادر صاحب کے بنگلے پہنچے تو دیکھا۔ کہ وہ بڑی پریشانی کے عالم میں ٹہل رہے ہیں جیلانی صاحب نے پوچھا۔

جناب خیریت تو ہے؟

منظور قادر بولے! ہمیں اپنا دستور اب چلتا دکھائی نہیں دے رہا۔ کیونکہ حبیب جالب' جب لاکھوں کے مجمع میں اپنی نظم دستور پڑھتا ہے۔ تو اس کے ساتھ لاکھوں انسان بیک زبان ہو کر کہتے ہیں۔

میں نہیں مانتا' میں نہیں جانتا

آٹے کا کنستر خالی تھا

جالب بھائی منتخب فلموں کے گیت لکھا کرتے تھے ۶۲۔۱۹۶۱ء میں سلیم رضا بہت مقبول گلوکار تھے۔ اس زمانے میں آگے پیچھے سلیم رضا کے جو مقبول فلمی گیت آئے۔ اتفاق سے وہ سب جالب بھائی کے لکھے ہوئے تھے۔

۱۔ بنا کے میرا نشیمن جلا دیا تو نے۔ فلم دو راستے

۲۔ میرے دل کی انجمن میں تیرے غم سے روشنی ہے۔ فلم قیدی

۳۔ اس شہر خرابی میں غم عشق کے مارے۔ فلم موسیقار

۴۔ بھول جاؤ گے تم کرکے وعدہ صنم۔ فلم سیما

ہماری رہائش ساندہ خورد ہی میں تھی' وہی ایک کمرے والا تیس روپیہ ماہانہ کا گھر۔ پولیس والے' اور "دوسرے" حکومتی کارندوں نے ہمارے گھر کے چکر کاٹنا شروع کردیئے تھے۔ گھر

کی ذمہ داریاں نبھانے کی خاطر بھائی فلم کے گیت لکھتے تھے۔ یہ ان کے روزگار کا ذریعہ تھا۔ ان دنوں وہ فلم ''یہودی کی لڑکی'' کے گیت لکھ رہے تھے۔ اس فلم کے موسیقار مصلح الدین' لاہور ہوٹل (جو اب ٹوٹ چکا ہے) میکلوڈ روڈ لاہور کے ایک کمرے میں رہا کرتے تھے۔

ایک دن بھائی گھر سے جانے لگے۔ تو بھابی نے کہا۔ کہ آج گھر میں آٹا بھی نہیں ہے۔ بھائی نے یہ سنا۔ تو مجھے اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ اور بھابی سے بولے کہ میں سعید کو ساتھ لے جاتا ہوں آج فلم کا گانا لکھنا ہے۔ گانا لکھ کر پیسے سعید کے ہاتھ بھجوادوں گا۔

میں بھائی جالب کے ساتھ چل دیا۔ ہم لاہور ہوٹل پہنچے' جہاں فلم کے موسیقار مصلح الدین رہتے تھے۔

آیئے جالب صاحب' مصلح الدین اور فلم کے پروڈیوسر نے بھائی کا استقبال کیا۔ میں بھی ایک طرف بیٹھ گیا۔ اس وقت میں آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا۔

بھائی صاحب گیت کے مکھڑے کے لئے لائنیں لکھ رہے تھے۔ موسیقار مصلح الدین' ان لائنوں کو ہارمونیم کے ساتھ گا کر جائزہ لے رہے تھے۔ مگر مصلح الدین صاحب کچھ مطمئن نظر نہیں آ رہے تھے۔ اور وہ بار بار جالب بھائی سے کہتے بات نہیں بن رہی ہے۔

اس پر جالب بھائی دوسری' تیسری' چوتھی' لائنیں لکھتے لفظ تبدیل کرتے۔

پھر موسیقار مصلح الدین ہارمونیم کے ساتھ گا کر کہتے جالب صاحب بات نہیں بن رہی ہے۔

جالب صاحب پھر'' مصلح الدین کی ڈیمانڈ پوری کرنے کی کوشش میں مصروف ہو جاتے۔

ایک بار قسمت کا مارا پروڈیوسر بھی بول پڑا۔

جالب صاحب بات نہیں بن رہی ہے۔

بس پروڈیوسر صاحب کا اتنا کہنا تھا۔ جالب صاحب نے یہ بڑی بڑی آنکھیں پروڈیوسر کے چہرے پر جمادیں۔

غالب کا کوئی شعر سناؤں؟

جالب صاحب نے قلم ایک طرف رکھ دیا' اور پروڈیوسر کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے سوال

کے جواب کا انتظار کرنے لگے۔ پروڈیوسر صاحب پریشان ہو گئے۔ انہیں غالب کا شعر یاد ہوتا تو سناتے۔

جالب بھائی کا غصے کے مارے برا حال ہو گیا۔

جب تمہیں غالب کا کوئی شعر ہی یاد نہیں' تو تم نے یہ کیسے جان لیا کہ "بات نہیں بن رہی ہے۔"

یہ کہا۔ اور جالب بھائی اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

بھئی کسی اور شاعر کو بلاؤ۔ میں گیت نہیں لکھوں گا۔

پروڈیوسر بیچارہ خاموش تھا۔ اور موسیقار مصلح الدین جالب صاحب کو منانے میں مصروف تھے۔

جالب صاحب چھوڑیئے' وہ اب درمیان میں نہیں بولے گا۔ مگر جالب بھائی کسی صورت رضامند ہی نہیں ہو رہے تھے۔ اور اس وقت میری نظروں میں آٹے کا خالی کنستر گھوم رہا تھا۔ آخر جالب بھائی اس بات پر گیت لکھنے کے لئے رضامند ہوئے۔ کہ پروڈیوسر صاحب اٹھ کر چلے جائیں اور پھر پروڈیوسر بیچارہ اٹھ کر چلا گیا۔ بھائی نے گیت مکمل کیا۔ اور میں پیسے لے کر گھر آیا۔

موسیقار نذیر علی کو سو روپے انعام کے مل گئے

فلم نگر میں بھی جالب صاحب کا اپنا مخصوص امیج تھا۔ مقام تھا' بعض اوقات فلم کا کوئی گیت کہانی کے ایسے موڑ پر پروڈیوسر' ڈائریکٹر کو لے آتا کہ جہاں وہ لوگ فلم کا سارا کام روک دیتے اور کہانی کو آگے بڑھانے کے لئے جالب صاحب کی تلاش شروع ہو جاتی۔ ایسا ہی ایک واقعہ موسیقار نذیر علی نے سنایا۔

میں جالب بھائی کے ساتھ تھا۔ اور ہم ایورنیو اسٹوڈیوز لاہور گئے ہوئے تھے۔ سامنے سے موسیقار نذیر علی آ رہے تھے۔ وہ جالب صاحب کو دیکھ کر رک گئے۔ سلام کیا' اس وقت نذیر

علی بطور موسیقار بڑے مصروف تھے۔ ان کا ایک گیت بہت مشہور تھا۔

سیونی میرا ماہی میرے بھاگ جگاون آگیا۔

موسیقار نذیر علی واقعہ سنانے لگے۔

۱۹۶۱ء میں میں موسیقار منظور اشرف کا اسسٹنٹ ہوا کرتا تھا۔ فلم "کون کسی کا" بن رہی تھی۔ جس کے تھیم سانگ کے لئے۔ فلم کے پروڈیوسر' ڈائریکٹر' کئی دنوں سے جالب صاحب کو تلاش کر رہے تھے۔ مگر وہ نہیں مل رہے تھے۔ آخر ایک دن انہوں نے مجھے کہا۔ کہ اگر تم جالب صاحب کو پکڑ کر لے آؤ تو علاوہ خرچے کے تمہیں سو روپیہ انعام بھی دیں گے۔ سو روپیہ اس زمانے میں مجھ جیسے غریب کے لئے بڑی رقم تھی۔ للذا میں نے حامی بھرلی۔ اور جالب صاحب کے گھر کے باہر بیٹھ گیا۔ سارا دن میں جالب صاحب کے گھر کے باہر بیٹھا رہا حتیٰ کہ سورج غروب ہوگیا' رات آگئی۔ اور پھر رات بھی گزرنے لگی۔ آخر رات گئے ایک ڈیڑھ بجے ایک رکشہ آکر رکا میں نے دیکھا جالب صاحب رکشے سے اتر رہے تھے میں تیزی سے جالب صاحب کے پاس گیا' انہیں سلام کیا اپنا تعارف کروایا۔ اور عرض کیا کہ فلم کے پروڈیوسر ڈائریکٹر اور موسیقار اسٹوڈیوز میں موجود ہیں۔ اور آپ کے منتظر ہیں۔ جالب صاحب میری بات سن کر بولے۔ اچھا ٹھیک ہے' میں صبح اسٹوڈیو پہنچ جاؤں گا۔ جالب صاحب کی بات سن کر میں نے پھر عرض کیا کہ حضور اگر آپ ابھی میرے ساتھ چلیں گے۔ تو مجھے سو روپے انعام کے مل جائیں گے۔ میری بات سن کر جالب صاحب اسی رکشے میں میرے ساتھ دوبارہ بیٹھ گئے۔ جس میں وہ آئے تھے۔ میں جالب صاحب کو لے کر اسٹوڈیو پہنچا۔ فلم کے پروڈیوسر ڈائریکٹر اور موسیقار اپنے دفتر میں بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔ وہ لوگ جالب صاحب کو دیکھ کر خوش ہوگئے اور مجھے میرے انعام کے سو روپے مل گئے۔ اور پروڈیوسر کو فلم "کون کسی کا" کے لئے گیت مل گیا کہ جو اپنے زمانے کا "اسٹریٹ سانگ" تھا۔

دے گا نہ کوئی سہارا

ان بے درد فضاؤں میں

سوجا غم کی چھاؤں میں

ملکہ ترنم نور جہاں

رہ گذاروں میں نور بکھرا ہے
وہ ادھر سے گزر گئے ہوں گے

جالب بھائی رات گئے جب بھی گھر آتے' تو ان کی عادت تھی کہ وہ باہر سے ہی میرا نام لے کر مجھے پکارتے۔

اوئے سعید!

سعید اوئے!

اور پھر کبھی مجھے یا کبھی بھابی کو دروازہ کھولنے کے لئے اٹھنا پڑتا۔

ایک رات اسی طرح میں بھائی کی آواز پر دروازہ کھولنے کے لئے اٹھا' یہی رات کے دو بجے کا وقت ہو گا۔ میں نے نیند ہی میں دروازہ کھولا' باہر کوئی بھی نہیں تھا۔ مگر بہت ہی مسحور کن خوشبو سے پوری گلی مہک رہی تھی۔ یک لخت میری نیند اڑ گئی اور میں خوف زدہ سا گھر کے اندر بھاگا۔

آپا تاج! اٹھو۔

میں نے بھابی کو جگایا۔

کیا بات ہے؟ بھابی نیند ہی میں بولیں۔

آپا تاج! بھائی کی آواز آئی تھی۔ مگر وہ باہر نہیں ہیں اور پوری گلی خوشبو سے مہک رہی ہے۔

میری بات سن کر بھابی اٹھ بیٹھیں۔

کیا کہہ رہے ہو۔

وہ دوپٹہ سنبھالتے ہوئے اٹھیں۔ اور ہم دونوں باہر گلی میں آ گئے۔ پوری گلی خوشبو سے مہک رہی تھی گلی کے نکڑ پر ایک لمبی کار کھڑی نظر آ رہی تھی۔ ہم دونوں خوشبو کے تعاقب

میں آگے بڑھتے رہے' اب لمبی کار ہمارے سامنے تھی' جس کی پچھلی سیٹ پر بھائی کسی خاتون کے ساتھ بیٹھے تھے۔ بھابی تو واپس جا چکی تھیں۔ میں اور آگے بڑھا' کار بے پناہ روشن تھی' رنگ و نور چھن چھن کر کار سے باہر آ رہا تھا۔ اب بھائی کار کا دروازہ کھول کر باہر آ رہے تھے۔ وہ خاتون بھی ان کے ساتھ باہر آ گئیں' رنگ و نور اور مسحور کن مہک سے پوری فضا معطر تھی۔ وہ خاتون بھائی کو بہت پیار و خلوص سے خدا حافظ کہہ رہی تھیں۔ میں نے دیکھا وہ نور جہاں تھیں' ملکہ ترنم نور جہاں۔

ریاض شاہد

"فلم بھروسہ" لاہور میں جالب صاحب کی بحیثیت نغمہ نگار پہلی فلم تھی' اس فلم کے پروڈیوسر' ڈائریکٹر جعفر شاہ بخاری تھے۔ ریاض شاہد کی بھی بحیثیت کہانی نویس پہلی فلم "بھروسہ" ہی تھی۔

اس کے بعد ریاض شاہد اور جالب بھائی نے پاک فلم انڈسٹری کو بہت سی یادگار فلمیں دیں۔ نئی سوچ دی۔ اور پھر ریاض شاہد اسی کی نذر ہو بھی گئے۔

فلم نگر کا ایک دور تھا کہ جب خلیل قیصر' ریاض شاہد' علاؤ الدین' طالش' رشید عطرے' ساقی' حسن شاہ اور جالب صاحب یہ وہ نام ہوا کرتے تھے کہ جن سے فلم بین سامراج دشمن "موضوع پر بنی ہوئی فلم ہی کی توقع رکھا کرتے تھے۔ اور یہ گروپ اپنے فلم بینوں کی توقعات پر ہمیشہ پورا اترتا بھی تھا اور انہوں نے انہیں کبھی مایوس نہیں کیا تھا۔ شہید' فرنگی' کلرک' زرقا' بہشت اور یہ امن اس کی زندہ و تابندہ مثالیں ہیں۔

ایک بار جالب صاحب کے ساتھ اسٹوڈیوز جانا ہوا' اس وقت زرقا بن رہی تھی۔ سیٹ پر شوٹنگ ہو رہی تھی۔ اور جالب صاحب اندر داخل ہو گئے۔ سیٹ کے دروازے پر کھڑے لوگ بھلا جالب صاحب کو کیسے روکتے۔ نہ انہوں نے روکا اور نہ ہی وہ رکے۔

کیا ہو رہا ہے؟

جالب صاحب نے سیٹ پر داخل ہوتے ہوئے کہا۔

بھئی یہ فالتو لوگ کیسے اندر آجاتے ہیں۔

ریاض شاہد نے انجان بنتے ہوئے آواز لگائی۔

اوئے چٹے۔ کیا بکواس کر رہے ہو!

جالب صاحب نے ریاض شاہد صاحب کو آڑے ہاتھوں لیا۔

اوہو! آپ ہیں جالب صاحب!

میں سمجھا' پتہ نہیں کون اندر گھس آیا۔

شوٹنگ بند ہو گئی۔ عوامی اداکار علاؤ الدین' عربی لباس پہنے' آنکھوں پر سیاہ چشمہ لگائے ہوئے' کردار نگاری میں مصروف تھے۔ مگر جالب صاحب آگئے تو پوری' فضا ہی بدل گئی۔

ریاض شاہد' سیٹ پر موجود ایک مہمان سے جالب صاحب کا تعارف کرواتے ہوئے بولے۔

جناب ان سے ملئے۔ آپ کو اکثر جن کی تلاش رہتی ہے حبیب جالب۔

اور یہ ہیں گوجرانوالہ کے ایس پی۔

جالب صاحب اور سپرنٹنڈنٹ پولیس نے آپس میں مصافحہ کیا۔

ریاض شاہد بوسکی کی قمیض اور کریم کلر کی پتلون پہنے ہوئے تھے۔ کہ یہ ان کا پسندیدہ رنگ تھا۔ سرخ و سفید رنگت والا ریاض شاہد اس لباس میں بہت خوبصورت لگا کرتا تھا۔ اپنی کہانی' مکالمے' منظر نامہ' شاعری' ڈائریکشن اور محبتیں' ریاض شاہد سب کچھ اپنے ساتھ ہی لے گیا۔ ریاض شاہد کے بعد جالب بھی کس کے لئے گیت لکھتا کون تھا' اس کے مصرعوں کو سمجھنے والا...

اور پھر یہ گروپ کبھی اکٹھا نہ ہو سکا۔

ہمیں یقین ہے ڈھلے گی اک دن
ستم کی یہ شام اے فلسطین
اے فلسطین

زرقا کے اس پیغام میں جالب' علاؤ الدین' ریاض شاہد اور رشید عطرے شامل تھے۔

جواب نہیں ہیں۔

ظلم رہے اور امن بھی ہو
کیا ممکن ہے تم ہی کہو

اور پھر "یہ امن" کے اس تھیم سانگ میں اپنے خون سے حقیقت کا رنگ بھرنے والا ریاض شاہد بلڈ کینسر کی نذر ہو گیا۔

بیٹھنا اعتکاف میں میرا

۱۹۶۴ء میرا میٹرک کا سال تھا' سردیوں کا زمانہ تھا اور ۱۹۶۳ء کا دسمبر' مارچ ۱۹۶۴ء میں امتحان تھا میں خوب پڑھائی کر رہا تھا۔ رمضان کا مہینہ تھا۔ گھر کے قریب ہی مدینہ مسجد تھی۔ جہاں میں نماز پنجگانہ ادا کرنے جاتا تھا اکثر اذان بھی میں دے دیا کرتا تھا چونکہ امتحان اور پھر میٹرک کا امتحان قریب تھا۔ للٰذا نماز روزہ پر بہت ہی زور تھا' روزے پورے چل رہے تھے۔ رمضان کا آخری عشرہ آیا' تو میں اعتکاف میں بیٹھ گیا۔ میرے والد صاحب صوم و صلوٰۃ کے بہت پابند تھے۔ وہ میرے اعتکاف میں بیٹھنے پر بہت خوش تھے۔

اعتکاف کی میری پہلی ہی رات تھی' میں نوافل پڑھ کر فارغ ہوا اور ذرا کمر سیدھی کرنے کے لئے ٹیک لگائی ہی تھی۔ کہ بھائی جالب صاحب کی آواز مجھے سنائی دی۔ وہ مجھے پکار رہے تھے۔

میں نے مسجد کی گھڑی کو دیکھا' رات کے دو بجے تھے۔ جالب بھائی کی آوازیں قریب آتی جا رہی تھیں۔ اب والد صاحب کی آواز بھی میں بخوبی سن رہا تھا۔ سردیوں کی ٹکی ہوئی رات۔

اباجی' اور بھائی جالب کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔

اب مسجد کا دروازہ بری طرح بج رہا تھا۔

دروازہ کھولو

دروازہ کھولو

جالب بھائی چیخ رہے تھے۔

میں مسجد سے اور مولوی صاحب اپنے حجرے سے نکل آئے۔ میں نے مسجد کا دروازہ کھولا جالب بھائی مجھ سے لپٹ گئے۔

وہ رو رہے تھے۔

میں اعتکاف کی وجہ سے خاموش تھا۔

ابا جی' بھائی جالب کو برا بھلا کہتے ہوئے انہیں مجھ سے علیحدہ کر رہے تھے۔

او سعید! تو ٹھیک ہے۔

بیٹا تو بولتا کیوں نہیں۔ میری بات کا جواب دے۔

بھائی صاحب میرے چہرے کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔

اوئے حبیب! ہٹ پیچھے یہ حالت اعتکاف میں ہے یہ کسی سے بات نہیں کرے گا۔

ابا جی نے جالب بھائی کو سمجھانے کی کوشش کی۔

مگر جالب بھائی کو ابا جی کی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

آخر جالب بھائی میرے ساتھ ہی مسجد میں بیٹھ گئے۔ اور بولے میں بھی سعید کے ساتھ مسجد ہی میں رہوں گا۔

ابا جی نے پھر بھائی کو سمجھایا۔

دیکھ حبیب! اللہ نے یہ ہمیں بڑی سعادت بخشی ہے کہ ہمارا بچہ سعید اعتکاف میں بیٹھا ہے۔ تم گھر چلو اسے دس دن اسی جگہ مسجد میں تنہا' عبادت الٰہی میں گزارنا ہیں۔

دس دن کا سن کر بھائی صاحب' ابا جی اور امام مسجد صاحب کے پاؤں پڑ گئے۔

خدا کے لئے ابا جی۔

رسول اللہ کا واسطہ ہے مولوی صاحب۔

میرے بھائی کو چھوڑ دو۔

اس کی جگہ میں مسجد میں دس دن بیٹھوں گا۔ مولوی صاحب بھی پریشان تھے۔

دیکھئے جناب' اعتکاف کی نیت آپ کے چھوٹے بھائی نے کی ہے۔ وہی اعتکاف میں دس

دن گزارے گا۔

مولوی صاحب نے مسئلے کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

اچھا مولوی صاحب! تو مجھے بھی اس کے ساتھ رہنے کی اجازت دیں۔

بھائی صاحب نے مولوی صاحب کے آگے پھر ہاتھ جوڑ دیئے۔

نہیں جناب! یہ اکیلے ہی اعتکاف میں بیٹھیں گے۔

اچھا مولوی صاحب' آپ آرام کریں۔

والد صاحب نے بھی مولوی صاحب سے کہا۔

ابا جی اس بات سے بھی گھبرا رہے تھے کہ کہیں مولوی صاحب' بھائی صاحب کی کیفیت کو نہ بھانپ لیں۔

اب ابا جی اور بھائی جالب میرے پاس رہ گئے اور بھائی جالب سرگوشی کے انداز میں ابا جی سے کہہ رہے تھے۔

ابا جی! اس بچے کو ابھی بہت کچھ سوچنا ہے۔ کرنا ہے آپ ابھی سے اس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں کو کیوں سلب کرنا چاہتے ہیں۔ اس بچے پر رحم کھائیں اسے ابھی دنیا میں بہت کچھ کرنا ہے۔ اس کا رستہ مت روکیں۔

یہ ظلم ہے۔

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ہماری اماں بھی آگئیں۔ اور اماں سے ہم سب بہت ڈرتے تھے۔

اماں نے آتے ہی دو تین جالب بھائی کے لگائیں اور انہیں گھر لے گئیں۔

اعتکاف کے دس دن جالب بھائی نے سولی پر کاٹے۔ وہ روزانہ نماز مغرب کے بعد میرے پاس مسجد میں آجاتے' میرے لئے' پھل لاتے۔ میرے ساتھ کھانا کھاتے۔ کچھ دیر بیٹھتے اور پھر جاتے ہوئے پوچھتے اب کتنے دن رہ گئے۔ اعتکاف کے دوران' میں نے ختم قرآن کے علاوہ مولانا احمد علی کے رسالے خدام الدین کے کئی شمارے پڑھ ڈالے۔ احادیث کی کتابیں پڑھیں اعتکاف کے بعد جب میں گھر گیا" تو مجھے آپا تاج (بھابی) نے بتایا کہ اعتکاف کی پہلی

رات' تیرے بھائی رات گئے آئے تو انہوں نے حسب عادت تمہارا نام لے کر تمہیں پکارا اور جب خلاف معمول ابا جی نے دروازہ کھولا۔ تو تمہارے بھائی نے ابا جی سے پوچھا۔

سعید کہاں ہے۔

تو اندر آجا حبیب! ابا جی بولے۔ اور پھر کہا کہ اللہ نے ہمیں بڑی سعادت بخشی ہے اور سعید اعتکاف میں بیٹھا ہے۔

کہاں بیٹھا ہے؟

تمہارے بھائی نے ابا جی کو غور سے دیکھا۔

وہ مسجد میں بیٹھا ہے۔

ابا جی بولے۔

رات کے وقت وہ میرا چھوٹا بھائی سعید مسجد میں اکیلا بیٹھا ہے۔

اتنا کہا' اور تیرے بھائی' گھر سے نکل کر تجھے پکارتے ہوئے مسجد کی طرف بھاگے۔

میرا میٹرک کا نتیجہ ظہیر بابر اور جالب بھائی

میں نے ۱۹۶۴ء میں مسلم ماڈل ہائی اسکول لاہور سے میٹرک پاس کیا ہے۔ ہمارا اسکول اس زمانے میں لاہور کے اچھے اسکولوں میں شمار کیا جاتا تھا۔ ممتاز ماہر اقتصادیات محبوب الحق صاحب کے والد ایم اے عزیز صاحب ہمارے اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ ایک زمانہ ایم اے عزیز صاحب کو ماہر تعلیم کی حیثیت سے نہ صرف جانتا تھا۔ بلکہ تسلیم بھی کرتا تھا۔ ایک اور نام' ماسٹر کمال صاحب کا ہے جو لاہور کے ہردل عزیز اور لائق اساتذہ میں سے ایک سمجھے جاتے تھے۔ ہمارے اسکول نے زندگی کے ہر میدان میں بہت نامور لوگ معاشرے کو دیئے۔ کرکٹر سعید احمد' شجاع الدین' یونس احمد' محمد الیاس' شفقت رانا' اقبال (بالا نتھا) مدثر نذر وغیرہ۔ ممتاز مصور بشیر مرزا' مستنصر حسین تارڑ' صحافی گل حمید بھٹی' اور بہت سے۔

میں میٹرک کے امتحان سے فارغ ہوا تو مجھے معلوم تھا کہ میرے پرچے اچھے ہوئے ہیں۔

اور میں پاس ضرور ہو جاؤں گا۔ مگر ہمارے بہنوئی مختار بھائی۔ جو اپنے زمانہ طالب علمی میں بہت ہی لائق طالب علم تھے۔ انہوں نے میٹرک اول درجہ اول پوزیشن کے ساتھ پورے پنجاب بورڈ میں ٹاپ کیا تھا۔ لہٰذا بجا طور پر وہ میرے بارے میں پختہ تھے۔ کہ میں میٹرک میں فیل ہو جاؤں گا۔ کیونکہ میری حرکتیں ہی ایسی تھیں۔ گولیاں کھیلنا' گلی ڈنڈا کھیلنا' پتنگ بازی' رہی سہی کسر' یوں پوری ہو جاتی تھی۔ کہ اسکول کی بزم ادب کا میں جنرل سیکریٹری تھا۔ اسکول میگزین میں بھی عمل دخل تھا۔ تقریریں کرنا' گانے گانا' اور پھر اسکول کی کرکٹ ٹیم میں بھی میں فاسٹ بالر کی حیثیت سے شامل تھا۔

اتنے بہت سارے کاموں کے ہوتے ہوئے۔ وہ شخص جس نے بورڈ میں پہلی پوزیشن حاصل کی ہو۔ میرے بارے میں فیل ہونے پر پختہ نہیں ہو گا تو اور کیا ہو گا۔ مگر میں اپنی جگہ بہت مطمئن تھا۔ کہ میں پاس ضرور ہو جاؤں گا۔

میٹرک کا نتیجہ اخبارات کے دفاتر میں دو تین روز پہلے ہی آجاتا ہے۔ لہٰذا میں نے جالب بھائی سے کہا کہ وہ میرے ساتھ کسی اخبار کے دفتر چلیں' تاکہ میں اپنا نتیجہ معلوم کر سکوں۔ میری بات سن کر بھائی جالب' غصے میں بگڑ کر بولے کہ مختار کہتا ہے تم نالائق ہو۔ اور میٹرک میں فیل ہو۔ لہٰذا میں تمہارے جیسے نالائق کی خاطر کسی اخبار کے دفتر جا کر دوستوں کے سامنے بے عزت ہونے کے لئے ہرگز تیار نہیں ہوں۔

میں نے بھائی صاحب کو سمجھانے کی لاکھ کوشش کی۔ مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہو رہے تھے اور مختار بھائی کی بات پر وہ بھی پختہ ہو گئے تھے۔ کہ میں میٹرک پاس نہیں کر سکوں گا۔ مگر میں نے بھی بھائی کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ اور اس بات پر بضد رہا کہ وہ مجھے لے کر کسی اخبار کے دفتر چلیں۔ آخر بھائی جالب اس شرط پر راضی ہوئے کہ اگر میں فیل ہوا تو وہیں اخبار کے دفتر ہی میں میری پٹائی ہو گی۔

میں نے بھائی کی شرط سن کر اپنی رضامندی ظاہر کر دی۔ کہ جی ہاں مجھے آپ کی شرط منظور ہے۔

بھائی جالب صاحب بڑے خراب موڈ میں مجھے لے کر "امروز" اخبار کے دفتر پہنچے' ظہیر

بابر صاحب اس زمانے میں امروز کے ایڈیٹر ہوا کرتے تھے بھائی صاحب سیدھے ظہیر بابر صاحب کے کمرے میں گئے۔ اور ان سے بولے۔

یہ میرا چھوٹا بھائی ہے۔ بڑا نالائق ہے۔ اور میٹرک میں فیل ہے۔ آپ ذرا اس کا نتیجہ دیکھ کر اسے بتا دیں یہ کہنے کے بعد بھائی نے چپل پاؤں سے اتار کر ہاتھ میں پکڑ لی۔

میاں اپنا ایڈمٹ کارڈ نکالو!

ظہیر بابر صاحب کا لہجہ بہت درشت تھا اور وہ مجھے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے گھور رہے تھے مگر میں بالکل مطمئن تھا۔ میں نے اپنا ایڈمٹ کارڈ نکالا اور ظہیر بابر صاحب کے سامنے رکھ دیا۔

ظہیر بابر صاحب نے ایڈمٹ کارڈ دیکھا اور گزٹ کے ورق الٹنے' پلٹنے شروع کر دیئے۔

جالب بھائی ہاتھ میں چپل پکڑے بالکل تیار بیٹھے تھے۔

بھئی جالب! تمہارا بھائی تو سیکنڈ ڈویژن میں پاس ہے

ظہیر بابر صاحب نے مسکراتے ہوئے جالب صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

مگر جالب بھائی! اور اتنی جلدی کسی بات کو مان جائیں!

ارے بھئی ظہیر بابر صاحب! ذرا غور سے دیکھیں یہ نالائق پاس نہیں ہو سکتا۔

جالب بھائی نے جھنجھلا کر ظہیر بابر صاحب سے کہا۔ جالب بھائی کی بات سن کر ظہیر بابر صاحب پھر سنجیدہ ہو گئے۔ انہوں نے انتہائی غور سے میرے ایڈمٹ کارڈ پر درج رول نمبر کو دیکھا۔ پڑھا اور پھر گزٹ میں درج رول نمبر کو دیکھا۔

ایک ایک ہندسہ ایڈمٹ کارڈ اور گزٹ کا ملایا۔

بھئی جالب! تمہیں مبارک ہو۔ تمہارا بھائی واقعی سیکنڈ ڈویژن میں پاس ہے۔

اچھا!

واقعی!

جالب بھائی کے چہرے پر خوشی و مسرت کی لہر دوڑ گئی اور انہوں نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی چپل فرش پر پھینکی اور مجھے گلے سے لگالیا۔

اور پھر امروز اخبار کے دفتر ہی میں بھائی صاحب نے مٹھائی منگوائی۔ اس روز بھائی امروز سے میرے ساتھ ہی سیدھے گھر آئے اور ایک بار پھر سارے گھر والوں کے ساتھ مٹھائی ہوئی۔

ڈاکٹر صلاح الدین اکبر

بندہ ڈاکٹر ہو۔ اور ہنس مکھ بھی ہو تو مریض بغیر علاج کے آدھا تو تندرست ہو ہی جاتا ہے اور اگر ڈاکٹر خوبصورت بھی ہو تو مریض پون حصہ ٹھیک ہو جاتا ہے اور پاؤ حصہ دوا کا محتاج رہ جاتا ہے۔ ڈاکٹر صلاح الدین اکبر' ڈاکٹر تو تھے ہی مگر ہنس مکھ اور خوبصورت بھی تھے اور اس کے علاوہ قلم کار بھی۔ ڈاکٹر صاحب کا کلینک مصری شاہ میں ہوا کرتا تھا اب کا معلوم نہیں کہ کلینک وہیں ہے یا نہیں۔

جالب بھائی سے ڈاکٹر صاحب کا زبردست یارانہ تھا۔ اسی محبت کی وجہ سے ہماری فیملی کا ڈاکٹر صاحب مفت علاج کرتے تھے۔ اور اگر مفت نہ بھی کرتے تو ہم انہیں دوا کے پیسے دے بھی نہیں سکتے تھے۔ ہمارے حالات ہی ایسے نہیں تھے۔ ہم لوگ سانده خورد سے مصری شاہ ڈاکٹر صلاح الدین اکبر کے ہاں دوا لینے جایا کرتے تھے۔ ہمارے گھر سے ڈاکٹر صاحب کا کلینک سات آٹھ میل دور تھا۔ بعض اوقات اتنا طویل سفر ہمیں جالب بھائی کی وجہ سے بھی اختیار کرنا پڑتا تھا۔ بھائی صاحب کی عادت تھی کہ وہ ذرا ذرا سی بات کو بہت زیادہ سنجیدگی سے لیتے تھے۔ اگر گھر کے کسی فرد کے چہرے یا بازو پر کوئی پھنسی دیکھ لی یا خراش' بس پھر بھائی صاحب شروع'

یہ پھنسی کیسے ہو گئی' کیوں ہو گئی۔

اجی چھوڑیں' رہنے دیں' کچھ نہیں ہے۔ پھنسی ہی تو ہے۔ ٹھیک ہو جائے گی۔

بھائی صاحب ذرا دیر کو ادھر ادھر ہو جاتے مگر پھر شروع ہو جاتے۔

دکھانا ذرا پھنسی!

اوہو'

نہیں بھئی۔ یہ تو خطرناک چیز لگ رہی ہے۔ ڈاکٹر کو دکھانا ضروری ہے۔

بھائی صاحب اتنی ذرا ذرا سی باتوں کا بھی بہت نوٹس لیتے تھے۔ اور بالآخر ڈاکٹر صلاح الدین اکبر کے کلینک سانده سے مصری شاہ جانا پڑتا۔ ڈاکٹر صاحب اپنی لازوال مسکراہٹ کے ساتھ استقبال کرتے۔

آؤ بھئی جالب! کہو کیا حال ہے۔

یہ ذرا اس پھنسی کو دیکھو' یار بڑی خطرناک لگ رہی ہے۔

جالب صاحب! اپنی بھنویں چڑھا کر یوں بات کرتے جیسے وہ سینئر ڈاکٹر ہوں۔ اور اپنے جونیئر کو سمجھا رہے ہوں۔

ڈاکٹر صلاح الدین اکبر جالب بھائی کی فکر مندانہ تشخیص پر قہقہہ مار کر ہنستے۔

واہ جالب صاحب واہ۔

بہت خوب۔

او یار تو ہنس رہا ہے بھئی اسے دیکھ۔ یہ ہلکے ہلکے سے دانے یہ کیا معاملہ ہے۔

او جالب صاحب!

آپ تو بہت بڑی بڑی امراض کے ڈاکٹر ہیں۔ ان چھوٹی موٹی بیماریوں کے لئے ہم ہی کافی ہیں۔ آپ بیٹھیں۔ میں ابھی دیکھ لیتا ہوں۔

اور سنائیں۔ آج کل سیاست کیا کہہ رہی ہے۔

ادب کا کیا حال ہے؟

یار پہلے اسے دیکھ۔

جالب بھائی ایک بے تکلف دوست

میں نے سترہ سال کی عمر میں میٹرک پاس کیا تھا۔ جالب بھائی بہت اچھے بھائی، بہت مشفق بزرگ اور ساتھ ہی ساتھ بہت بے تکلف دوست بھی تھے۔ میں نے میٹرک پاس کیا، تو بھائی کے مجھ سے گفتگو کے موضوعات بھی بدل گئے۔ اب وہ خصوصاً اخبار کی خاص خاص خبریں مجھ سے پڑھنے کو کہا کرتے۔ اور خود سنتے۔ یہ ان کا تربیت کا انداز تھا۔ پھر سیاست پر ہلکی پھلکی بات چیت ہوتی۔

کبھی کبھی گفتگو بہت ہی بے تکلف پیرائے میں داخل ہو جاتی۔

اوئے سعید! اب ذرا سنبھل کے زندگی گزارنا ہے۔

ہاں ذرا مضبوطی سے۔ لنگوٹ کو مضبوط رکھنا ہے۔

یونہی نہیں گر پڑنا۔

بھئی جوانی ہم پر بھی آئی تھی۔ مگر ہم نے بہت سنبھل کر وہ دن گزارے ہیں۔

بھائی! آپ مجھ سے کیسی باتیں کرتے ہیں۔

میں اٹھ کر چل دیتا۔

اوئے غور سے سنو میری بات!

بھائی میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے بٹھا لیتے۔

شرم' ادب' لحاظ.....!

بھائی مجھ سے بہت بڑے تھے۔ پورے اٹھارہ سال بڑے مگر وہ سارے فاصلے سمیٹ کر بے تکلف دوست کی سطح پر اتر آتے۔

یار سعید! جب میں لائل پور میں رہتا تھا۔ ناں' تو ایک دن میں صبح صبح کہیں جا رہا تھا۔ سامنے سے ایک لڑکی آ رہی تھی' جب وہ میرے بالکل قریب آ گئی۔ تو اس کے ہاتھوں میں پکڑی کتابیں نیچے گر گئیں۔

وہ بے سدھ مجھے دیکھ رہی تھی۔

میں نے اس کی کتابیں اٹھائیں اسے دیں اور کہا۔

بی بی! سیدھے کالج جایا کرتے ہیں۔

بھائی کی اس حد تک بے تکلفی پر میں احتجاجاً ابا جی کو پکارتا۔

ابا جی' ابا جی! یہ دیکھیں بھائی مجھ سے.....

اور بھائی میرے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہتے۔

اوئے بے وقوف میں تمہیں سمجھا رہا ہوں' اب تم جوان ہو گئے ہو' بس ذرا سنبھل کر چلنا ہے۔ اپنی پہچان کے ساتھ ذرا وقار سے۔

بھائی مٹھیاں بھینچ کر کہتے۔ وہ چھوٹے چھوٹے جملوں میں بہت کچھ کہہ جاتے تھے۔

جالب بھائی کی تربیت کا انداز انوکھا تھا۔

سیدھا' سچا' کھرا' بالکل خود ان کی طرح۔

اسلامیہ کالج کراچی ۱۹۶۴ء

مسلم ماڈل ہائی اسکول لاہور سے میٹرک پاس کر کے۔ میں کراچی چلا آیا۔ کراچی آنے کی وجہ گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ نہ ملنا تھا۔ مجھے پوری امید تھی۔ کہ غیر نصابی سرگرمیوں

کے لئے مخصوص نشستوں میں سے کسی ایک پر مجھے داخلہ ضرور مل جائے گا۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ میرے گروپ کے سارے دوست گورنمنٹ کالج میں داخلہ لے چکے تھے۔ ایسے میں میرے لئے لاہور میں رہنا مشکل تھا۔ لہٰذا میں نے شہر ہی چھوڑ دیا۔ اور کراچی کے اسلامیہ کالج میں داخلہ لے لیا۔ قیام پاکستان کے بعد کراچی کی حیثیت ہمارے لئے آبائی شہر کی تھی۔ کراچی میں اپنا گھر موجود تھا۔ بڑے بھائی مشتاق اور حمید بھائی پہلے ہی سے کراچی میں موجود تھے۔

این ایس ایف کے جلسے جلوس

۱۹۶۴ء میں نیشنل اسٹوڈنٹ فیڈریشن کے صدر معراج محمد خان تھے جب کہ جنرل سیکریٹری سید سعید حسن اور جوائنٹ سیکریٹری امیر حیدر کاظمی تھے۔ صدر ایوب خان کے خلاف کراچی شہر اپنا روایتی کردار ادا کر رہا تھا۔ این ایس ایف کے جلسوں، جلوسوں میں، میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا تھا۔ اور جالب بھائی کی نظمیں، انہی کے انداز میں پڑھا کرتا تھا۔ اور اس طرح میں طلباء میں خاصا مقبول تھا۔

راغب مراد آبادی خصوصی مشن پر

میں این ایس ایف کا نہ صرف سرگرم رکن تھا، بلکہ این ایس ایف کے تمام بڑے بڑے جلسے، جلوسوں میں جالب بھائی کی نظمیں پڑھا کرتا تھا۔ میری آواز بھی ٹھیک ٹھاک تھی، اور میں جالب بھائی کے ترنم کی ہو بہو کاپی کر لیا کرتا تھا۔ اسی بنا پر میں کراچی کی طلباء سیاست میں بہت مشہور و مقبول تھا۔ صدر ایوب خان کی کنونشن مسلم لیگ کی بغل بچہ تنظیم بھی طلباء میں بڑی چمک دمک کے ساتھ موجود تھی، مگر وہاں صرف چمک دمک تھی۔ طلباء نہیں تھے۔

ایک دن حکیم راغب مراد آبادی مجھے ڈھونڈتے ہوئے اسلامیہ کالج آئے، حکیم صاحب

کو میں نے اپنے سب سے بڑے بھائی مشتاق مبارک صاحب کے دفتر میں بہت دیکھ رکھا تھا۔
ہمارے بھائی مشتاق بہت سادہ مزاج دوست نواز انسان تھے۔

راغب صاحب مجھ سے ملے۔

میں انہیں کالج کینٹین میں لے آیا۔

جی راغب صاحب فرمایئے کیسے تشریف لائے۔

میں نے پوچھا۔

بھئی سعید میاں! جالب تو بے وقوف ہے۔ خواہ مخواہ اپنی زندگی خراب کرلی' کیا مل گیا اسے حکومت کی مخالفت کرکے۔

عدالتیں' مقدمے' سزائیں' جیل۔

کیا فائدہ ہوا اسے۔

اب میں تمہارے پاس آیا ہوں۔ تمہاری آواز بھی اچھی ہے۔ نظمیں تمہیں میں لکھ دیا کروں گا۔

بس تم نے نظمیں ایوب خان صاحب کی تقریبات میں پڑھنا ہوں گی۔
میری نظمیں پڑھ پڑھ کر پھر تم خود بھی شعر کہنے لگو گے۔
مجھے امید ہے تمہیں میری بات سمجھ میں آجائے گی۔
دیکھو میاں! وقت سے فائدہ اٹھاؤ۔

راغب صاحب اپنے مشن پر کامیاب و کامراں بولتے جارہے تھے۔ اور میں اندر ہی اندر بری طرح کھول رہا تھا۔ مگر وہ اپنے تئیں یقیناً یہی سمجھ رہے ہوں گے کہ لڑکا لائن پر آجائے گا۔

بس راغب صاحب' بات ختم کریں۔

میں اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

راغب صاحب کے حکیمانہ مشورے دھرے کے دھرے رہ گئے۔

اب اسی میں بہتری ہے کہ آپ تشریف لے جائیں!

اور راغب صاحب ایک لمحہ رکے بغیر بھاگ لئے۔

تجمل حسین (انکم ٹیکس کمشنر)

جالب صاحب کے قدردان دوست

گھر کے حالات ایسے نہیں تھے کہ میں اپنی تعلیم جاری رکھ سکتا' اسی لئے میں نے فیصلہ کیا۔ کہ تعلیم جاری رکھنے کے لئے مجھے ملازمت بھی کرنا ہوگی ۱۹۶۶ء میں تجمل حسین صاحب (الطاف گوہر صاحب کے چھوٹے بھائی) کمشنر انکم ٹیکس ہوتے تھے۔ جالب بھائی نے لاہور سے انہیں فون کر کے کہا کہ میرے بھائی سعید کو اپنے دفتر میں ملازم رکھ لو۔

جالب بھائی کے فون کے بعد میں طارق روڈ بالمقابل سوسائٹی قبرستان تجمل صاحب سے ان کی کوٹھی پر ملا۔

تجمل صاحب سمجھے کہ میں گریجوئیٹ ہوں وہ مجھے اپنے محکمہ انکم ٹیکس میں بحثییت انسپکٹر رکھنا چاہتے تھے۔ مگر جب میں نے ان سے مل کر انہیں بتایا کہ میں صرف میٹرک پاس ہوں۔ تو انہوں نے مجھے کلرک لینے سے انکار کرتے ہوئے کہا کہ تم آگے پڑھو اور تمہارا تعلیمی خرچ میں برداشت کروں گا۔

وہ بضد تھے۔ کہ تم پڑھو مگر میں نے ان سے کہا کہ آپ مجھے ملازمت دے دیں' اور میں شام کی شفٹ میں اپنی تعلیم جاری رکھوں گا۔

اس طرح ۱۶ فروری ۱۹۶۶ء کے دن میں محکمہ انکم ٹیکس کراچی میں بطور لوئر ڈویژن کلرک بھرتی ہوگیا۔ تجمل صاحب جالب صاحب کے بہت ہی اچھے دوست تھے۔ اور ان سے بے حد محبت کرتے تھے۔

ابراہیم جلیس ہمارے گھر آئے

جٹ لائن کراچی کا بلاک نمبر ۳۵ کا کوارٹر نمبر ۳ ایک طرح سے ہمارا آبائی گھر سا بن گیا تھا۔ اس گھر میں ہم لوگ ۱۹۴۷ء سے لے کر ۱۹۷۰ء تک پورے تیئیس سال رہے۔ یہ سرکاری کوارٹر ہمارے سب سے بڑے بھائی مشتاق مبارک صاحب کے نام پر الاٹ تھا۔ مشتاق بھائی اپنی دنیا میں حبیب جالب سے کم نہ تھے۔ ایک زمانہ ان کا محبتی تھا۔ معتقد تھا۔ وہ اپنی انسان دوستی کی خود ہی مثال تھے۔ ان کی دوستی کا پھیلاؤ ننھے سبزی والے سے لے کر مرکزی وزارتوں تک تھا۔ اور دوستی کی سطح ایک برابر۔ میں نے اپنے گھر میں بڑے بڑے نامور لوگوں کو دیکھا ہے۔ مشتاق بھائی مرکزی محکمہ فلم و مطبوعات میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر تھے۔ یہ عہدہ اس زمانے میں کم ہی لوگوں کے پاس ہوتا تھا۔ مشتاق بھائی پر علیحدہ مضمون میں تفصیل سے گفتگو ہوگی۔ اس وقت میں ابراہیم جلیس صاحب کا واقعہ بیان کروں گا۔ جو ایک مرتبہ رات گئے جالب بھائی کو چھوڑنے گھر آئے تھے۔

رات کے دو بج رہے تھے۔ گرمیوں کے دن تھے۔ ہم سب گھر والے صحن میں چارپائیاں ڈالے سو رہے تھے۔

جالب بھائی کی آواز آئی۔

سعید! دروازہ کھولو۔

میں نے دروازہ کھولا' مشتاق بھائی اندر سو رہے تھے۔ حمید بھائی اور محمود (مشتاق بھائی کا بڑا لڑکا) باہر صحن میں تھے وہ بھی اٹھ گئے۔ مگر ہم لوگ غنودگی کے عالم ہی میں تھے۔ بھائی جالب صاحب گھر میں داخل ہوتے ہی پیشاب کرنے کو چلے گئے۔ ان کے ساتھ ایک لمبا تڑنگا شخص بھی تھا۔ چونکہ میں نیند ہی میں تھا۔ لہٰذا اس شخص کو پہچان نہ سکا۔ جالب صاحب بیت الخلا میں گئے اور اسی اثناء میں وہ شخص رکے بغیر چلا گیا۔ میں نے بھی اس شخص کے چلے

جانے کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ میں یہی سمجھا کہ ہوگا کوئی جالب بھائی کا پرستار، مداح گھر چھوڑنے آیا ہوگا۔ اور چلا گیا۔

میں چارپائی پر لیٹ گیا۔ اتنے میں جالب بھائی کی آواز مجھے سنائی دی۔

اوئے سعید! وہ جلیس صاحب کہاں گئے؟

یہ سن کر میری تو سٹی گم ہوگئی۔

کیا وہ شخص ابراہیم جلیس تھے!

میں نے ڈرتے ڈرتے کہا کہ وہ تو چلے گئے۔

ارے چلے گئے!

اتنا بڑا انسان تمہارے گھر آیا، تم لوگوں نے اسے بیٹھنے کو بھی نہیں کہا۔

ارے جاہلو....

بھائی صاحب گرجتے برستے گھر سے باہر نکل گئے، حمید بھائی اور محمود بھی اٹھ گئے تھے۔ ہم تینوں بھی ان کے پیچھے پیچھے چل دیئے۔ جٹ لائن کا گنجان آباد علاقہ، ڈھلتی ہوئی رات اور جالب بھائی کی آواز۔

ارے بھئی جلیس صاحب

ابراہیم جلیس

اور کوئی دو فرلانگ دور "بڑے" کے قصائیوں کے محلے سے ابراہیم جلیس صاحب کی گرجدار آواز سنائی دے رہی تھی۔

ہاں، جالب!

ارے بھئی رک جاؤ! میں آرہا ہوں۔

جالب بھائی نے جلیس صاحب کی آواز کے تعاقب میں تقریباً دوڑنا شروع کردیا تھا۔ ہم بھی کچھ فاصلے سے ان کے پیچھے پیچھے تھے۔

نہیں جالب! میں چلا جاؤں گا۔

تم جاؤ۔

جلیس صاحب کو اب ہم دیکھ رہے تھے۔ وہ اپنے قد کی طرح لمبے لمبے ڈگ بھرتے چلے جارہے تھے۔

رک جاؤ، جلیس!

جالب بھائی نے پھر آواز لگائی۔

ہم جلیس صاحب کے قریب پہنچ چکے تھے۔ اور پھر وہ رک گئے۔

کیوں تکلیف دی تم نے گھر والوں کو! بھئی میں چلا جاتا۔

ارے یار، جلیس معاف کرنا۔ یہ میرے بھائی بند آپ جیسے شخص کو پہچان نہ سکے۔

بھائی جالب شدید غصے میں ہمیں باتیں سنا رہے تھے۔ ہم نے آگے بڑھ کر جلیس صاحب سے ہاتھ ملایا اور ان سے گستاخی کی معافی چاہی۔

پھر ہم سب جالب بھائی کے ساتھ جلیس صاحب کو صدر ایمپریس مارکیٹ تک چھوڑنے آئے۔

رات کا وقت تھا۔ جٹ لائن میں کوئی سواری ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ لہٰذا ڈیڑھ دو میل کا فاصلہ پیدل ہی طے کیا۔

صدر پہنچے، تو رکشہ ٹیکسیاں موجود تھیں۔

جلیس صاحب نے ایک رکشہ والے سے پوچھا۔

کیوں بھئی! پیر کالونی چلو گے؟

بیٹھو صاب! رکشے والا بولا۔

جلیس صاحب رکشہ میں بیٹھنے لگے۔ تو دوسری جانب سے جالب صاحب بھی رکشہ میں بیٹھ گئے۔

یہ کیا؟

جلیس صاحب نے ہنستے ہوئے جالب صاحب سے پوچھا۔

میں آپ کو گھر چھوڑ کر آؤں گا۔

جالب صاحب بولے۔

ارے نہیں بھائی! آپ اترو۔ میں چلا جاؤں گا' مگر جالب صاحب رکشہ سے اترنے پر تیار ہی نہیں تھے۔

نہیں جلیس صاحب! میں پہلے ہی شرمندہ ہوں۔ مگر اب میں آپ کو پیر کالونی چھوڑ کر آؤں گا۔

اسی دوران رات کے تین بج چکے تھے۔ اور صدر ایمپریس مارکیٹ پر ادبی مکالمہ ہو رہا تھا۔

جلیس صاحب رکشہ سے اتر آئے اور پھر جالب صاحب کو بڑی مشکل سے اس بات پر رضامند کیا کہ وہ اب گھر جائیں۔ اور میں بھی۔

رسا چغتائی ادب میں جھکتے چلے گئے

جالب بھائی جب بھی لاہور سے آتے تو اپنی بے پناہ سیاسی و ادبی مصروفیات کے باوجود اپنے دوستوں سے ضرور ملاقات کرتے تھے' اردو بازار میں ان کے دوست کرمانی کی دوکان تھی' جالب صاحب وہاں ضرور جاتے تھے' اسی طرح شوخ اختر آبادی صدر کی فٹ پاتھ پر پان کا ٹوکرا رکھ کر بیٹھتے تھے۔ جالب بھائی انہیں بھی ملنے جاتے تھے' اور اکثر انہیں پان کے ٹوکرے سمیت ہی اٹھا کر لے جاتے۔

ایک دن رسا چغتائی صاحب بھائی کے ساتھ گھر آئے' دن کا وقت تھا' رسا صاحب کا زمانہ مہ نوشی تھا۔ اور وہ موڈ میں تھے۔ اتفاق سے ہمارے والد صاحب سے ان کا آمنا سامنا ہو گیا۔ اور میں نے دیکھا کہ رسا صاحب' ہمارے ابا کے قدموں میں جھک گئے۔

ابا ابا۔

رسا صاحب ابا ابا کہتے ہوئے ابا جی کے قدموں میں جھکتے ہی چلے جا رہے تھے۔ ہمارے ابا نے ان کو پکڑ کر اٹھانا چاہا۔ مگر وہ تو چہرہ اوپر اٹھا ہی نہیں رہے تھے۔

نشترپارک، جالب صاحب کے چار مصرعوں سے سجایا گیا تھا

پاکستان پیپلز پارٹی ملک میں اپنی بنیاد مضبوط کر چکی تھی۔ اور کراچی کے نشتر پارک میں ذوالفقار علی بھٹو صاحب پارٹی کے صف اول کے زعماء کے ساتھ جلسہ سے خطاب کرنے والے تھے۔ معراج محمد خان، مولانا کوثر نیازی، عبدالحفیظ پیرزادہ، غلام مصطفیٰ جتوئی، غلام مصطفیٰ کھر بھی موجود تھے اور نشتر پارک کے اطراف کو جالب صاحب کے چار مصرعوں سے سجایا گیا تھا۔ اور ایک ایک مصرعہ چالیس چالیس گز کپڑے کے تھان پر لکھا گیا تھا۔ اس دن نشتر پارک شاعر عوام کی مکمل گرفت میں تھا۔

کھیت وڈیروں سے لے لو
ملیں لٹیروں سے لے لو
ملک اندھیروں سے لے لو
رہے نہ کوئی عالی جاہ

کیٹرک ہال میں جالب کے ساتھ شام ۱۹۶۷ء

نیشنل عوامی پارٹی کا ملک گیر کنونشن کراچی کے نشتر پارک میں ہو رہا تھا۔ پورے نشتر پارک میں شامیانے اور خیمے لگے ہوئے تھے ملک بھر سے پارٹی رہنما اور کارکن جمع تھے تین روزہ کنونشن بہت کامیاب رہا۔ کنونشن کے اختتام کے اگلے روز کراچی نیپ کی جانب سے جالب صاحب کے ساتھ ایک شام کیٹرک ہال صدر میں منائی گئی۔ پورا ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اسٹیج پر خان عبدالولی خان، میر غوث بخش بزنجو، گل خان نصیر، خیر بخش مری، عطاء اللہ مینگل، اجمل خٹک، غلام فاروق، ارباب سکندر خان خلیل، محمود الحق عثمانی اور کراچی نیپ کے صدر سید علی نقوی بیٹھے تھے۔ جب کہ سامعین میں ابراہیم جلیس، سید محمد تقی، رئیس

امروہوی، جون ایلیا، معراج محمد خان، فتح یاب علی خان، ڈاکٹر عالیہ امام، اور بہت سے نام اس وقت یاد نہیں آرہے موجود تھے۔ اس تقریب میں گل خان نصیر نے بلوچی اجمل خٹک نے پشتو اور رئیس امروہوی نے اردو میں منظوم خراج عقیدت پیش کیا تھا۔ رئیس صاحب کی نظم کا آخری شعر تھا۔

شاعرِ عظمتِ جمہور حبیبِ جالب
زندگی کا ہے صحیفہ سرِ مقتل تیرا

اس شام میں کراچی نیپ نے پارٹی پرچم کی بنی ہوئی ایک تھیلی، عوامی شاعر کی خدمت میں بدست خان عبدالولی خان پیش کی۔ تھیلی میں باقاعدہ ریزگاری بھی تھی۔ یہ پیسے کراچی کے مزدوروں، محنت کشوں نے اپنے شاعر کے لئے جمع کئے تھے۔ جو تقریباً ایک ہزار روپے تھے۔

کے جی اے گراؤنڈ کا یادگار مشاعرہ

صدر ایوب خان کے دور حکومت میں جالب صاحب پر مشاعرے بند تھے ۱۹۶۹ء میں جنرل یحییٰ خان برسراقتدار آئے، تو ایک طویل عرصہ بعد جالب صاحب کو کسی مشاعرہ میں شرکت کے لئے بلایا گیا۔ یہ مشاعرہ کراچی یونیورسٹی کے قدیم طلباء کی تنظیم کی جانب سے کے جی اے گراؤنڈ میں منعقد کیا گیا تھا۔ اس مشاعرہ میں حضرت جوش ملیح آبادی۔ حضرت حفیظ جالندھری، حضرت فیض احمد فیض، حضرت احسان دانش سمیت ملک کے نامور شعراء شرکت کررہے تھے۔ مشاعرہ گاہ میں لوگ بہت بڑی تعداد میں موجود تھے۔ مشاعرہ گاہ کے باہر وائرلیس سیٹ والی پولیس گاڑیاں موجود تھیں، متعدد ایس پی حضرات نگرانی پر معمور تھے۔ سادہ لباس والے اہلکاروں کی بھی بڑی تعداد موجود تھی۔ مشاعرہ گاہ کو جس طرح باوردی اہلکار گھیرے ہوئے تھے۔ اس سطح کے انتظامات پہلے کسی مشاعرے کے لئے دیکھنے میں نہ آئے تھے۔

مشاعرہ شروع ہوچکا تھا۔ پہلی بار مشاعرہ اس وقت روکا گیا۔ کہ جب جوش صاحب اپنے

پرستاروں کے جلو میں مشاعرہ گاہ پہنچے کچھ دیر بعد فیض صاحب تشریف لائے۔ تو مشاعرہ پھر رک گیا اور تیسری بار مشاعرہ اس وقت رکا جب عوام کا محبوب شاعر حبیب جالب اک ہجوم کے ساتھ مشاعرہ گاہ میں داخل ہوا۔

حبیب جالب زندہ باد کے نعروں سے فضا گونج اٹھی لوگوں نے کھڑے ہو کر دیر تک تالیاں بجا کر اپنے شاعر کا استقبال کیا۔

مشاعرہ آہستہ آہستہ آگے بڑھتا رہا حتیٰ کہ جالب صاحب کو دعوت کلام دی گئی۔ جالب صاحب کھڑے ہوئے تو پورا پنڈال ایک مرتبہ پھر کھڑا ہو گیا۔ جالب صاحب ہاتھ ہلا ہلا کر عوام کے جذبات کا جواب دے رہے تھے۔

نعروں کا تالیوں کا شور تھا' تو جالب صاحب نے یوں آغاز کیا۔

جوہر حسین (پروفیسر کرار حسین صاحب کے صاحبزادے) اسٹیج پر آؤ۔

جوہر حسین بھی مشاعرہ کے آرگنائزرز میں شامل تھے بھئی جوہر حسین کہاں ہو' اوپر آؤ۔

جالب صاحب اسٹیج پر چھائے ہوئے تھے۔

جوہر صاحب اگلی ہی صف میں بیٹھے تھے۔ انہوں نے اپنی نشست پر کھڑے ہو کر جالب صاحب سے شعر پڑھنے کی درخواست کی۔

مگر جالب صاحب کہہ رہے تھے۔

جوہر حسین اسٹیج پر آؤ اور مشاعرہ کا مائیکروفون ان مائیکروفونز سے علیحدہ کرو۔

جالب صاحب نے سامنے پڑے کئی مائیکروفونز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

جوہر صاحب نے پھر درخواست کی کہ جالب شعر پڑھیے۔

مگر جالب صاحب کسی بات پر اڑ جائیں تو بات منوا کر ہی رہتے ہیں۔

آخر جوہر حسین اسٹیج پر گئے اور مشاعرہ کی انتظامیہ کا مائیک علیحدہ کیا۔

اب جالب صاحب اس مائیک پر آ گئے اور بولے میں اپنے عوام سے مخاطب ہوں۔

کیا میری آواز آپ تک ریڈیو' ٹیلی ویژن کے ذریعے پہنچی ہے؟

نہیں نہیں

پورے پنڈال سے جواب آیا۔

اس پر جالب صاحب نے نفرت و حقارت سے ریڈیو ٹی وی کے مائیکرو فونز کی طرف دیکھا اور کہا۔

تو ہٹاؤ ان حُقّوں کو۔

اس کے بعد جالب صاحب اپنے سی آئی ڈی کے دوستوں سے بولے۔

کاپی پین نکالو' میں شروع ہو رہا ہوں۔

جالب صاحب نے آغاز صدر یحییٰ خان کو مخاطب کرتے ہوئے کیا۔

تم سے پہلے وہ جو اک شخص یہاں تخت نشیں تھا
اس کو بھی اپنے خدا ہونے پہ اتنا ہی یقیں تھا

اس کے بعد جالب صاحب دیر تلک اپنے اشعار سناتے رہے اور کئی بار سامعین نے جالب صاحب کو بلوا بلوا کر سنا۔

جالب صاحب دور ایوبی کی طویل پابندی کے بعد کسی مشاعرے میں آئے تھے' اسی لئے عوام نے انہیں خوب سنا' مشاعرے کے اختتام پر' آٹو گراف لینے والوں کا سب سے زیادہ ہجوم جالب صاحب کے گرد ہی جمع تھا۔

مجھے خوب یاد ہے کہ جالب صاحب اپنے مداحوں کو آٹو گراف دے رہے تھے اور کچھ فاصلے پر فیض صاحب چلے آ رہے تھے۔ ان کا رخ جالب بھائی کی طرف تھا۔ وہ کہہ رہے تھے بھئی شاعر انقلاب۔

بھئی شاعر انقلاب۔

فیض صاحب اپنی مخصوص مسکراہٹ چہرے پر سجائے بہت خوش خوش جالب صاحب کو دیکھ رہے تھے۔ جالب صاحب کے کانوں تک جونہی فیض صاحب کی آواز پہنچی' انہوں نے وہیں آٹو گراف کا سلسلہ ختم کر دیا۔ اور مودبانہ فیض صاحب کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔

بھئی اب کیا پروگرام ہے

فیض صاحب پوچھ رہے تھے۔

چند روز بعد جنگ کراچی میں انعام درانی صاحب نے اپنے کالم تلخ و شیریں' میں اس مشاعرے کی روداد بیان کرتے ہوئے لکھا تھا کہ جالب اس مشاعرے کا کامیاب ترین شاعر تھا۔ اور وہ مشاعرہ اپنے ساتھ لے گیا۔

میر غوث بخش بزنجو برہم ہو گئے

ذوالفقار علی بھٹو صاحب کے دور اقتدار میں پاکستان پیپلزپارٹی اور نیشنل عوامی پارٹی کا مرکز میں اتحاد قائم ہو گیا تھا۔ صوبہ بلوچستان میں نیپ بہت ہی واضح اکثریت کے ساتھ صوبائی اسمبلی کے انتخابات جیتی تھی اور اس طرح عطاء اللہ مینگل صوبہ بلوچستان کے وزیر اعلیٰ بنائے گئے' جبکہ گورنر کے عہدے پر بابائے بلوچستان میر غوث بخش بزنجو فائز ہوئے۔ دوسری طرف صوبہ سرحد میں نیپ اور جمعیت علماء اسلام نے مل کر حکومت بنائی مولانا مفتی محمود صاحب صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ بنائے گئے اور نیپ کے ارباب سکندر خان خلیل گورنر کے عہدے پر فائز ہوئے۔

مرکز میں نیپ اور پی پی پی کا اتحاد تھا۔ اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے ملک کے بہت سے سیاست دان دھڑا دھڑ نیپ میں شامل ہو رہے تھے۔ یوں وہ جماعت جس کا نام سن کر لوگ کانوں کو ہاتھ لگاتے تھے دور بھاگتے تھے۔ ان دنوں سیاسی پارٹیاں بدلنے کے عادی لوگوں کی آنکھ کا تارہ بنی ہوئی تھی۔

گورنر بلوچستان میر غوث بخش بزنجو گورنر بننے کے بعد پہلی بار کراچی تشریف لا رہے تھے۔ بزنجو صاحب کراچی آئے۔ تو ان کا استقبال وزیر اعلیٰ سندھ میر رسول بخش تالپور نے کیا۔ بزنجو صاحب کی کراچی آمد کے دوسرے دن کراچی نیپ نے ان کے ساتھ ایک میٹنگ کا اہتمام کیا۔ میٹنگ نیپ کراچی کے دفتر واقع شیریں منزل (نزد ریو سینما) میں تھی۔

میں بھی اس میٹنگ میں شریک تھا۔ اور میری شرکت بھی یوں ہو گئی۔ کہ جالب بھائی کو

میر صاحب کے ساتھ بلوچستان سے آنا تھا۔ میں انہی کی وجہ سے چلا گیا تھا۔ مگر وہاں پہنچ کر پتہ چلا کہ جالب صاحب سیدھے لاہور چلے گئے ہیں۔

خیر میٹنگ شروع ہوئی اور کراچی نیپ کے عہدیداران نے اپنی تقاریر میں بزنجو صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ کہ آپ بلوچستان کے گورنر ہیں اور مرکز کے نمائندے ہیں۔ سندھ میں آپ کا استقبال کراچی ایئرپورٹ پر وزیر اعلیٰ سندھ میر رسول بخش تالپور صاحب نے کیا ہے۔ جو پی پی کے اہم لیڈر ہیں۔

ان حالات کے باوجود نیشنل عوامی پارٹی کے سینکڑوں کارکن سندھ کی جیلوں میں بند پڑے ہیں۔ لہٰذا ہم آپ سے اپیل کرتے ہیں کہ آپ پارٹی کارکنوں کو قید و بند سے رہائی دلائیں۔ میر صاحب خاموشی سے بیٹھے تقریریں سنتے رہے۔ آخر میں انہیں اظہار خیال کی دعوت دی گئی۔

میر صاحب نے تقریر کرتے ہوئے کہا۔

آج نیپ کے پلیٹ فارم سے اس قدر شرم ناک تقریریں سن کر مجھے بہت دکھ ہوا ہے۔ بزنجو صاحب بہت غصے میں تھے وہ کہہ رہے تھے۔

پارٹی کی مرکزی کمیٹی نے مجھے گورنر کا عہدہ سنبھالنے کا اختیار دیا ہے۔ آج پارٹی کہے تو میں گورنری کو لات مار کر آجاؤں گا۔ اور جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ میں سندھ کی جیلوں میں بند پارٹی کارکنوں کی رہائی کی بھیک مانگوں، تو سن لیجیے۔ میں ایسا ہرگز ہرگز نہیں کروں گا۔

وہ کہہ رہے تھے۔

میں دیکھ رہا ہوں۔ کہ آج کل لوگ دھڑا دھڑ ہماری پارٹی میں شامل ہو رہے ہیں۔ مگر میں آنے والوں کو یاد دلانا چاہوں گا۔ کہ نیپ پھولوں کی سیج نہیں۔ کانٹوں کا بستر ہے۔ جیلیں ہماری تربیت گاہیں اور پھانسیاں ہماری حیات ہیں وہ کہہ رہے تھے۔

میں نے ایوب خان کے دور میں سکھر جیل میں اپنے آٹھ ساتھیوں کو پھانسی کے پھندے کے حوالے کیا اور پھر ان کی لاشیں وصول کی ہیں۔

غالباً ۶۷ء یا ۶۸ء کی بات ہے' ایئر مارشل (ریٹائرڈ) اصغر خان نشتر پارک کراچی میں اپنی پارٹی تحریک استقلال کے جلسہ سے خطاب کرنے کراچی آئے ہوئے تھے۔ ایئر مارشل صاحب کی انتہائی خواہش تھی کہ جالب صاحب بھی اس جلسہ میں شرکت کریں۔ ایئر مارشل صاحب کی طرف سے چند احباب ہمارے گھر جٹ لائن آئے۔ اور جالب صاحب کو اصغر خان صاحب کا پیغام پہنچایا۔ شہر میں جلسہ سے متعلق جو پوسٹر دیواروں پر لگائے گئے تھے ان میں بھی جالب صاحب کا نام نمایاں طور پر شائع کیا گیا تھا۔ مگر جالب صاحب نے جلسہ میں شرکت اس بات سے مشروط کردی کہ میری پارٹی کے جنرل سیکریٹری محمود الحق عثمانی صاحب اسی شہر میں رہتے ہیں ان کی تقریر پروگرام میں شامل کریں اور ان سے ملاقات کریں اس طرح جالب صاحب اس جلسہ میں شریک نہیں ہوئے۔

۱۹۶۹ء خوشی اور غم کا سال

۱۲ جولائی ۱۹۶۹ء کے دن ملتان میں ہمارے بھائی عبدالحمید خان کی شادی ہوئی تھی۔ ۱۹۵۸ء میں آپا رشیدہ کی شادی کے بعد ہمارے گھر میں خوشی کا موقع آیا تھا۔ مشتاق بھائی کو ہارٹ کے دو اٹیک ہوچکے تھے اور ان کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ گھر والے چاہتے تھے کہ مشتاق بھائی شادی میں شرکت کے لئے کراچی سے ملتان نہ جائیں مگر مشتاق بھائی بضد تھے۔ کہ ضرور جاؤں گا۔ بھائی مشتاق کی حالت بس یہ تھی کہ دن پورے کررہے تھے اور اپنی حالت کا خود ان کو بھی خوب اندازہ تھا۔

ملتان میں شدید گرمی تھی۔ شادی کی تقریبات ہمارے ملتان والے گھر ۵۱۶۔ سی گل گشت ملتان میں ہورہی تھیں یہ ڈبل اسٹوری مکان والد صاحب نے ۱۹۶۰ء میں بنوایا تھا۔ شادی میں

شرکت کی غرض سے میاں محمود علی قصوری صاحب بطور خاص لاہور سے تشریف لائے تھے قصور گردیزی صاحب کے شہر میں تو شادی ہی تھی۔ ان ہی دونوں احباب نے نکاح نامہ پر بطور گواہ دستخط کئے تھے۔

اور وہ غم بھی جالب نے اُٹھایا

حمید بھائی کی شادی کے دوران ہی ڈاکٹروں نے مشتاق بھائی کے بارے میں بتادیا تھا کہ پندرہ بیس روز کے مہمان ہیں۔ شادی کی تقریبات کے بعد مشتاق بھائی ۱۴ جولائی کو اپنے بیوی بچوں کے ساتھ فیصل آباد' اپنے سسرال چلے گئے۔ دو دن وہاں رہے حالت روز بروز بگڑتی جارہی تھی دو دن بعد بھائی مشتاق اپنی بیوی اور برادر نسبتی کے ساتھ لاہور جالب بھائی کے گھر واقع تنقیت منزل چوک سنت نگر لاہور آگئے۔

بھائی جالب گھر پر موجود نہیں تھے۔ بیوی بچے ابھی ملتان ہی میں تھے۔ مگر شاعر جمہور کے گھر کا دروازہ کھلا تھا۔ بھائی مشتاق صحن میں پڑی چارپائی پر لیٹ گئے ہمارے چچا زاد بھائی محسن احسن قریب ہی رہتے تھے۔ انہیں خبر ہوئی تو وہ آگئے مشتاق بھائی کی حالت مزید خراب ہو چکی تھی۔ احسن نے کسی طرح جالب بھائی کو ڈھونڈ نکالا۔ جالب بھائی دوڑے دوڑے گھر آئے اور بھائی مشتاق کو میو ہسپتال میں داخل کروادیا گیا۔ دوسرے یا تیسرے دن جالب بھائی کے بیوی بچے بھی لاہور آگئے۔

تمام عمر دوستوں کے ہجوم میں گزارنے والا مشتاق مبارک اپنے آخری ایّام میو ہسپتال کے جنرل وارڈ میں تنہا گزار رہا تھا۔ اگر کوئی پاس تھا۔ تو وہ عوام کا شاعر حبیب جالب تھا۔ جو دن بھر بڑے بھائی کے دوا دارو کے لئے پیسوں کی تلاش میں بھی رہتا۔ اور ہسپتال کے چکر بھی لگاتا۔

۲۷ جولائی ۱۹۶۹ء اس دن لاہور میں اتنا مینہ برس رہا تھا۔ کہ جیسے اسے آج ہی برسنا ہے۔ پھر موقع نہیں ملے گا۔ لاہور کی سڑکیں' ندی نالے بن چکی تھیں۔ بھائی جالب اس دن

ہسپتال نہ جا سکے۔ اگلے روز وہ ہسپتال پہنچے تو بھائی مشتاق کا بستر خالی تھا۔

جالب بھائی نے ساتھ والے مریض سے پوچھا۔

میرے بھائی کہاں گئے؟

تو اس نے بتایا۔ کہ ان کا کل مغرب کے بعد انتقال ہو گیا تھا۔

انا للہ و انا الیہ راجعون

۲۹ جولائی ۱۹۶۹ء کے جنگ اخبار میں بھائی مشتاق کے انتقال کی خبر پچھلے صفحہ پر نمایاں تھی۔

صہبا اختر صاحب نے قطعہ تاریخ وفات لکھا تھا۔

مشتاق مبارک تھے دل و دیدہ خلق
خلق ان کی تھی گرویدہ وہ گرویدہ خلق
اور آج ہیں' آسودہ آغوش لحد
مشتاق مبارک تھے پسندیدہ خلق

(۲۸ جولائی ۱۹۶۹ء)

۲۹ جولائی ۱۹۶۹ء کے دن خلق کے پسندیدہ مشتاق مبارک کا جنازہ خلق کے پسندیدہ شاعر حبیب جالب کے گھر سے اٹھا اور انہیں کرشن نگر کے قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔

مشتاق مبارک تھے پسندیدۂ خلق

شعرستان (تذکرہ شعرائے پاکستان) مرتبہ جناب نعمان تاثیر اور جناب مظہر صدیقی، شائع کردہ ماہنامہ پرچم بار اول نومبر ۱۹۵۰ء اس کتاب کے صفحہ ۳۲۱ پر خود مشتاق بھائی اپنے بارے میں لکھتے ہیں۔

نام مشتاق حسین تخلص مبارک، تاریخ پیدائش جون ۱۹۲۰ء ضلع ہوشیارپور مشرقی پنجاب کے قصبہ میانی افغاناں کا رہنے والا ہوں۔ ۱۹۳۹ء میں گورنمنٹ ہائی اسکول ٹانڈہ اڑمڑ سے میٹرک کیا۔ دوران تعلیم شعروشاعری سے کافی شغف رہا۔ اردو، فارسی کی تعلیم جناب محمد حسین کفیل اور جناب عزیز الدین رعظامی سے حاصل کی۔ ۱۹۴۰ء میں محکمہ امور خارجہ نیو دہلی میں ایک کلرک کی حیثیت سے ملازم ہوگیا۔ مئی ۱۹۴۱ء سے اگست ۱۹۴۷ء تک حکومت ہند کے شعبہ مطبوعات متحدہ میں ملازم رہا اور اس عرصہ میں آغا محمد یعقوب علی، سابق مدیر ''آجکل'' دہلی سید وقار عظیم ایم اے سابق مدیر ''ماہ نو'' کراچی و ماہنامہ ''آجکل'' دہلی مدیر ''نقوش'' لاہور معین احسن جذبی، فضل حق قریشی دہلوی جیسے حضرات کی رفاقت نصیب ہوئی۔ اپنے ذوق کی تسکین کے لئے دور حاضرہ کے اساتذہ کے کلام اور موجودہ ادبی رجحانات کے متعلق تنقیدی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ اس دور میں صرف ایک غزل کہی اور ایک مقالہ بعنوان ''ایرانی صحافت'' لکھا جو ''آج کل'' دہلی کے کسی شمارے میں شائع ہوا تھا۔ یہی میری ادبی زندگی کی ابتدا ہے۔

قیام پاکستان کے بعد کراچی کی ادبی سرگرمیوں اور پے درپے ہنگامی مشاعروں نے قسمت آزمائی پر مجبور کردیا۔ ۱۹۴۸ء میں اپنے بعض دوستوں کے اصرار پر شعر کہنا شروع کئے اور مشاعروں میں شرکت کی سب سے پہلی غزل سید ذوالفقار علی بخاری کے دولت کدہ پر سنائی جسے سب حضرات نے پسند کیا اور حوصلہ افزائی فرمائی۔ کچھ دنوں یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہا۔ اور بالآخر نہال سیوہاروی مرحوم کی خدمت میں بغرض تلمذ حاضر ہوا اور موصوف نے اسے

قبول فرمایا۔ آج بھی مرحوم کے روحانی فیض سے فیضیاب ہو رہا ہوں۔

مشتاق بھائی کو قدرت نے خوبصورت دل اور دماغ عطا فرمائے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے آخری سانس تک خلق خدا سے صرف اور صرف محبت ہی کی۔ وہ ۶۰ء کی دہائی کے کلاس I گز۔ٹڈ آفیسر تھے۔ کہ جب خال خال ہی لوگ اس درجہ تک پہنچ پاتے تھے۔ مگر ان میں کبھی بھی ذرہ برابر غرور و تکبر نہیں آیا۔ جٹ لائن کے سبزی والے تانگے والے' سائیکل رکشہ والے' اور دوسری طرف مرکزی وزیر خواجہ شہاب الدین' قدرت اللہ شہاب' زیڈ اے بخاری' سراج الدین ظفر' علامہ رشید ترابی' پیر حیرت شاہ وارثی' صادقین' استاد امانت علی خان' سلامت علی خان' روشن آراء بیگم' استاد فتح علی خان' حضرت جوش ملیح آبادی' ڈاکٹر یاور عباس' شمس زبیری' ڈاکٹر فرمان فتح پوری' کتنے نام لکھوں۔ بس یوں سمجھ لیں کہ ایک زمانہ یہاں سے وہاں تک دوستی ہی کا پھیلاؤ تھا۔

اپنی زندگی میں بے پناہ ضرورت مندوں کو ملازمت دلوائی' ہمارے خاندان کے سبھی ملازمت پیشہ حضرات' بھائی مشتاق ہی کے رکھوائے ہوئے ہیں۔ (بعد کو یہ کام جالب صاحب نے پکڑ لیا۔) مشتاق بھائی بے حد سادہ مزاج انسان تھے اپنے مزاج کی طرح وہ لباس بھی سادہ پہنتے تھے۔ سبحان اللہ ہوٹل (بالمقابل لائٹ ہاؤس سینما) سے لے کر میٹروپول تک ان کی ادبی بیٹھک تھی۔ دفتری اوقات میں دوست احباب انہیں گھیرے رہتے تھے۔ دفتر کا کام بھائی مشتاق دو بجے دوپہر سے شام چھ بجے تک کیا کرتے تھے۔

محکمہ فلم و مطبوعات سے تعلق کی وجہ سے ملک بھر کے گلوکار' اداکار' صداکار' بھائی کے بہت قریب تھے۔ ملک کے سبھی نامور فنکار مشتاق بھائی سے بہت عقیدت و محبت رکھتے تھے۔ ایک بار مرحوم طفیل نیازی سے ملاقات ہوئی۔ تو وہ کہنے لگے۔ "اب کراچی ہمارے لئے اجڑ گیا ہے۔ ہمارا صاحب نہ رہا۔" یہ کہہ کر وہ زار و قطار رونے لگے۔ یہی حال دوسرے فنکاروں کا بھی تھا۔ بھائی یقیناً فنکاروں ادیبوں' شاعروں کو بہت پیار دیتے تھے۔ ایک بار جون ایلیا صاحب نے مشتاق بھائی کے بارے میں بتایا۔ کہ جب کبھی مجھے پیسوں کی ضرورت ہوا کرتی تھی۔ تو میں مشتاق بھائی کے پاس چلا جایا کرتا تھا۔ مشتاق بھائی نے ہمیشہ اپنے سینئرز کا

احترام کیا۔ اور اپنے جونیئرز کو شفقت و پیار دیا۔

ان کا زندگی گزارنے کا انداز خوب نرالا تھا۔ لوگ یہی سمجھتے کہ مشتاق سادہ مزاج ہے بھولا ہے، مگر بھائی سب کچھ سمجھتے ہوئے جانتے ہوئے بھی نا سمجھ اور بھولے بنے رہتے تھے۔ اور یوں خاموشی سے اپنی مرضی و منشا کے ساتھ لوگوں کے لئے استعمال ہوتے رہتے تھے اور اس طرح کہ کسی کو شبہ تک نہ ہو۔

اپنے بارے میں وہ خود کہہ گئے ہیں

دوستوں کی ستم ظریفی کو
ہم فقط اپنی سادگی سمجھے
دوست میرے خلوص کو اکثر
میرا احساس کمتری سمجھے

بہت سے لوگوں کی بھائی مشتاق خاموشی سے مالی مدد بھی کیا کرتے تھے، اور یہ سلسلہ مرتے دم تک جاری رہا۔ انتقال سے ایک دو گھنٹے قبل ان کے پاس ہسپتال میں کوئی شخص آیا اور بولا کہ بیٹی بیاہنی ہے۔ مدد کا طلب گار ہوں۔ بھائی نے جیب میں موجود پچاس روپے سائل کو دیئے۔ اور کچھ دیر بعد انتقال کر گئے۔

صہبا اختر صاحب نے مشتاق بھائی کا قطعہ تاریخ وفات لکھا تھا۔ اسی پر تحریر کا اختتام کرتا ہوں۔

مشتاق مبارک تھے دل و دیدۂ خلق
خلق ان کی گرویدہ، وہ گرویدۂ خلق
اور آج ہیں آسودہ آغوشِ لحد
مشتاق مبارک تھے پسندیدۂ خلق

*

مشتاق مبارک کے بیوی بچے بے گھر ہو جاتے

بھائی مشتاق صاحب نے اپنے پیچھے کوئی جائیداد یا پیسہ وغیرہ نہیں چھوڑا تھا۔ انہوں نے تمام زندگی دوستوں یاروں کے جھرمٹ میں گزاری تھی۔ جو کمایا وہیں لٹادیا۔ مگر ان کے انتقال کے بعد کسی دوست نے پلٹ کر جھانکا تک نہیں۔

مشتاق بھائی کے سرکاری فنڈ سے بھابی کو بیس پچیس ہزار روپے ملے تھے۔ ان پیسوں کا بھابی نے عزیز آباد بلاک نمبر ۱۴ میں ۱۲۰ گز پر بنا ہوا مکان خرید لیا تھا۔ اس طرح مشتاق بھائی کے بیوی بچوں کو چھت مل گئی۔ اور وہ جٹ لائن والا سرکاری کوارٹر خالی کر کے اپنے ذاتی گھر میں منتقل ہو گئے۔

شاعر شکیل نشتر مرحوم کے ڈی اے میں انجینئر ہوتے تھے۔ انہوں نے مکان خریدوانے میں ہماری بڑی مدد کی۔

مکان کی کل قیمت بائیس ہزار طے پائی تھی۔ مگر کاغذات بارہ ہزار روپے کے تیار کئے گئے تھے۔ بھابی نے سولہ ہزار روپے مکان مالکہ کو (جو خود بھی بیوہ تھیں اور انکا داماد جس کی لیاقت آباد میں جوتوں کی دوکان تھی' وہی بیوہ ساس کے معاملات کو دیکھتا تھا) ادا کر دیئے۔ مگر ان کو رسید صرف چھ ہزار کی دی گئی۔ اور تحریری معاہدہ کی رو سے کل قیمت بارہ ہزار میں سے چھ ہزار وصولی دکھائی گئی اور چھ ہزار بقایا رقم واجب الادا دکھائی گئی۔ جب کہ دس ہزار روپے بغیر رسید کے بھابی نے مالکہ مکان کو ادا کر دیئے تھے۔

باقی کے چھ ہزار روپے چار ماہ بعد ادا کرنا تھے۔ بھابی بوجوہ' بقایا رقم معاہدہ مدت کے دوران ادا نہ کر سکیں۔ اور مدت گزر جانے کے ایک ماہ بعد مالکہ مکان بیوہ خاتون کے داماد کی نیت میں فتور آ گیا اور اس نے عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا۔ کہ معاہدہ کے مطابق بقایا چھ ہزار روپے بیوہ مشتاق مبارک ادا نہیں کر سکیں للٰہذا جتنے ماہ مدت معاہدہ سے زیادہ ہیں۔ بیوہ مشتاق اس کا کرایہ ادا کریں۔ اور مکان خالی کر دیں۔

معاملہ بہت سنگین تھا۔ کیونکہ بھابی بلا رسید کے دس ہزار روپے بھی ادا کر چکی تھیں۔ جس کا بظاہر کوئی کاغذی ثبوت موجود نہیں تھا۔ چند ماہ تو مقدمہ مشتاق بھائی کے بڑے بیٹے محمود الحسن نے چلایا مگر بات بگڑتی نظر آ رہی تھی۔ ہمیں پتہ چلا تو حمید بھائی اور میں نے اپنی سی کوشش کی۔ مگر بات بہت آگے بڑھ چکی تھی۔ لہٰذا ہم نے لاہور میں جالب بھائی کو تمام حالات سے آگاہ کر دیا۔

جالب بھائی یہ بات سنتے ہی فوراً بذریعہ ہوائی جہاز کراچی پہنچے اور سیدھے محمود الحق عثمانی صاحب کے گھر گئے' اور انہیں حالات سے آگاہ کیا۔

پیر جی اچھن نے بنیادی کردار ادا کیا

عثمانی صاحب نے تمام حالات سن کر لیاقت آباد مارکیٹ کے صدر پیر جی اچھن کو بلوالیا۔ پیر جی اچھن لیاقت آباد کی بہت معروف' ہر دل عزیز سیاسی و سماجی شخصیت تھے۔ ان کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ فیصلے کی حیثیت رکھتا تھا۔ عثمانی صاحب کے بلوانے پر پیر جی اچھن تشریف لے آئے۔

پیر جی! یہ جالب صاحب ہیں۔

انہیں کون نہیں جانتا۔

پیر جی اچھن نے جالب صاحب سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

بھئی پیر جی! جالب صاحب کی بیوہ بھاوج کا مسئلہ ہے اور انہیں آپ کی مارکیٹ کا ایک شخص جس کی جوتوں کی دکان ہے۔ تنگ کر رہا ہے۔ اور اس نے جالب صاحب کی بھاوج کے خلاف عدالت میں مقدمہ کر دیا ہے اب آپ بتائیے کہ اس مسئلہ کو کیونکر حل کیا جائے۔

✲

جالب، جلوس لے آیا تو!
پیر جی اچھن نے سمجھایا

عثمانی صاحب سے پوری تفصیل جاننے کے بعد پیر جی اچھن اپنے مخصوص انداز میں بولے۔ کہ آپ بے فکر ہو جائیں، یہ معاملہ ٹھیک ہو جائے گا اور جالب صاحب کی بھاوج بچوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔

اس کے بعد پیر جی اچھن لیاقت آباد مارکیٹ کے اس جوتے والے کی دوکان پر گئے کہ جس نے ہماری بھابی (بیگم مشتاق مبارک) کے خلاف عدالت میں مقدمہ دائر کیا تھا۔ پیر جی اچھن اس سے ملے اور کہا۔

دیکھو میاں! یہ معاملہ جالب صاحب کی بیوہ بھاوج کا ہے اور تمہیں اس مقدمے کو واپس لینا ہو گا۔ اور اپنی بقایا رقم لے کر مکان کی رجسٹری جالب صاحب کی بیوہ بھاوج کے نام کر دو۔

پیر جی اچھن کی باتیں سن کر ان صاحب کے پیروں تلے سے جیسے زمین ہی نکل گئی۔

کیا کہہ رہے ہیں پیر جی!

میں بالکل حق پر ہوں۔ اور میرا کیس مضبوط ہے۔ پھر میں کیسے مقدمہ واپس لے لوں۔

بھئی سوچ لو! میں تمہیں دو دن کا وقت دیتا ہوں۔ کیونکہ اتنا ہی وقت مجھے جالب صاحب نے دیا ہے۔ اس لئے کہ وہ اگر جلوس لے کر لالو کھیت آ گئے۔ تو پھر میری کوئی ذمہ داری نہیں ہو گی۔

پیر جی اچھن کی بات بھلا کس کی ہمت تھی۔ کہ ٹال دے، لہٰذا ویسا ہی ہوا۔ جیسا پیر جی نے چاہا اور بہت ہی بڑے دل سے اس بھائی جوتے والے نے مقدمہ واپس لیا۔ اور یوں مکان کی رجسٹری ہماری بھابی کے نام ہو گئی۔

مقدمہ کی واپسی پر مقدمہ کا تمام خرچ جوتے والے کو پیر جی اچھن نے اپنی جیب خاص سے ادا کیا۔

عبدالحمید خان کی شادی ۱۹۶۹ء میاں محمود علی قصوری اور قسور گردیزی

انگریز کے خلاف آزادی کی جنگ لڑنے والے کامریڈ حسن علی شورش کی بیٹی سے میری شادی جالب بھائی نے طے کی

دین محمد اینڈ سنز کراچی پولیس کے منظور شدہ یونیفارم کنٹریکٹر ہیں' اس کاروبار کے بانی دین محمد صاحب مرحوم نے ۱۹۴۳ء میں پولیس یونیفارم بنانا شروع کئے تھے۔ اور اب ان کے بیٹے اور پوتے اس کاروبار کو کامیابی سے چلا رہے ہیں۔

دین محمد صاحب کے بڑے صاحبزادے ظفر علی مرحوم محکمہ پولیس میں انسپکٹر اور جالب بھائی کے بہت اچھے دوست بھی تھے۔ ظفر صاحب جب بھی لاہور جاتے۔ تو جالب بھائی سے ضرور ملاقات کرتے تھے۔ ۱۹۷۰ء میں ظفر صاحب لاہور گئے ہوئے تھے۔ اور جالب صاحب کے ساتھ کافی ہاؤس لاہور میں گپ شپ چل رہی تھی باتوں ہی باتوں میں ظفر صاحب' جالب صاحب سے بولے۔

سعید پرویز کے ساتھ حبیب جالب ۱۹۷۲ء شادی کے موقع پر

کامریڈ حسن علی شورش

کامریڈ حسن علی شورش

یار جالب! میرا بڑا بہنوئی حسن علی' بالکل تیرے جیسا تھا۔ وہ کانگریسی تھا۔ اور اس نے انگریز کے خلاف جنگ آزادی لڑی تھی۔ وہ فریڈم فائیٹر تھا۔ اور بالکل تیری طرح بے باک' نڈر۔ وہ ہمارا پھوپھی زاد بھائی بھی تھا۔ ہمارے ابا نے ہماری سب سے بڑی بہن حفیظ کی اپنے بھانجے حسن علی سے شادی کی اور اسے گھر داماد بنا کر اپنے پاس رکھ لیا تھا' مگر حسن علی شورش گھر داماد بننے کے لئے بالکل تیار نہیں تھا۔

وہ بہت روشن خیال آدمی تھا۔ وہ اپنی بیوی کو ساڑھی پہننے کے لئے کہتا' سیر کے لئے ساتھ چلنے کو کہتا۔ کانگریس کے بڑے بڑے لیڈر حسن علی شورش کی صلاحیتوں کے معترف تھے۔ مگر ہمارے ابا دین محمد صاحب کو اپنے داماد کے خیالات' اور حرکتیں بالکل پسند نہ تھیں۔ حسن علی اپنی بیوی کو ساڑھی پہنا کر اپنے ساتھ سیر کے لئے لے جانے کی بات کرتا۔ مگر ہمارے ابا جی یعنی اس کے سسر اس کی بیوی' یعنی اپنی بیٹی کو گھر سے باہر قدم نہیں رکھنے دیتے تھے۔

ہمارے ابا دین محمد صاحب کے درزی خانے میں جہاں پولیس کی وردیاں تیار ہوتی تھیں' کبھی کبھی کامریڈ حسن علی شورش پہنچ جاتے۔

کہو بھئی کام ٹھیک چل رہا ہے' ماما جی مزدوری دے رہے ہیں؟ کوئی شکایت تو نہیں۔

کامریڈ کاریگروں سے پوچھتے۔

کہیں اگر کسی کاریگر نے کہہ دیا۔ کہ صاحب مجھے اتنے دن سے مزدوری نہیں ملی۔ تو کامریڈ حسن علی کہتے یہ سلائی مشین اٹھا کر لے جاؤ۔ یا کہتے یہ کپڑے کا تھان لے جاؤ اور اسے بیچ کر اپنی مزدوری پوری کر لو۔

کبھی کبھی کامریڈ کے ہوتے ہوئے کوئی انگریز پولیس افسر آجاتا تو ہمارے ابا دین محمد تعظیماً کھڑے ہو جاتے۔ مگر کامریڈ بیٹھے ہی رہتے۔ بلکہ اور اکڑ کر بیٹھ جاتے۔

انگریز پولیس افسر کے جانے کے بعد دین محمد صاحب اپنے داماد کامریڈ حسن علی سے کہتے۔

اوئے حسن علی! صاحب آیا کرے تو کھڑے ہو جایا کرو اس پر کامریڈ تنک کر جواب دیتے۔

کیوں کھڑا ہو جاؤں۔ یہ تو غاصب ہیں' چور ہیں' قابض ہیں۔

ایک بار اپنے کسی مقدمہ کی پیشی کے سلسلے میں کامریڈ حسن علی شورش عدالت کے کٹہرے میں کھڑے تھے۔ عدالت کا جج انگریز تھا۔ اس نے کامریڈ کو چھ ماہ قید سخت کی سزا سنائی۔

عدالت کا فیصلہ سن کر کامریڈ نے کٹہرے میں کھڑے کھڑے پاؤں سے اپنا جوتا اتارا اور انگریز جج کے منہ پر کھینچ کر مارا اس جرم پر انگریز جج نے مزید چھ ماہ کی سزا سنادی۔

جالب بھائی کامریڈ حسن علی شورش کی باتیں سن کر بہت خوش ہو رہے تھے۔

کامریڈ آج کل کہاں ہیں؟

جالب بھائی نے ظفر صاحب سے پوچھا۔

یار جالب! وہ تو شادی کے کچھ عرصہ بعد ہی فوت ہو گیا تھا۔ بس اس کی ایک بچی ہے۔ اب تو وہ جوان ہو چکی ہے۔ شوہر کے مرنے کے بعد ہماری بہن نے ساری زندگی ہمارے ساتھ ہی رہ کر گزاری ہے۔ اور کامریڈ کی بچی شائستہ ادیب' ہمارے گھر ہی میں پلی بڑھی ہے۔ اپنی بچی کا نام بھی اس کے باپ نے خود رکھا تھا۔

جالب بھائی خاموش بیٹھے ظفر صاحب کی باتیں سن رہے تھے کچھ دیر خاموشی رہی۔

بھئی ظفر صاحب' کامریڈ کے بارے میں اور کچھ بتاؤ۔

جالب بھائی بولے۔

کامریڈ کی بات اور کیا سناؤں۔

یار جالب! ہم کامریڈ کی بیٹی اپنی بھانجی کے رشتہ کے لئے پریشان ہیں' یار کوئی ڈھنگ کا رشتہ ہو تو بتانا۔

کامریڈ حسن علی شورش' حریت پسند' کی بیٹی۔

جالب بھائی گہری سوچ میں پڑ گئے۔

کیا ہوا جالب!

کیا سوچ رہے ہو۔

ظفر صاحب نے گہری سوچ میں گم جالب صاحب سے کہا۔

یار ظفر! تم میرے دوست ہو اور میرے ہم مشرب بھی ۔ اگر تم قبول کرو۔ تو میں کامریڈ کی بیٹی کو اپنے گھرانے کی بہو بنانا چاہوں گا۔ میرا چھوٹا بھائی سعید گریجویٹ ہے اور انکم ٹیکس میں ملازم بھی ہے۔

ظفر صاحب اس قسم کی صورت حال کے لئے بالکل تیار نہیں تھے وہ ایک دم خاموش سے ہو گئے۔

یار جالب! جیسا تو مناسب سمجھے، مجھے تجھ پر بھروسہ ہے۔

ہاں ظفر! سعید بہت اچھا بچہ ہے۔ باقی تم کراچی جاکر اسے دیکھ لو۔ تمہارے گھر والے بھی خدا کرے مطمئن ہو جائیں۔ اور یہ رشتہ طے پایا جائے۔ تو مجھے بہت خوشی ہوگی۔

اور بالآخر جالب بھائی جیسے درویش کی خواہش پوری ہوئی اور بزرگوں کے عین مشورے اور رضامندی سے کامریڈ حسن علی شورش کی بیٹی حبیب جالب کے گھرانے کی بہو بن گئی۔

۲ دسمبر ۱۹۷۲ء کو میری شادی ہوئی۔ جب دلہن کو رخصت کیا جا رہا تھا۔ تو فضا مغموم سی تھی۔ اور جالب بھائی بلند آواز میں کہہ رہے تھے۔

یہ میرے لیڈر حسن علی شورش کی بیٹی ہے۔ مگر آج سے یہ میری بیٹی ہے اور آپ فکر مند نہ ہوں۔

اور جالب بھائی نے آخری سانس تک اس عہد کو نبھایا۔ وہ شائستہ کا بہت احترام کرتے تھے۔ اسے بہت چاہتے تھے۔ اور اکثر یہی کہا کرتے تھے۔ کہ یہ میرے لیڈر کامریڈ حسن علی شورش کی بیٹی ہے۔

جالب بھائی پوری رات
ٹرین میں شعر سناتے رہے

۲ دسمبر ۱۹۷۲ء کے دن میری شادی تھی۔ جالب بھائی کے بیوی بچے شادی سے ہفتہ پہلے

سعید پرویز کی شادی کے موقع پر تینوں بھائی خوشگوار موڈ میں

ہی آ چکے تھے۔ مگر جالب بھائی شادی کے دن تک نہیں پہنچے تھے۔ شام کو بارات تھی' اور دوپہر ڈھل چکی تھی۔ بارات روانہ ہونے میں چند گھنٹے رہ گئے تھے اماں ابا اور سارے گھر والے بڑی شدت سے بھائی کا انتظار کر رہے تھے۔ ہم جس جگہ کرائے پر رہ رہے تھے وہ گھر بھائی نے نہیں دیکھا تھا۔ ہم اس لئے بھی فکر مند تھے کہ وہ کیسے پہنچیں گے۔

گھر کے باہر چارپائی بچھائے اماں' ابا بیٹھے تھے۔ کہ ایک کار گلی کے نکڑ پر رکی اور پھر جالب بھائی کار سے اترتے نظر آئے۔

حبیب آگیا! شکر اللہ دا' حبیب آگیا۔

اماں' ابا نے بڑھ کر جالب بھائی کو گلے سے لگایا۔

محمود الحق عثمانی صاحب کے چھوٹے بھائی اپنی کار میں جالب صاحب کو لئے گھر ڈھونڈ رہے تھے۔ الطاف آزاد بھی ہمراہ تھے۔

جالب بھائی بہت تھکے ہوئے نظر آرہے تھے' اور پھر پورے دو گھنٹے گھر ڈھونڈنے میں بھی لگ گئے تھے۔

عثمانی صاحب کے بھائی چلے گئے۔ تو جالب بھائی نے بتایا کہ ساری رات ٹرین میں جاگ کر گزاری ہے۔ کل گوجرانوالہ کسی دوست سے دو ہزار روپے لئے' اور ٹرین میں بیٹھ گیا دن تو گزر گیا۔ مگر رات آئی تو دو ہزار کا فکر پڑ گیا۔

اور میں اسی خوف کے مارے ساری رات نہیں سویا۔ کہ اگر سو گیا تو کوئی میرے پیسے نہ نکال لے۔ اور اس طرح میں ساری رات قریب بیٹھے لوگوں کو اپنے شعر سناتا رہا۔ جالب بھائی نے اماں کے ہاتھ میں دو ہزار روپے دیئے۔ اور پھر باہر پڑی چارپائی پر لیٹ کر سو گئے۔

*

فیض صاحب کے دو پیگ محمد حسین عطا سے مکالمہ

بھٹو صاحب کا دور تھا' اور جالب بھائی کراچی آئے ہوئے تھے رات کا پہلا پہر تھا۔ وہ میرے ساتھ اسکوٹر کی پچھلی سیٹ پر بیٹھے تھے۔

میاں سعید! پام گرو لے چلو

جالب بھائی نے دونوں ہاتھوں سے میرے کندھوں کو دباتے ہوئے کہا

اور پھر کچھ ہی دیر بعد ہم پام گرو پہنچ گئے۔

اس دن پہلی بار میں نے محمد حسین عطا صاحب کو دیکھا تھا۔ سرخ و سفید رنگت' لانبا قدر' متناسب جسم' کرتا شلوار واسکٹ پہنے۔

عطا صاحب! میں آ گیا ہوں

جالب بھائی اپنے مخصوص انداز میں بولے

آؤ بھئی آؤ جالب

محمد حسین عطا صاحب نے بڑھ کر جالب صاحب کو گلے لگایا۔

بھئی عطا صاحب! میں آ گیا ہوں

جالب صاحب اپنی آمد کا احساس دلانا چاہتے تھے

ہاں بھئی میں دیکھ رہا ہوں۔ کہ حبیب جالب آ چکا ہے۔

عطا صاحب کے لہجے میں اپنائیت تھی۔

تو پھر انتظام کیجئے

بھئی جالب! یہاں تو فیض صاحب کو بھی بس ''دو پیگ'' ہی ملتے ہیں۔

عطا صاحب جالب صاحب سے بولے

حبیب جالب پر پابندی!

ناممکن

اور جواب میں عطا صاحب مسکرا کر رہ گئے

یوں اس رات دیر تک جالب صاحب کا پام گرو پر قبضہ رہا۔

آہ طاہر عباس

طاہر عباس مرحوم، جالب بھائی کا بڑے سے چھوٹا بیٹا تھا۔ میری شادی میں وہ شہ بالا بنا تھا۔ ۱۹۷۶ء کو یہ بچہ بارہ سال کی عمر پا کر انتقال کر گیا۔

اپنے تمام بہن بھائیوں سے الگ مزاج رکھنے والا طاہر عباس، سارے گھرانے کا بہت ہی پیارا تھا، اس کی زندگی میں بڑی ترتیب تھی وہ اسکول سے آتا، تو اپنا یونیفارم، جوتے، موزے اتار کر اگلے روز کے لئے سنبھال کر رکھ دیتا۔ وہ اپنے دادا کے ساتھ مسجد نماز پڑھنے بھی جایا کرتا تھا۔ اسکول سے کبھی اس بچے کی شکایت نہیں ملی تھی۔ طاہر عباس کو گھر میں پیار سے "ٹونی" کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ اسی طرح جالب بھائی کی بیٹی افشاں کو "پروفیسر" انور ہدیٰ کو "ٹتو" لیلیٰ خالد کو "پوپا" یہ سارے Nick Name میرے دیئے ہوئے ہیں۔

اپنے بچوں سے سبھی ماں باپ کو پیار ہوتا ہے۔ اور پھر جو بچہ بچھڑ جائے۔ وہ تو ماں باپ کے لئے کیا ہوتا ہے۔ الفاظ اس جذبے کو بیان نہیں کر سکتے۔ اور پھر جالب جیسا باپ!

بارہ سال کا پلا پلایا بچہ، جالب صاحب نے بڑے حوصلے کے ساتھ زمین کے سپرد کیا تھا۔ مگر طاہر عباس، انہیں کبھی نہیں بھولا۔ حیدر آباد جیل میں جب انہیں اپنے بچوں کے خطوط ملتے تھے۔ تو طاہر عباس انہیں بہت یاد آتا تھا۔

آج وہ زندہ جو ہوتا، وہ بھی خط لکھتا مجھے
پڑھ کے نور افشاں کا خط وہ اور یاد آیا مجھے
یوں تو کیا پایا ہے، اس جینے میں اشکوں کے سوا
زندگی بھر اس کا کھوجانا نہ بھولے گا مجھے

پھول کو جب دیکھتا ہوں' میری بھر آتی ہے آنکھ
لگ رہا ہے' یہ جہاں' صدیوں کا ویرانہ مجھے
جی بھی کیا سکتا تھا' وہ اس سنگدل ماحول میں
اب سمجھ آیا' جہاں سے اس کا اٹھ جانا مجھے

طاہر عباس کو ٹائیفائڈ بخار ہو گیا تھا' حالت بگڑتی ہی چلی گئی اور وہ جانبر نہ ہو سکا۔

طاہر عبّاس کا دَسواں
ایف ایس ایف کا گھیراؤ

صوبہ بلوچستان' اور صوبہ سرحد' سیاسی افراتفری کا شکار تھے' نیشنل عوامی پارٹی اور پیپلز پارٹی کا اتحاد ختم ہو چکا تھا اور حسب معمول نیشنل عوامی پارٹی وقت کے زیر عتاب تھی۔

طاہر عباس کے انتقال کو دس روز ہوئے تھے۔ صبح دس بجے کا وقت تھا۔ جالب بھائی مقیت منزل چوک سنت نگر میں رہتے تھے۔ گھر پہلی منزل پر تھا۔

ناصر!

ناصر!

ناصر' جالب بھائی کے بڑے بیٹے کا نام ہے۔ کوئی اسے پکار رہا تھا۔ میں نے گھر کی کھڑکی سے نیچے جھانکا۔

میں نے دیکھا نیچے چار افراد کھڑے تھے۔

میں سمجھا' ناصر کے اسکول کے اساتذہ ہیں۔ اور بھائی سے تعزیت کرنے آئے ہیں۔

قریب ہی جالب بھائی بیٹھے تھے۔ میں نے ان سے کہا' کہ ناصر کے اسکول کے اساتذہ ہیں۔ شاید'

بھائی آپ ان سے نیچے جا کر ملاقات کر لیں۔

بھائی جالب' آنے والوں سے ملاقات کے لئے نیچے چلے گئے۔

کچھ ہی دیر بعد جالب بھائی کی آواز سنائی دی۔

سعید!

سعید!

وہ مجھے پکار رہے تھے۔

میں نے پھر کھڑکی سے جھانکا

نیچے آؤ

بھائی نے مجھے کہا۔

اور میں بھی نیچے گلی میں چلا گیا۔

بھئی سعید!

یہ ڈی ایس پی حضرات ہیں' اور مجھے ان کے ساتھ جانا ہوگا مگر فی الحال تم انہیں لے کر اوپر آؤ۔

یہ کہتے ہوئے جالب بھائی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اوپر چلے گئے۔

یقیناً جالب بھائی ڈی ایس پی حضرات سے پروگرام طے کر چکے ہوں گے لہٰذا میں نے ڈی ایس پی صاحبان سے کہا۔

آیئے!

اور پھر میرے پیچھے پیچھے چاروں ڈی ایس پی حضرات پہلی منزل پر ہمارے گھر کے صحن میں آ گئے۔

حبیب جالب کے گھر میں بیٹھنے' بٹھانے کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی۔ چھوٹے چھوٹے تین کمرے اور چھوٹا سا صحن' بس یہی گھر تھا۔

ابھی میں لیٹرین جاؤں گا۔ پھر ناشتہ کر کے چلتے ہیں۔ جالب بھائی نے ڈی ایس پی حضرات کو اپنے پروگرام سے آگاہ کیا۔

پھر بھائی مجھ سے مخاطب ہوئے

سعید! انڈا فرائی کر لو۔
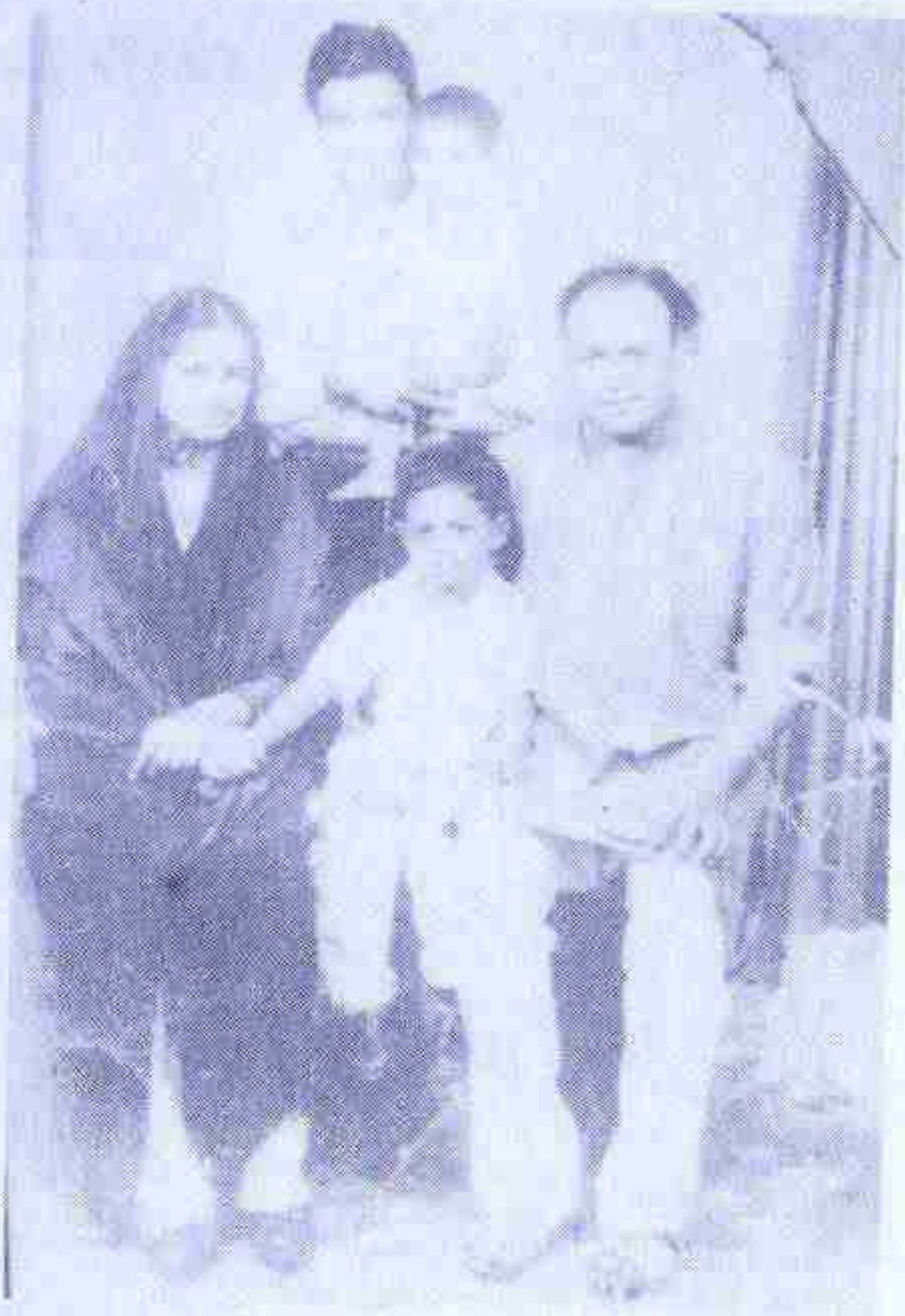
حبیب جالب، ممتاز جالب، درمیان میں ناصر جالب پیچھے کھڑے ہوئے
سعید پرویز۔ جن کی گود میں مرحوم طاہر عباس ہے۔ (۱۹۶۵ء)

یہ کہہ کر بھائی بیت الخلاء چلے گئے۔
چاروں ڈی ایس پی صاحبان صحن میں کھڑے تھے۔ میں نے جلدی سے انڈا فرائی کر لیا۔

بھائی نے بڑی تیزی میں ناشتہ کیا' اور پھر مجھ سے واسکٹ پکڑانے کو کہا۔ جو کھڑکی کے پٹ پر ٹنگی ہوئی تھی۔
میں نے واسکٹ بھائی کو دی۔ انہوں نے واسکٹ لی' نہ کسی بچے کی طرف دیکھا نہ انہیں پیار کیا' نہ ساتھ والے کمرے میں حالات سے بے خبر بھابھی اور والدہ سے ملے۔
پھر وہ تیزی سے پولیس والوں کے ساتھ سیڑھیاں اتر گئے۔
ساتھ والے کمرے میں اماں اور بھابھی تعزیت کے لئے آنے والی خواتین کے ساتھ بیٹھی تھیں' انہیں کچھ بھی پتہ نہ تھا کہ گھر میں کیا کچھ ہو چکا ہے۔ میں نے انہیں بتایا کہ بھائی کو پولیس گرفتار کر کے لے گئی ہے۔
اماں' بھابھی کو گرفتاری کا بتا کر میں تیزی سے نیچے اترا مگر پولیس بھائی کو لے جا چکی تھی۔
بازار میں لوگ جمع تھے۔

یار' ابھی تو اس کے بچے کا کفن بھی میلا نہیں ہوا تھا۔ بڑا ظلم ہے۔
حکومت کو گرفتار ہی کرنا تھا۔ تو کچھ دن رک جاتی اتنی فورس' اور جالب صاحب کے گھر کا گھیراؤ! جیسے حکومت محمد خان ڈاکو کو پکڑنے آئی ہو۔ لوگ آپس میں باتیں کر رہے تھے۔
میں اور ناصر (جالب بھائی کا بڑا بیٹا) میاں محمود علی قصوری صاحب کی طرف روانہ ہو گئے تاکہ انہیں بھائی کی گرفتاری کی اطلاع دی جائے۔ ہم میاں صاحب کی کوٹھی پہنچے' تو وہ گھر پر موجود تھے۔

ہم نے بھائی کی گرفتاری کے بارے میں انہیں بتایا' تو انہوں نے فوراً کمشنر لاہور کو فون کیا۔

حبیب جالب کو کس جرم میں پکڑا ہے۔
ایک تو میاں صاحب کی بھاری بھرکم آواز' اور پھر جالب بھائی کی گرفتاری!

میاں صاحب بہت غصے میں تھے۔

میاں صاحب! ہم نے جالب صاحب کو گرفتار نہیں کیا ہے۔

اسلام آباد سے لوگ آئے تھے۔

کمشنر لاہور کا جواب سن کر قصوری صاحب نے فون بند کر دیا۔

اب وہ اسلام آباد فون ملا رہے تھے۔

حبیب جالب کو کیوں پکڑا ہے؟

میاں صاحب مرکز سے پوچھ رہے تھے۔

ہم نے انہیں گرفتار نہیں کیا ہے۔

تو پھر کس نے پکڑا ہے جالب کو' کون لوگ اسے لے گئے ہیں۔ پتہ کرو۔

یہ کہتے ہوئے میاں صاحب نے فون بند کر دیا۔

صوبائی حکومت اور مرکز' دونوں جالب صاحب کی گرفتاری کی ذمہ داری قبول کرنے سے انکاری تھے۔

میاں صاحب' صوبے اور مرکز پر بری طرح برس رہے تھے۔ اسی دوران ایک صاحب آئے۔ اور انہوں نے بتایا کہ جالب صاحب ایف ایس ایف کی Custedy میں ہیں۔ اور لاہور ہی میں ہیں۔

یہ سن کر میاں صاحب بولے

دیکھ لوں گا۔

غنڈہ گردی مچا رکھی ہے۔

حکومت پر اپنی بھڑاس نکال کر' میاں صاحب ہم سے بولے۔

جالب کے گھر والوں کے لئے یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ تم لوگ گھر جاؤ' بھابھی کو تسلی دینا میں جالب کا پتا کر کے گھر اطلاع کروں گا۔

میاں صاحب کی کوٹھی سے نکل کر۔ میں اور ناصر ایف ایس ایف کے دفتر جا پہنچے۔ وہاں عجیب دہشت کی فضاء تھی۔ ادھر ادھر بھی سات فٹے نظر آ رہے تھے۔ مضبوط قد کاٹھ

والے۔

میں نے ایک کمرے میں بیٹھے ہوئے شخص سے کہا۔

جناب میں حبیب جالب کا بھائی ہوں۔ اور یہ ان کا بیٹا ہے۔ ہم اس لئے آئے ہیں۔ کہ ان کا ضروری سامان، کپڑے وغیرہ انہیں پہنچا دیں۔

میری بات سن کر وہ شخص یہ کہتے ہوئے اپنی سیٹ سے اٹھا، آپ بیٹھیں، میں ابھی آتا ہوں۔

میں نے ناصر، اور ناصر نے مجھے دیکھا۔ ہم دونوں سر جھکائے بیٹھے تھے۔ کہ وہ شخص کمرے میں داخل ہوا۔

آپ لوگ فوراً یہاں سے چلے جاؤ۔

اس شخص کا لہجہ بہت درشت تھا

مگر جناب.......

اوئے نکلو ادھرے

وہ شخص میری بات کاٹتے ہوئے بولا، اور پھر ہمیں کمرے سے نکال دیا۔

باہر برآمدے میں موجود ایف ایس ایف کے جوانوں نے بھی ہمیں باہر کا رستہ دکھایا۔

ہم دونوں چچا بھتیجا، سڑک پر آکر کھڑے ہو گئے۔ ابھی ہمیں سڑک پر کھڑے ہوئے چند منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ ایف ایس ایف والے آئے اور ہمیں گالیاں دیتے ہوئے بولے۔

یہاں سے دفع ہو جاؤ۔

ہم کر بھی کیا سکتے تھے۔ لہٰذا ہم وہاں سے چل دیئے، مگر میں سمجھ گیا تھا کہ یہ لوگ بھائی کو یہاں سے کہیں اور منتقل کرنا چاہتے ہیں۔

ہم گھر آ گئے۔ اماں، بھابھی بچے پریشان تھے۔ گرفتاری تو کوئی خاص بات نہیں تھی۔ گھر کی ویرانی و پریشانی کا سبب طاہر عباس کا غم تھا۔ ابھی دس روز پہلے ہی طاہر عباس ہم سے بچھڑا تھا۔ اور اس کے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بچھڑ جانے کا زخم تازہ ہی تھا۔ ان حالات میں بھائی

کی گرفتاری گھر والوں کے لئے ایک نیا تجربہ تھا۔

ایف ایس ایف والے پھر آئے

شام چار بجے ایف ایس ایف والے پھر آئے۔ اور بولے کہ جالب صاحب کا ضروری سامان، کپڑے وغیرہ پانچ بجے تک دفتر پہنچا دو۔ انہیں آج ہی کراچی لے جانا ہے۔
غم زدہ ماں، بچے کا غم بھول کر، ہمیشہ کی طرح بہادر شوہر کی بہادر بیوی بن کر کھڑی ہو گئی۔ شوہر کا اٹیچی کیس تیار کیا۔ میں اور ناصر اٹیچی کیس لیکر چلے۔ تو اماں بھی ہمارے ساتھ چلنے کے لئے تیار ہو گئیں۔ میں نے اماں سے کہا۔ کہ آپ نہ جائیں۔ مگر انہوں نے میری بات کو رد کر دیا۔
میں، ناصر اور اماں ایف ایس ایف کے دفتر پہنچے۔ چند گھنٹے قبل سامنے والی سڑک پر بھی ہمیں کھڑا ہونے کی اجازت نہ ملی تھی، مگر اب ہمیں کسی نے نہیں روکا۔
ہم جالب صاحب کا سامان لے کر آئے ہیں۔
ایک جگہ رک کر میں نے سامنے بیٹھے ہوئے جوانوں سے کہا۔
آپ جالب صاحب کی فیملی!
آیئے تشریف لایئے۔
ہمیں عمارت کے بالکل آخری کمرے میں لے جایا گیا۔ ہم کمرے میں داخل ہوئے، تو سامنے ہی ایک پلنگ پر جالب بھائی بیٹھے نظر آئے۔
اماں کو دیکھتے ہی جالب بھائی کھڑے ہو گئے۔
اماں نے بھائی کو دیکھا۔ اور وہ بولیں
بیٹا! میں نے ہمیشہ جاگتے میں تمہیں دودھ پلایا ہے۔ ہمت سے کام لینا۔

میں نے اس لمحے جالب بھائی کو دیکھا' ان کی آنکھوں میں پانی کی ایک ہلکی سی لکیر ابھری' اور پھر یک لخت وہیں جذب ہو کر ختم ہو گئی۔ یوں جیسے ابھرتے طوفانوں کے آگے کسی نے مضبوط بند باندھ دیا ہو۔

یار سعید! اماں کو کیوں تکلیف دی۔

جالب بھائی کہہ رہے تھے۔ ان کا لہجہ پر اعتماد تھا۔

دراصل اس بار طاہر عباس نے سارے معاملات گڈمڈ کر کے رکھ دیئے تھے۔

ایک باپ سے ان کا جوان بیٹا ہمیشہ کے لئے بچھڑ گیا تھا۔ اس لئے غم زدہ باپ کی ماں کو اسے حوصلہ دینے کی ضرورت آن پڑی تھی۔

کمرے میں ایف ایس ایف کے ڈائریکٹر صاحب بھی موجود تھے۔ اور وہ جالب صاحب سے کہہ رہے تھے۔

جناب! یہ آپ کا اور بھٹو صاحب کا معاملہ ہے ہم تو ملازم ہیں۔ اور مجبوراً یہ ناخوشگوار فرض ادا کرنا پڑ گیا ہے۔ ہم تو خود آپ کے بہت پرستار ہیں۔ اور جواب میں جالب صاحب بڑی شان کے ساتھ سر اٹھائے قلندرانہ جاہ و جلال کے ساتھ مسکرا رہے تھے۔

اس وقت' مجھے نرم خو شاعر حبیب جالب فولادی جثے والا' ناقابل تسخیر انسان لگ رہا تھا۔

جالب بھائی ایف ایس ایف والوں پر چھائے ہوئے تھے۔

جالب بھائی نے ہمیں چند ہی منٹ وہاں روکا۔ اور پھر مجھ سے بولے۔

اچھا بھئی سعید! اب اماں کو گھر لے جاؤ۔

رخصت ہوتے ہوئے اماں نے بھائی کی پیشانی کو چوما اور جواباً بھائی نے اماں سے کہا۔

آپ فکر نہ کریں۔

سب ٹھیک ہے۔

سب ٹھیک ہے۔

اور پھر اسی شام جالب بھائی کو بذریعہ طیارہ لاہور سے کراچی لایا گیا۔ جہاز کی سیڑھی کے

خان عبدالولی خان اور حبیب جالب

قریب ہی پولیس کی جیپ کھڑی تھی۔ جس میں بٹھا کر جالب صاحب کو حیدر آباد جیل پہنچا دیا گیا۔ جہاں اسی دن ملک کے مختلف حصوں سے نیپ کی مرکزی کمیٹی کے اراکین کو گرفتار کر کے پہنچایا جا رہا تھا۔

حیدر آباد جیل میں

جالب بھائی حیدر آباد جیل میں تھے' نیپ پر پابندی لگ چکی تھی اور اس کی مرکزی کمیٹی کے اراکین کو مقدمہ کا سامنا تھا۔ اس بار جالب بھائی کو گھر سے بہت دور رکھا گیا تھا۔ یوں آپا تاج (بیگم جالب) کو لاہور سے حیدر آباد کا طویل فاصلہ طے کرنا پڑتا تھا۔ اور وہ گھر کی جیل سے حیدر آباد جیل ملاقات کے لئے آتی تھیں۔

حیدر آباد سازش کیس کے نام سے شہرت پانے والا یہ مقدمہ کئی مہینوں سے چل رہا تھا' عدالت جیل کے اندر ہی لگتی تھی۔

ایک دن میری بیوی کے ماموں ظفر صاحب' جو پولیس انسپکٹر تھے (جن کا ذکر پہلے بھی ہو چکا ہے)۔ نے مجھے بتایا' کہ جالب کی حالت خراب ہے...... یہ سن کر میں بہت پریشان وگیا۔ اور فوراً حیدر آباد روانہ ہو گیا۔

بس نے مجھے جیل کے سامنے چھوڑا' جہاں سے میں پیدل چل کر جیل پہنچ گیا۔

میں حبیب جالب کا بھائی ہوں' اور ملاقات کے لئے آیا ہوں۔

حبیب جالب کا نام سن کر پولیس حوالدار نے مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا ادھر بیٹھو۔ یہ کہہ کر پولیس حوالدار اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہی حوالدار ایک پولیس انسپکٹر کے ساتھ آیا۔

آپ جالب صاحب کے بھائی ہو؟

انسپکٹر نے مجھ سے پوچھا۔

جی ہاں۔

ٹھیک ہے' ان کے کوائف رجسٹر میں نوٹ کرلو۔

حوالدار نے میرے کوائف رجسٹر میں نوٹ کر لئے۔ نام ولدیت' پیشہ' گھر کا پتہ۔ اور پھر میری جیبیں خالی کر دیں پیسے' قلم' کاغذات سب کچھ جمع کر لئے۔ اور پھر اپنے انسپکٹر کے پاس چلا گیا۔

فوراً ہی وہ انسپکٹر آ گیا۔ اور مجھے اپنے ساتھ لے کر ایک کمرے میں داخل ہوا۔ سادہ سادہ لباس میں کوئی صاحب بیٹھے تھے۔

جناب! یہ حبیب جالب کا بھائی ہے۔ اور ان سے ملاقات کے لئے آیا ہے۔

اتنا کہہ کر پولیس انسپکٹر چلا گیا۔

حبیب جالب کے موضوع پر میرا انٹرویو

سادہ لباس والے صاحب کے کمرے میں مجھے چھوڑ کر پولیس انسپکٹر جا چکا تھا۔

آپ تشریف رکھیں۔

سادہ لباس والے صاحب مجھ سے بولے

میں ان صاحب کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔

اب ان صاحب نے میرا انٹرویو لینا شروع کر دیا۔

آپ کا نام؟

جی سعید پرویز

آپ کے والد کا نام؟

صوفی عنایت اللہ

جالب صاحب کے والد کا نام؟

جی یہی

یہی نہیں نام بتائیں؟

ان صاحب کا لہجہ یک دم تبدیل سا ہو گیا۔
جی صوفی عنایت اللہ
جالب صاحب کے گھر کا پتہ بتائیں؟
منقیت منزل سنت نگر لاہور
اچھا
اچھا کہتے ہوئے ان صاحب نے اپنی جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا' اور میرے سامنے بڑھایا سگریٹ لیجئے!
جی نہیں شکریہ' میں سگریٹ نہیں پیتا۔
ان صاحب نے سگریٹ نکال کر سلگایا۔ اور پھر ایک سوال کر ڈالا۔
جالب صاحب نے سن ۷۰ء کا الیکشن کہاں سے لڑا تھا؟
جی گڑھی شاہو کے علاقہ سے۔
نہیں وہ تو سنت نگر کے علاقہ سے کھڑے ہوئے تھے۔
نہیں جناب! سنت نگر میں جالب صاحب رہتے ہیں۔ مگر صوبائی الیکشن' انہوں نے گڑھی شاہو اور ریلوے کالونی کے علاقے سے لڑا تھا۔
میں نے اپنے جواب کو مزید وضاحت کے ساتھ پیش کیا آپ کتنے بہن بھائی ہیں؟
میں نے اس سوال کا جواب تفصیل سے ہی دے دیا' تاکہ اگلے سوال کی نوبت ہی نہ آئے۔

ہم چار بھائی اور ایک بہن ہیں۔ مشتاق مبارک مرحوم' جالب صاحب' عبدالحمید خان' سعید پرویز اور رشیدہ مختار سوال و جواب کے سلسلے سے میں اکتا گیا تھا۔ پچھلے دو گھنٹے سے میں جیل کی حدود میں بیٹھا تھا۔ اور جالب بھائی مجھ سے چند ہی گز دور کہیں موجود تھے۔ مگر ان سے ابھی تک ملاقات نہیں ہو پائی تھی۔
جناب' بھائی سے میری ملاقات کروائیں
میں نے سامنے بیٹھے ہوئے صاحب سے کہا۔

آپ کی ملاقات کروادیتے ہیں۔

یہ کہتے ہوئے وہ صاحب پہلی بار مسکرائے۔ اور گھنٹی کا بٹن دبایا۔

گھنٹی کی آواز پر ایک سپاہی اندر آیا۔

ان صاحب نے سامنے رکھے ہوئے رجسٹر پر دستخط کئے اور رجسٹر سپاہی کو دیتے ہوئے کہا ڈپٹی صاحب کو دے دو۔

جالب کی شاعری پر ایف آئی اے کا تبصرہ

سپاہی رجسٹر لے کر جا چکا تھا۔ کچھ دیر کمرے میں خاموشی رہی۔ اور پھر وہی صاحب خاموشی کو توڑتے ہوئے بولے۔

میں ایف آئی اے انسپکٹر ہوں' اور جالب صاحب سے متعلق تمام امور میرے ذمہ ہیں۔ اس کیس سے متعلق سیاسی رہنماؤں سے ملاقات کے لئے آنے والے سبھی لوگوں کو ہم ملاقات کی اجازت نہیں دیتے۔ آپ چونکہ جالب صاحب کے بھائی ہیں۔ اور جالب صاحب نے بھی آپ کا نام کنفرم کر دیا ہے۔ اور میں بھی مطمئن ہوں۔ خیر چھوڑیئے۔

ابھی ملاقات ہو جائے گی۔

ایف آئی اے انسپکٹر بات ختم کرتے ہوئے بولا۔

حالات کی نزاکت کو مد نظر رکھتے ہوئے۔ میں خاموش ہی رہنے پر اکتفا کئے ہوئے تھا۔

خاموشی کو پھر ایف آئی اے انسپکٹر ہی نے توڑا۔

میرا نام یہ ہے۔ جب میں گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھتا تھا زمانہ طالب علمی سے ہی جالب صاحب کا پرستار تھا ہم طالب علم ان کی نظمیں خوب پڑھا کرتے تھے۔ ان کی شاعری ہمیں زبانی یاد ہوتی تھی۔

یہ کہہ کر وہ آنکھیں بند کئے۔ کچھ یاد کرنے لگا۔ اور پھر جالب بھائی کے شعر اس کے ہونٹوں پر مچلنے لگے۔

جب شباب پر آکر کھیت لہلہاتا ہے
کس کے نین روتے ہیں' کون مسکراتا ہے
کاش تم کبھی سمجھو
کاش تم کبھی جانو
دس کروڑ انسانو

جیل کی چار دیواری میں جالب بھائی کی شاعری ایک حساس ایجنسی کے اہلکار کی زبانی۔ یہ مجھے اچھا لگ رہا تھا۔

شعر سناتے سناتے ایف آئی اے انسپکٹر یک لخت رک گیا۔ اور پھر کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

اچھا آپ یہ بتائیں۔ کہ سرمقتل تو ایوب خان کے دور میں لکھی گئی۔ اور وہ کتاب اسی دور میں ضبط کرلی گئی۔ لیکن بعد کو آنے والے حکمرانوں نے بھی اس کتاب کو ضبط ہی رکھا۔ آخر کیوں؟

میں کچھ دیر خاموش رہا۔ جیسے میں سوال کا جواب سوچ رہا ہوں' اور پھر جیسے میں نے ہار مان لی ہو۔

جی آپ ہی فرمائیں۔

میں نے انسپکٹر صاحب سے کہا۔

دراصل حبیب جالب کی شاعری ہر آنے والے آمر' ظالم' جابر کے لئے گالی ہے۔ ایک ایسا آئینہ ہے۔ جس میں وہ اپنا چہرہ دیکھتا ہے۔ اور تڑپ اٹھتا ہے۔

جالب بھائی سے میری ملاقات

پولیس کا سپاہی مجھے لے جانے کے لئے آچکا تھا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ حتیٰ کہ ہم ایک خوبصورت کمرے میں داخل ہو گئے۔ دبیز قالین قیمتی پردے' کمرے کی آرائش بڑی

توجہ سے کی گئی تھی۔

سامنے ہی صوفے پر جالب بھائی بیٹھے تھے۔ بڑے ہشاش' بشاش ان کے چہرے کا رنگ بھی سرخ سرخ نظر آرہا تھا وہ بالکل صحت مند تھے۔ میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا۔ کہ ظفر صاحب کی اطلاع غلط ثابت ہوئی۔ میں جالب بھائی کے قریب صوفے پر بیٹھ گیا۔ اور گھر کی باتیں شروع کردیں۔ مگر بھائی بہت خاموش تھے۔ اور صرف ہوں' ہاں' اچھا' بس اتنا ہی میری باتوں کا جواب دے رہے تھے۔

کمرے میں ہمارے علاوہ ایس پی جیل اپنے دو ماتحتوں سمیت سامنے والے صوفے پر موجود تھے اس کمرے کا سائز ۱۵x۱۵ فٹ تھا۔ خاصا بڑا کمرہ تھا۔

پانچ دس منٹ کی ملاقات کے بعد جالب بھائی مجھ سے بولے۔

اچھا اب تم جاؤ۔

یہ کہہ کر جالب بھائی کھڑے ہوگئے۔ اور مجبوراً میں بھی کھڑا ہو گیا یہ تو میں سمجھ گیا تھا۔ کہ بھائی صاحب کمرے میں ایس پی جیل کی موجودگی کی وجہ سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتے تھے۔ مگر اصل وجہ بھائی نے مجھے جیل سے رہائی کے بعد بتائی۔

جب میں نے ان سے پوچھا۔ کہ اس دن آپ نے مجھے اتنی جلدی جانے کے لئے کہہ دیا۔ تو انہوں نے بتایا۔ کہ اس کمرے میں حساس مائیکروفون نصب تھے اور یوں تمام گفتگو ٹیپ کی جاتی تھی۔

جالب صاحب میرے اسکوٹر پر پی این اے کے جلسہ میں گئے تھے

پاکستان قومی اتحاد کی تحریک زوروں پر تھی۔ ملک بھر کی طرح کراچی میں بھی بڑے بڑے جلسے جلوس ہو رہے تھے۔ ملک بھر کی طرح نیپ بھی اس اتحاد میں شامل تھی۔ اسی زمانے میں ایک بہت بڑا جلوس کراچی شہر میں نکالا گیا تھا' اور اس جلوس کی قیادت کے لئے اصغر خان اور جالب صاحب لاہور سے کراچی آئے تھے۔

ہوائی جہاز صبح دس گیارہ بجے پہنچا تھا' اور کراچی ایئرپورٹ سے جلوس روانہ ہو کر تمام دن چلتا رہا۔ اور پھر آدھی رات کے بعد برنس روڈ پہنچا۔

اس رات جلوس کے اختتام پر جالب بھائی جب گھر پہنچے۔ تو ان کے پاؤں مسلسل بارہ گھنٹے ٹرک پر کھڑے رہنے کی وجہ سے سوج گئے تھے۔

اگلے روز شارع قائدین پر مزار قائداعظم کے پاس پی این اے کا بہت بڑا جلسہ ہوا۔ اس جلسہ کے خصوصی مقرر ایئر مارشل (ریٹائرڈ) اصغر خان اور حبیب جالب تھے۔ انہی دونوں حضرات کے خطاب کے ساتھ جلسہ کا اختتام ہوا تھا۔

اس جلسہ میں شرکت کے لئے جالب صاحب میرے گھر واقع جہانگیر روڈ سے' میرے اسکوٹر پر بیٹھ کر گئے تھے۔ جب میں انہیں لے کر کاسمو پولیٹن کلب والی سڑک پر پہنچا تو عوام نے جالب صاحب کو دیکھتے ہی حبیب جالب زندہ باد کے نعرے لگانا شروع کر دیئے' بھائی میرے اسکوٹر سے اترے اور پھر عوام اپنے شاعر کے لئے اسٹیج تک جانے کا راستہ بناتے گئے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے' وہ شخص جو کچھ دیر پہلے میرے اسکوٹر پر بیٹھ کر آیا تھا۔ اسٹیج پر نظر آ رہا تھا۔

جالب صاحب کی اسٹیج پر آمد کے ساتھ ہی جلسہ کی کارروائی رک گئی۔ اور پھر جالب صاحب دیر تک اسٹیج کے چاروں طرف دور دور تک نظر آنے والے لاکھوں عوام کے نعروں کا ہاتھ ہلا ہلا کر جواب دیتے رہے۔

رات گئے تک یہ جلسہ جاری رہا تھا۔

ٹی وی والے بھاگ لئے ۱۹۷۸ء

جنرل ضیا برسراقتدار آ چکے تھے۔ حیدر آباد ٹریبونل توڑ دیا گیا تھا اور نیپ کے خلاف مقدمہ ختم کر دیا گیا تھا۔ اس وقت "آنے والوں" نے "جانے والوں" کے حوالے سے ٹی وی پر ایک پروگرام شروع کیا تھا "ظلم کی داستانیں" اس پروگرام میں سیاسی' نیم سیاسی لوگ

آتے تھے۔ اور بھٹو دور حکومت میں ان پر جو مظالم ڈھائے گئے تھے۔ وہ بیان کرتے تھے۔

بڑے بڑے سیاسی نام اس پروگرام کی نذر ہو گئے۔

ٹی وی والے اپنا سازو سامان اٹھائے کئی دنوں سے جالب صاحب کے پیچھے پیچھے پھر رہے تھے۔ مگر جالب صاحب پکڑائی میں آہی نہیں رہے تھے۔ جب جب ٹی والوں نے ان سے کہا۔ کہ جناب آپ پر بھی بھٹو صاحب کے دور میں بڑے ظلم ہوئے آپ انہیں ریکارڈ پر لائیں۔ تو جالب صاحب نے انہیں ڈانٹ کر بھگا دیا۔ اور کہا۔ کہ مجھ پر کوئی ظلم نہیں ہوا۔ مگر ٹی وی والے مسلسل اس کوشش میں جالب صاحب کے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ کہ کسی طرح وہ ظلم کی داستانیں پروگرام کے لئے ریکارڈنگ کروادیں۔

اسی مقصد سے ایک دن ٹی وی والے اپنے سازو سامان سمیت صبح صبح جالب صاحب کے گھر پہنچ گئے۔ جالب صاحب نے انہیں دیکھا۔ تو بولے کہ اچھا چلو ریکارڈنگ کرلو۔

ٹی وی والے جالب صاحب کی رضا مندی پر بہت خوش ہوئے۔ اور انہوں نے جلدی جلدی اپنا سامان لگانا شروع کردیا۔

ریکارڈنگ کے لئے ٹی وی والے اپنے کیمرے سنبھالے تیار تھے۔

جی' جالب صاحب شروع کیجئے۔

اور جالب صاحب شروع ہو گئے۔

میری ظلم کی داستان یہ ہے" کہ ٹی وی والے گزشتہ کئی روز سے میرے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ اس سے بڑا ظلم میرے پورے سیاسی کیریئر میں میرے ساتھ نہیں ہوا۔ اتنا سننا تھا" کہ ٹی وی والے اپنا سازو سامان لے کر بھاگ نکلے۔ اور پھر پلٹ کر نہیں آئے۔

ملتان شریف۔ والد صاحب کی ابدی آرام گاہ

ہمارے والد صاحب کو ملتان شہر سے عشق تھا۔ انہوں نے تمام زندگی اس شہر کو ملتان شریف کہہ کر پکارا اور لکھا۔ بزرگان دین و اولیاء اللہ فقراء سے ہمارے خاندان کا ازلی لگاؤ

ہے۔ اور ابد تک رہے گا۔ (انشاللہ) اسی لگاؤ کی وجہ سے پیروں' ولی اللہ کے شہر ملتان سے والد صاحب کو قلبی لگاؤ تھا۔

۷ا جنوری ۱۹۸۱ء کے دن ہمارے والد صاحب کا پچاسی برس کی عمر میں انتقال ہوا۔ آخری دنوں میں وہ کمزوری کے باعث چل پھر نہیں سکتے تھے۔ مگر ملتان شریف کی مٹی کا پیار' اور بزرگان دین سے والہانہ عشق' ہمارے والد صاحب کو وفات سے چند روز قبل ملتان لے آیا۔ جہاں انہوں نے آخری ایام اپنے چھوٹے بھائی' ہمارے چچا اقبال کے گھر گزارے۔ ابا کے انتقال سے تین روز قبل میں ملتان پہنچا تھا۔ جہاں ہمارے بھتیجے مقصود جہانگیر (مشتاق مبارک صاحب کا بیٹا) کی شادی ہمارے چچا کی بیٹی زاہدہ سے ہو رہی تھی۔

والد صاحب بہت کمزور ہو چکے تھے۔ مگر نماز اس حالت میں بھی نہیں چھوڑی۔ شادی سے ایک دن پہلے ابا جی "کوما" میں چلے گئے۔ میں انہیں ایمبولینس میں ڈال کر نشتر اسپتال ملتان لے گیا۔

لاہور میں جالب بھائی کو اور کوئٹہ حمید بھائی کو میں نے اطلاع بھجوا دی۔ کہ جلدی ملتان پہنچیں۔ جالب بھائی کا ملتان میں داخلہ بند تھا۔ مگر ابا جی قریب المرگ پڑے تھے۔ لہٰذا وہ آگئے۔ اسپتال میں ابا کو دیکھا۔ وہ بے ہوش تھے۔ کچھ دیر وہاں رکے اور پھر چلے گئے۔ کہ ان کے ملتان آنے کی مخبری نہ ہو جائے۔

اگلے روز حمید بھائی بھی کوئٹہ سے آگئے۔ والد صاحب کی وہی حالت تھی۔ بس سانس چل رہی تھی۔ ڈاکٹرز نے جواب دے دیا تھا۔ سبھی آگئے تھے۔ بس لاہور سے جالب بھائی کے بڑے بیٹے ناصر کا انتظار تھا۔ دوسرے دن صبح وہ بھی آگیا۔ ناصر سے ہمارے ابا کو بہت پیار تھا۔ وہ اسپتال آیا' اس نے اپنے دادا کا سر اپنے ہاتھوں کی ہتھیلیوں میں لیا اور کہا

ابا جی!

اور ابا جی کی گردن ایک طرف لڑک گئی۔

یوں جیسے انہیں ناصر ہی کا انتظار تھا۔

غوث بہاء الحقؒ اور شاہ شمس سبزواریؒ

والد صاحب کی تدفین کے لئے یہی خیال میرے ذہن میں آیا۔ کہ انہیں اپنے شہر کراچی لے جا کر سپرد خاک کریں گے۔ مگر پھر مجھے یاد آیا۔ کہ وہ تو تمام عمر ملتان شریف کے عشق میں مبتلا رہے۔ اور پھر مجھے یہ بھی یاد آیا۔ کہ ۶۲۔۱۹۶۱ء میں جب وہ گل گشت کالونی والا مکان بنوا رہے تھے۔ تو وہ جب بھی تانگہ میں بیٹھ کر بیرون دولت گیٹ والے قبرستان سے نکلتے۔ تو کہا کرتے۔ کہ یہ قبرستان بہت اچھا ہے۔ یہاں سے حضرت غوث بہاؤ الحقؒ اور شاہ شمس سبزواریؒ کے مزارات صاف نظر آتے ہیں۔

یہ واقعہ یاد آتے ہی۔ میں نے جالب بھائی اور حمید بھائی سے کہا۔ کہ والد صاحب کی خواہش کے مطابق ملتان کی مٹی انہیں یہاں کھینچ لائی ہے۔ اب ان کی تدفین ملتان ہی میں ہوگی۔ اور بیرون دولت گیٹ والے قبرستان میں انہیں سپرد خاک کیا جائے گا۔ کیونکہ وہ جگہ انہیں بہت پسند تھی۔

اور قدرت کی شان دیکھئے کہ جہاں ہمارے والد صاحب مدفون ہیں۔ وہ جگہ قبرستان کا ایک اونچا ٹیلہ ہے۔ اور وہاں سے حضرت غوث بہاء الحق ذکریاؒ اور حضرت شاہ شمس سبزواریؒ کے مزارات اور ان کے گنبد صاف نظر آتے ہیں۔

ملتان کی انتظامیہ نے جالب صاحب کے خلاف ایکشن نہیں لیا

والد صاحب کی نماز جنازہ قبرستان کی مسجد میں ادا کی گئی جالب بھائی ملتان ہی میں تھے۔ وہ سیدھے قبرستان پہنچے۔ اور تجہیز و تکفین کے فوراً بعد چلے گئے۔ جالب صاحب پر ملتان میں داخل ہونے کے لئے پابندی تھی۔ ملتان کی انتظامیہ کے علم میں تھا۔ کہ حبیب جالب اپنے والد کے انتقال پر آئے ہوئے ہیں۔ مگر انہوں نے جالب صاحب کے خلاف کوئی ایکشن نہیں لیا۔

میر علی احمد تالپور وزیر دفاع پاکستان میلی چادر پر بیٹھ گئے

ہمارے والد صاحب کا انتقال ۱۹۸۱ء میں ہوا تھا۔ اس وقت میر علی احمد تالپور ضیاء گورنمنٹ میں وزیر دفاع پاکستان تھے۔ بھائی سے ان کی پرانی دوستی تھی۔ ایک دن تالپور صاحب ہمارے والد کی تعزیت کے لئے گھر تشریف لائے۔ بھائی جالب مقیت منزل چوک سنت نگر والے گھر ہی میں رہ رہے تھے۔ میں بھی اتفاق سے لاہور آیا ہوا تھا۔

دن کے گیارہ یا بارہ بجے ہوں گے کہ گھر کے دروازے پر کسی نے دستک دی۔ میں دروازے پر گیا۔ دیکھا تو میر علی احمد تالپور کھڑے مسکرا رہے تھے۔

بابا! جالب صاحب ہیں؟

جی ہاں! ہیں

یہ کہتے ہوئے میں نے انہیں اندر آنے کی دعوت دی۔

سامنے والے کمرے میں جالب بھائی موجود تھے۔

تالپور صاحب' جالب بھائی کو دیکھ کر اسی کمرے میں داخل ہوگئے۔

آیئے تالپور صاحب

جالب بھائی میر صاحب کے استقبال کے لئے کھڑے ہوگئے۔ میں دیکھ رہا تھا۔ دونوں دوست خلوص و محبت کے ساتھ گلے مل رہے تھے۔

بھئی سعید! تالپور صاحب کو بٹھاؤ

جالب بھائی مجھ سے بولے

اور میں پریشان ہوگیا کہ بھائی تالپور صاحب کو بٹھانے کا کہہ رہے ہیں اور گھر میں تو کرسی تک نہیں ہے۔ ایک صوفہ پڑا تھا۔ کہ جس کے اسپرنگ نکل کر باہر آگئے تھے۔

جالب بھائی میری پریشان کو سمجھ گئے' اور انہوں نے قریب پڑی ہوئی میلی چادر اٹھائی اور بولے۔

اسے بچھاؤ۔

حبیب جالب کا اس چادر کو چھونا تھا۔ کہ میرا اندر کا چھوٹا پن اعتماد میں بدل گیا۔ اور میں نے وہ میلی چادر فرش پر بچھا دی۔ بھرپور اعتماد کے ساتھ۔ اور میر علی احمد تالپور وزیرِ دفاع پاکستان اس میلی چادر پر بیٹھ گئے۔ بلکہ پورے دو گھنٹے بیٹھا رہے۔

گھر میں بھابی موجود نہیں تھیں۔ لہٰذا میں بازار سے چائے لایا۔ تالپور صاحب نے والد صاحب کے لئے فاتحہ پڑھی۔ اور پھر میں اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلا آیا۔

تالپور صاحب اور جالب صاحب دیر تک سیاست' ادب وغیرہ پر باتیں کرتے رہے۔ اور اس طرح جھنڈے والی لمبی سیاہ کار دیر تلک میلے محلے میں کھڑی رہی۔

رسول بخش تالپور

تالپور برادران سے جالب بھائی کی دوستی مثالی تھی اس دوستی کے موضوع پر ایک کتاب لکھی جاسکتی ہے۔ رسول بخش تالپور صاحب سے میری پہلی ملاقات ان کی کراچی والی قیام گاہ پر ہوئی تھی۔

میں تالپور صاحب کے بنگلے میں داخل ہوا۔ میر علی احمد صاحب اور میر رسول بخش صاحب لان میں کرسیاں ڈالے۔ احباب کے ساتھ گفتگو میں مصروف تھے۔ میرے بچے فرحان اور ذیشان بھی میرے ساتھ تھے جنہیں میں نے اسکول سے لیا تھا۔ فرحان' ذیشان لان میں کھیلنے لگے۔ اور میں نے بڑھ کر علی احمد تالپور صاحب اور رسول بخش تالپور صاحب کو سلام کیا۔

رسول بخش تالپور صاحب سے میری پہلی ملاقات تھی۔ لہٰذا وہ مجھے نہیں پہچانتے تھے۔ ان کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔ بڑے میر صاحب نے میرا تعارف کروایا۔

یہ جالب صاحب کا بھائی ہے۔

اس ایک فقرے نے میر رسول بخش تالپور اور میرے درمیان سارے فاصلوں کو سمیٹ

لیا۔ اب ان کی آنکھوں میں پیار کی چمک تھی۔ اور چہرے پر اپنائیت بھری مسکراہٹ۔

میرے تعارف کے بعد گفتگو کا موضوع حبیب جالب بن گیا۔ میں کچھ دیر وہاں رہا' اور پھر جانے کی اجازت چاہی۔ دونوں پیارے بھائیوں نے مجھے پیار سے رخصت کیا۔ میں نے اپنے بچوں' فرحان' ذیشان کو لیا۔ اور ہم تالپور صاحبان کے بنگلے سے روانہ ہو گئے۔ ابھی ہم بمشکل چند سو گز دور ہی گئے ہوں گے کہ میرا بیٹا ذیشان بولا۔

ڈیڈی! میرا اسکول بیگ وہیں رہ گیا۔

میں نے یہ سن کر اپنا اسکوٹر دوبارہ تالپور صاحبان کے بنگلے کی طرف موڑ دیا۔

رسول بخش صاحب مجھے دیکھ کر بولے

خیریت ہے میاں!

میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی۔ میرا بیٹا ذیشان' گھاس پر پڑے ہوئے اپنے اسکول بیگ کو اٹھانے کے لئے بھاگا۔

یہ دیکھ کر رسول بخش صاحب نے مسکراتے ہوئے میرے بچے ذیشان کو دیکھا۔ اور بولے

ارے بیٹا! تیرا تایا ابا بھی اپنی چیزیں بھول جاتا ہے۔ اور تو بھی اپنے تایا کی طرح اپنا اسکول بیگ بھول گیا۔

مولانا نورانی بولے' جالب صاحب نے دعا کر دی۔ اب میرا بیٹا صحت یاب ہو جائے گا

جالب بھائی' جب بھی کراچی آتے تو مجھ سے ضرور پوچھتے کہ شہر کا کیا حال ہے۔ پھر میں انہیں شہر کی چیدہ چیدہ خبریں سناتا۔

ایک بار جالب بھائی کراچی آئے۔ ان دنوں مولانا شاہ احمد نورانی صاحب کا بیٹا۔ روڈ ایکسیڈنٹ میں شدید زخمی ہو کر جناح اسپتال میں پڑا تھا۔ اور حالت نازک تھی۔

حسب عادت جالب صاحب نے مجھ سے پوچھا

ہاں بھئی کیا خبریں ہیں۔

میں نے پہلی ہی خبر شاہ صاحب کے بیٹے کی سنائی۔

یہ خبر سنتے ہی وہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

چلو، مجھے ہسپتال لے چلو، میں بھائی صاحب کو اسکوٹر پر بیٹھا کر جناح اسپتال لے آیا سرجیکل وارڈ میں پہنچے۔ نورانی صاحب کی بیگم صاحبہ اپنے بیٹے کے پاس موجود تھیں۔ انہوں نے سیاہ برقعہ پہن رکھا تھا۔ اور چہرے پر نقاب پڑا تھا۔ بیٹا زخمی حالت میں بے ہوش پڑا تھا۔

بی بی! السلام علیکم

میں حبیب جالب ہوں۔ آپ کے بچے کی خیریت معلوم کرنے آیا تھا۔ خدا آپ کے بچے کو صحت دے۔

بھائی صاحب کی آمد پر بیگم مولانا نورانی نے ان کا شکریہ ادا کیا۔

نہیں بی بی! یہ تو میرا فرض تھا، مجھے تو آنا ہی تھا۔ خدا بچے کو صحت دے ان دعائی کلمات کے ساتھ بھائی نے اجازت چاہی۔ اور ہم ہسپتال سے باہر آگئے۔

چلو بھئی اب نورانی میاں کے گھر لے چلو۔

جالب بھائی نے اپنے پروگرام سے مجھے آگاہ کیا۔

اسکوٹر پر جناح اسپتال سے نورانی میاں کے گھر ہم پانچ منٹ میں پہنچ گئے پھل والے کی دوکان کے ساتھ زینہ چڑھ کر ہم پہلی منزل پر پہنچے۔ اور سامنے والے بند دروازے پر دستک دی۔

کوئی صاحب دروازے پر آئے۔

مولانا ہیں؟

میں حبیب جالب ہوں۔

بھائی کا نام سن کر دروازہ کھولنے والا، فوراً اندر چلا گیا۔ اور پھر دوسرے ہی لمحے مولانا نورانی دروازے پر نمودار ہوئے۔

زہے نصیب!

زہے نصیب۔ کہ غریب خانہ پر جالب صاحب تشریف لائے۔ مولانا نورانی' انتہائی تپاک سے ملے۔

حضرت جی!

میں ابھی بیٹے کو ہسپتال میں دیکھ کر آرہا ہوں' بی بی بھی وہاں تھیں' میں نے بیٹے کے لئے دعا کی ہے۔ انشا اللہ وہ ٹھیک ہو جائے گا۔

جالب صاحب اندر تو آیئے۔

تشریف لایئے

مولانا نے دروازے کے دونوں پٹ کھول دیئے اور پھر ہم ایک نہایت مختصر سے کمرے میں داخل ہوئے۔ جہاں ایک عام سا صوفہ پڑا ہوا تھا۔

تشریف رکھیئے

نورانی میاں نے صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جالب صاحب بیٹھ گئے۔ تو نورانی میاں بولے جالب صاحب آپ نے دعا کر دی ہے۔ اب مجھے یقین کامل ہے کہ خدا آپ کی دعا کے طفیل میرے بچے کو ضرور صحت عطا کر دے گا۔

اَسّی کی دہائی اسپتالوں میں گزری مشن پھر بھی جاری رہا۔

جالب بھائی ۲۴ مارچ ۱۹۲۸ء کے دن پیدا ہوئے تھے۔ ۱۹۷۸ء میں ان کی پچاسویں سالگرہ پورے ملک بلکہ کئی ممالک میں بھی منائی گئی۔ روس کی لوممبا یونیورسٹی سے طلباء نے سالگرہ کے موقع پر بطور یادگار کارل مارکس کا مجسمہ جالب صاحب کو بھیجا تھا۔ مگر ۸۰ء کی دہائی کے آغاز کے ساتھ ہی بھائی صاحب کے جسم میں ٹوٹ پھوٹ کا عمل شروع ہو گیا۔ پہلے پتے کا آپریشن گنگا رام اسپتال لاہور میں ہوا۔ ایک ڈیڑھ سال بعد مثانے کا آپریشن سروسز اسپتال لاہور میں ہوا۔

فیض، دامن، جالب

جالب بھائی کے مثانے کا آپریشن ہوا تھا۔ اور وہ سروسز ہسپتال لاہور میں پڑے تھے۔ اسی ہسپتال کے ساتھ والے کمرے میں پنجابی زبان کے عظیم شاعر استاد دامن لیٹے ہوئے تھے۔ اور اسی شہر لاہور میں اپنے عہد کا بڑا شاعر فیض احمد فیض اپنی داستان کے آخری صفحات رقم کر رہا تھا۔

فیض صاحب کے انتقال پر استاد دامن انتہائی نگہداشت کے شعبہ سے زبردستی اٹھ کر اپنے یار کے جنازے کو کندھا دینے چلے گئے۔ مگر جالب صاحب آپریشن کے باعث بستر سے نہ اٹھ سکے۔ اور انہوں نے اپنے فیض کو ہسپتال کے بستر ہی سے رخصت کیا۔

فیض اور فیض کا غم بھولنے والا ہے کہیں۔

کمزور و ناتواں جان کر پاسپورٹ بحال جالب صاحب نے چیلنج قبول کیا

ایوب خان صاحب کی حکومت میں جالب بھائی کا پاسپورٹ ضبط کیا گیا تھا۔ ان کے بعد کی حکومتوں نے بھی پاسپورٹ بحال نہیں کیا۔ جنرل ضیاء کے دور میں پاسپورٹ بحال کر دیا گیا۔ تقریباً بیس سال بعد بھائی جالب کا پاسپورٹ بحال کیا گیا تھا۔

گو اب وہ جوانی والا دم خم تو نہیں رہا تھا۔ مگر جالب صاحب نے ہمت ہارنا سیکھا ہی نہیں تھا۔ وہ تو کہا کرتے تھے ”آخری سانس تک سچائیوں کے ساتھ زندہ رہنا“ اور پھر جالب بھائی وطن پاکستان سے باہر اپنے چاہنے والوں سے ملنے، امریکہ، کینیڈا، فرانس، جرمنی، ناروے، سویڈن، لندن، روس، خلیج کی ریاستوں اور ہندوستان گئے۔ اور ان ممالک کے یادگار اور کامیاب دورے کیے۔

احمد فراز اور حبیب جالب کراچی بدر

کراچی پریس کلب' پاکستان کا ہائیڈ پارک کہلاتا ہے۔ اس کے احاطہ میں بڑے بڑے یادگار اجتماعات ہوئے ہیں۔ جالب صاحب اس کلب کے تاحیات رکن تھے یہ رکنیت انہیں ۲۵ دسمبر ۱۹۸۰ء کے دن دی گئی تھی' کہ جس دن اسلام آباد میں اکیڈمی آف لیٹرز کا افتتاحی اجلاس ہو رہا تھا' جہاں جنرل ضیاء صاحب نے ادیبوں شاعروں سے خطاب کرنا تھا۔

۱۹۸۵ء میں اسی پریس کلب میں احمد فراز اور حبیب جالب کے ساتھ ایک شام منائی گئی' حسب روایت کراچی پریس کلب کے پچھواڑے پارکنگ کا حصہ کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ سامعین میں بیگم نصرت بھٹو صاحبہ بھی موجود تھیں۔

جالب اور فراز کی نظمیں' غزلیں' جی بھر کے سنی گئیں۔ پروگرام کے اختتام پر دونوں شاعر اپنے اپنے آئندہ پروگرام کے لئے روانہ ہوگئے۔ جالب صاحب اپنے بچپن کے دوست (اور سارک چیمبر کے موجودہ چیئرمین) ایس ایم انعام کے گھر رات کے کھانے پر مدعو تھے۔

ایس ایم انعام کے یہاں شہر کے چند اہم لوگ بھی موجود تھے۔ جالب صاحب کے ساتھ رات گئے تک نشست رہی۔ محفل جاری ہی تھی۔ کہ رات ایک بجے پولیس آگئی۔

پولیس کا کہنا تھا کہ جالب صاحب کے کراچی بدری کے احکامات سمیت ان کا ہوائی جہاز کا ٹکٹ ہمارے پاس ہے انہیں ابھی نائٹ کوچ سے لاہور پہنچانا ہے۔

پولیس کا پیغام سن کہ انعام صاحب نے جالب صاحب سے پوچھا۔

ہاں بھئی جالب اب کیا پروگرام ہے لاہور سرکاری کھاتے میں جانا ہے؟

بھائی جالب نے کہا

نہیں ابھی میں کراچی میں رہنا چاہتا ہوں

اور پھر وہ کسی طرح نکل کر ڈاکٹر ادیب رضوی کے وارڈ' سول ہسپتال چلے گئے۔

اسی رات پولیس نے احمد فراز صاحب کو میٹروپول ہوٹل سے رات ڈھائی بجے اٹھایا' اور انہیں راولپنڈی جانے والے جہاز پر سوار کرا دیا۔
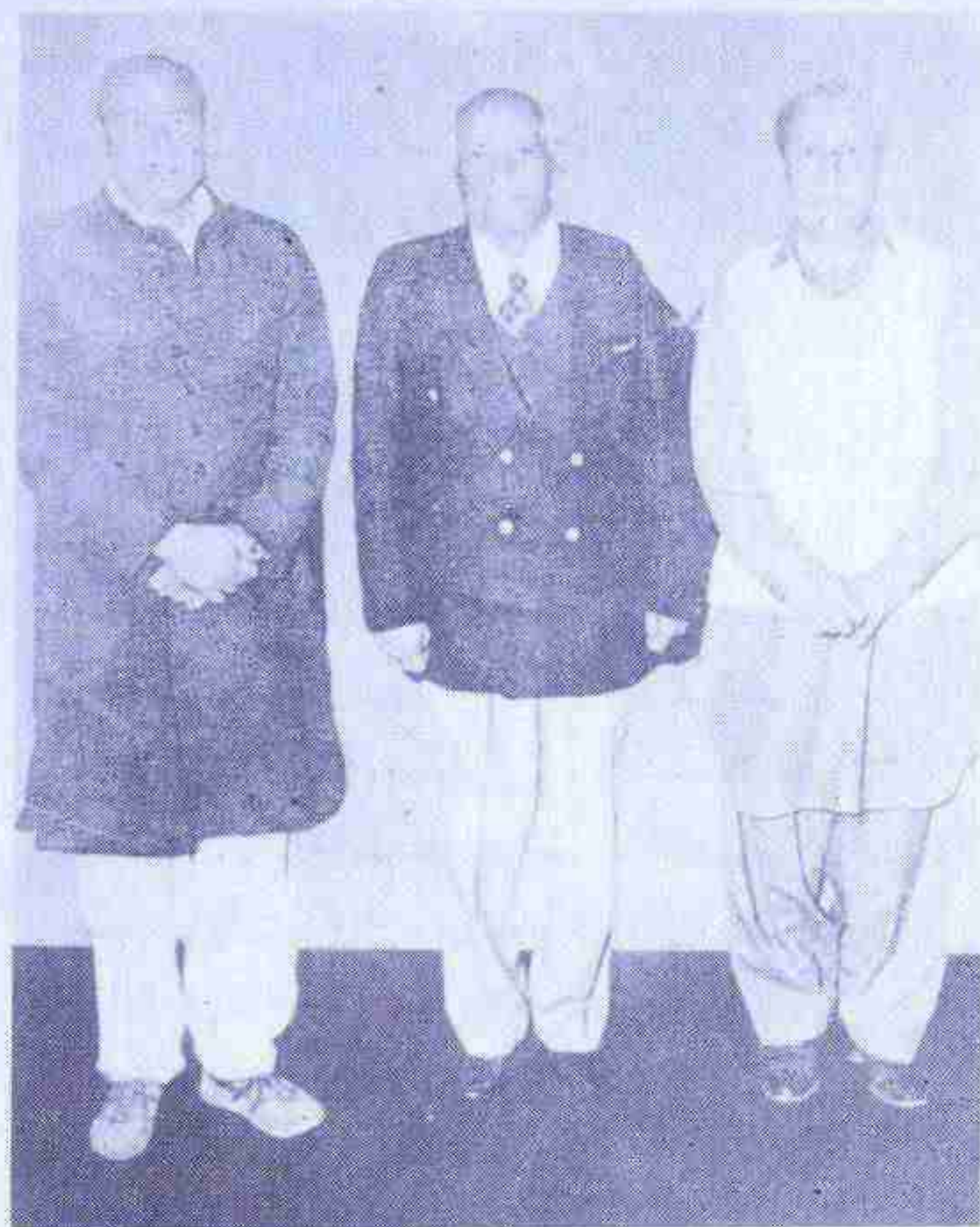
قتیل شفائی، فیض احمد فیض اور حبیب جالب

ڈاکٹر ادیب رضوی کا وارڈ

دوسرے دن پولیس والے، سول اسپتال رضوی صاحب کے وارڈ میں آگئے۔ ڈاکٹر صاحب پہلے سے پولیس کے منتظر تھے۔

پولیس والوں کو وارڈ کے باہر دروازے کے باہر روک دیا گیا۔ اور ڈاکٹر ادیب رضوی خود باہر گئے۔ اور پولیس والوں سے کہا کہ جالب صاحب میرے زیرِ علاج ہیں۔ اور یہ سفر کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ پولیس والے ڈاکٹر صاحب سے مل کر چلے گئے۔ اور جالب بھائی ڈاکٹر ادیب رضوی کے وارڈ میں چند دن رہ کر ایک دن نکلے اور غائب ہو گئے۔

ادیب رضوی صاحب، جالب صاحب کے یوں اچانک لاپتہ ہو جانے پر بہت پریشان ہوئے۔ ان کے سارے دوستوں کے یہاں فون کر لئے۔ مگر کہیں سے ان کا سراغ نہیں مل رہا تھا۔ آخر پتہ چلا کہ موصوف لاہور پہنچ چکے ہیں۔ کچھ دن بعد ڈاکٹر صاحب سے ملاقات ہوئی تو وہ کہنے لگے۔

بھئی سعید میاں

میں اخبار میں اشتہار دے رہا ہوں۔ کہ حبیب جالب نامی ایک مریض میرے وارڈ سے بلا اجازت چلا گیا ہے۔ اگر وہ پڑھے تو جہاں کہیں بھی ہو واپس آجائے۔ اسے کچھ نہیں کہا جائے گا۔

پھر اچانک رضوی صاحب کا خوشگوار موڈ تبدیل ہو گیا' وہ سر جھکائے کچھ سوچنے لگے اور پھر بولے۔

عجب شخص ہے۔

خدا اسے صحت دے

حبیب جالب ڈاکٹر ادیب رضوی کے وارڈ (سول ہسپتال کراچی) میں

یک جان دو قالب

مجاہد اور حبیب جالب

جالب صاحب اور بیماری دونوں ساتھ ساتھ چل رہے تھے' بیماری بھی ڈٹی ہوئی تھی اور جالب صاحب بھی ہار ماننے والے نہیں تھے۔

مگر "گلاب دیوی" ہسپتال والوں نے (کہ جو کسی زمانے میں ٹی بی سینٹوریم ہوتا تھا۔) پہلی بار جالب صاحب کے بارے میں رپورٹ دی کہ انہیں پھیپھڑوں کی ٹی بی ہے۔ اس کے بعد کراچی کے "انکل سریا" ہسپتال میں ڈاکٹر بدر صدیقی اور دوسرے ڈاکٹروں نے جالب بھائی کا معائنہ کیا۔ اور اس مرض کی تصدیق کردی۔

ڈاکٹروں کے بورڈ نے میری موجودگی میں جالب بھائی سے کہا کہ روزانہ صبح اٹھنے سے پہلے اور رات کو سونے سے پہلے چارپائی پر لیٹ جائیں' اور پیروں کی جانب سے چارپائی کو ڈیڑھ فٹ اوپر اٹھائیں۔ پھر کروٹ لے کر کھانس کھانس کر بلغم نکالیں۔ اور کوئی شخص اس دوران آپ کی پیٹھ تھپتھپاتا رہے۔

جالب صاحب کو ٹی بی ہوگئی تھی۔ مگر ان کے محبتی کبھی ان سے لمحہ بھر کو بھی غافل نہیں رہے۔ جدا نہیں ہوئے۔ انہیں میں ایک مجاہد بریلوی بھی ہیں۔

جالب بھائی کو مجاہد سے اور مجاہد کو جالب بھائی سے بہت پیار تھا۔ جالب بھائی جب کراچی آتے تو اکثر ہوٹل کی بجائے مجاہد صاحب کے گھر رہتے۔ مجاہد نے انہی کی خاطر پہلی منزل کا فلیٹ کرائے پر لیا تھا۔ مجاہد بریلوی کی شادی نزہت شیریں سے اس فیصلے کو جالب بھائی نے مستحکم کیا تھا۔ وہ نزہت (بیگم مجاہد) بھابھی کو بالکل اپنی بیٹیوں کی طرح چاہتے تھے۔ اور نزہت بھابھی نے بھی ان کو ہمیشہ اپنا باپ ہی سمجھا۔ ان کو خوش رکھنے کے لئے وہ ہمیشہ کوشاں رہتیں۔

جالب صاحب آج تو آپ بہت خوبصورت لگ رہے ہیں' جالب صاحب' میں آج آپ

کے لئے مچھلی پکاؤں گی جالب صاحب ایک کرتا شلوار میں نے آپ کے لئے پسند کیا ہے۔

بھائی کراچی آتے' تو سارا ہوٹل صدر میں قیام کیا کرتے تھے' اور اکثر ان کا پرہیزی کھانا۔ نزہت بھابھی پکا کر خود ہوٹل لایا کرتی تھیں۔

مجاہد صاحب اور جالب صاحب کا ساتھ تقریباً دو دہائیوں کا ہے۔ کراچی کی تمام مصروفیات کے ذمہ دار مجاہد ہوتے تھے۔ کہاں جانا ہے۔ کہاں نہیں جانا ہے یہ سب مجاہد خیال رکھتے تھے جالب صاحب کا فیصلہ ہی آخری فیصلہ ہوتا تھا۔ مگر مجاہد صاحب نے بھی جالب صاحب کو پالیا تھا لہٰذا بہت کم دونوں کے فیصلوں میں تضاد ہوتا تھا۔

آج میں جو کچھ بھی ہوں۔ اپنی ماں کی بدولت ہو (حبیب جالب)

ہماری اماں کا انتقال

۳۱ اکتوبر ۱۹۸۶ء کے دن صبح ساڑھے سات بجے میرے گھر میں اماں کا ۸۵ برس کی عمر میں انتقال ہوا۔ ہمارے گھر کی عزم' حوصلہ' محنت' حق و صداقت کی ایک متحرک داستان کا اختتام ہو گیا تھا۔ میانی افغاناں گاؤں میں اپنے بڑے بیٹے مشتاق مبارک سے لے کر سعید پرویز تک جدوجہد کی ایک طویل کہانی' کامیابی سے اپنے اختتام کو پہنچ گئی تھی۔

جالب بھائی نے اپنی آپ بیتی میں لکھا ہے۔ کہ "میں آج جو کچھ بھی ہوں۔ اپنی ماں کی بدولت ہوں" ہماری اماں کی یہی بہت بڑی کامیابی ہے۔ کہ اس نے دنیا کو حبیب جالب دیا۔

اماں کے انتقال کی خبر ٹیلی فون پر جالب بھائی کو دی گئی اور شام تک وہ پہنچ گئے۔ اور پھر جالب بھائی' حمید بھائی' اور میں نے مل کر اپنی والدہ کو نخنی حسن قبرستان میں سپرد خاک کر دیا۔

مجاہد کی چھیڑ چھاڑ دبئی روانگی ملتوی

جالب بھائی سلیم جعفری کی دعوت پر دبئی جارہے تھے۔ مجاہد صاحب بھی ہمراہ جا رہے تھے۔ شام کی فلائیٹ تھی۔ اور ایئرپورٹ میرے گھر سے روانہ ہونا تھا۔

شام چار بجے مجاہد صاحب اپنا سامان لے کر میرے گھر آگئے۔

ابھی روانگی میں دیر تھی۔ اور جالب صاحب مجاہد سے کہہ رہے تھے۔

بھئی مجاہد! "اس کا کچھ کرلو۔"

مجاہد صاحب پھر کچھ اور بات کرنے لگتے۔

ارے میاں مجاہد! وقت کم رہ گیا "اس کا کام تمام کرلو۔"

مجاہد پھر بولے ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔

ہاں تو جالب صاحب دبئی میں کیا سنائیں گے؟

ارے کیا ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے؟

جالب صاحب غصے میں آگئے۔

جالب صاحب! آپ "اس" کی فکر نہ کریں'

سعید ہے۔

بس مجاہد کا اتنا کہنا تھا۔ کہ سعید ہے' جالب صاحب مجھے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگے۔

میں بالکل نارمل تھا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔

کیوں بھئی سعید تم!............

ارے جالب صاحب آپ نے بھی حد کردی۔ وہ آپ کا چھوٹا بھائی ہے۔ آپ کو بتائے گا۔ کیا!

مجاہد نے جالب بھائی کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

مجاہد صاحب کی بات سن کر' بھائی صاحب' بیٹھ گئے۔

کہاں تو ایئرپورٹ جانے کی جلدی تھی۔ اور کہاں یہ کہ اطمینان سے بیٹھ گئے اور مجھے گھور گھور کر دیکھنے لگے۔

بھئی سعید کیا تم بھی..........

بھئی جالب صاحب اٹھئے دیر ہو رہی ہے۔

مجاہد نے ایک مرتبہ پھر جالب صاحب کی بات کاٹ دی تھی۔

اب تو جالب صاحب بالکل ہی بیٹھ گئے۔ جیسے دبئی جانا ہی نہیں ہے۔

مجاہد! کیا بکواس ہے۔

نہیں نہیں

سعید!

نہیں بھئی نہیں

جالب صاحب بعض اوقات آپ بالکل بچوں جیسی باتیں کرتے ہیں۔

مجاہد نے یہ کہہ کر جالب صاحب کو بالکل ہی پریشان کر دیا تھا

بھئی مجاہد! دبئی جانے کی بات کو چھوڑو۔ پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ سعید نے کب سے "پینا" شروع کر دی۔

میں جو اب تک مجاہد اور جالب بھائی کی گفتگو سن رہا تھا۔ اپنے بارے میں "پینے" کا سن کر ہنس دیا۔

ارے بھائی صاحب! خدا کی قسم، میں نے تو آج تک اسے چھوا بھی نہیں۔ میں تو اس کے ذائقے سے ہی ناآشنا ہوں۔

پھر میں نے دیکھا، مجاہد صاحب منہ پھیرے ہنس رہے تھے۔ اور جالب صاحب انہیں گھور رہے تھے۔

اس کے بعد رات کی بچی ہوئی میں نے دونوں کے سامنے رکھ دی۔ اور ایئرپورٹ جانے سے پہلے اس کا کام تمام ہو گیا۔

عبدالحمید چھاپرا کے بھائی کی شادی
جالب صاحب کا آخری دورہ کراچی

عبدالحمید چھاپرا سے بھی جالب صاحب کے بہت محبت کے تعلقات تھے۔ اسی لئے وہ لاہور سے چھاپرا صاحب کے بھائی کی شادی میں کراچی آئے تھے۔ بھائی کی طبیعت بہت خراب تھی' ان سے ایک قدم چلا نہیں جا رہا تھا۔ تقریب کے اختتام پر میں نے انہیں اپنی کار میں بٹھایا اور مجاہد کے گھر روانہ ہوئے۔ مجاہد بھی اپنی کار میں پیچھے پیچھے آرہے تھے۔ یہ جالب صاحب کا آخری بار کراچی آنا ثابت ہوا۔ کہ وہ چلتے قدموں آئے۔ اور گئے۔

جالب صاحب کا کراچی میں داخلہ بند
حکومت نہیں' بھائی نے پابند کیا

وہ جس کی روشنی کچے گھروں تک بھی پہنچتی ہے
نہ وہ سورج نکلتا ہے نہ اپنے دن بدلتے ہیں

نہ وہ سورج نکلتا ہے' یہ میرے افسانوں کے پہلے مجموعے کا نام ہے۔ ۱۹۹۱ء میں جب یہ مجموعہ اشاعت کے آخری مراحل طے کر رہا تھا۔ تو مجاہد بریلوی اور بابا نجمی سے اکثر یہ گفتگو رہتی تھی اور میں ان سے کہا کرتا تھا کہ میری کتاب کی تقریب میں جالب صاحب نہیں آئیں گے۔ بلکہ اس دن اگر کراچی میں بھائی صاحب کی کوئی مصروفیت بھی ہوئی تو میری طرف سے پابندی ہوگی۔ کہ وہ اسے منسوخ کر دیں۔ میرے سبھی دوست احباب' میری اس بات پر حیران ہو کر پوچھا کرتے تھے کہ آخر تم ایسا کیوں سوچ رہے ہو' تو میں ان سے کہتا تھا کہ میں نے کبھی "پدرم سلطان بود" بننے کی کوشش نہیں کی ہے۔ جالب صاحب میری کتاب کی تقریب میں شریک ہوں گے۔ تو وہ تقریب افسانہ نگار سعید پرویز کی نہیں ہمارے خاندان کی

سعید پرویز کے پہلے افسانوی مجموعہ "نہ وہ سورج نکلتا ہے" کی تقریب میں دائیں سے بائیں
ایم بی انجم، مجاہد بریلوی، صدر تقریب محترمہ ہاجرہ مسرور، سعید پرویز، مہمان خصوصی خلیق ابراہیم خلیق اور شفیق عباسی

تقریب بن جائے گی۔

مجاہد بریلوی صاحب کے لئے بھی اس تقریب کے حوالے سے بس اتنی ہی رعائیت تھی کہ وہ پچھلی قطاروں میں کہیں بیٹھ جائیں۔

احمد ہمدانی صاحب ملے۔ تو وہ بھی جھٹ سے بولے بھئی جالب کو صدرات کے لئے بلاؤ۔ میں نے انہیں بھی یہی کہا کہ ہمدانی صاحب یہ جالب کے بھائی کی کتاب کی تقریب ہے میں دوسروں کے لئے تو جالب صاحب کو بلوانے میں معاونت کر سکتا ہوں مگر اپنی کتاب کی تقریب میں اسٹیج پر بیٹھے ہوئے حبیب جالب' مجھے اچھے نہیں لگیں گے۔

مئی ۱۹۹۲ء میں میری کتاب چھپ گئی تھی اور کتاب کی تقریب رونمائی ۱۳ اکتوبر ۱۹۹۲ء بروز منگل آرٹس کونسل کراچی میں منعقد ہوئی تھی۔ اس تقریب کی صدارت باجرہ مسرور صاحبہ نے کی تھی جب کہ مہمان خصوصی سندھی کے معروف افسانہ نگار جمال ابرو تھے جو بیمار تھے۔ مگر میری محبت میں انہوں نے دعوت قبول کرلی تھی۔ لیکن عین تقریب کے وقت ان کی طبیعت شدید خراب ہوگئی اور وہ نہ آسکے۔ اس طرح جناب خلیق ابراہیم خلیق صاحب نے ابرو صاحب کی نمائندگی کی۔ میری کتاب پر گفتگو جناب احمد ہمدانی' جناب سحرانصاری' محترمہ سعیدہ گزدر' اور ڈاکٹر مشرف احمد نے کی تھی۔ جب کہ بابا نجمی نے منظوم تبصرہ پیش کیا تھا۔

تقریب میں مجاہد بریلوی' شیریں بھابی کے ساتھ آئے اور پچھلی قطار میں بیٹھ گئے تقریب کی نظامت ایک اہم ذمہ داری ہوتی ہے لہٰذا میں نے مجاہد صاحب کے بارے میں اپنا فیصلہ واپس لیتے ہوئے انہیں نظامت کے فرائض سنبھالنے کے لئے کہا۔

تقریب ہر لحاظ سے بہت کامیاب رہی۔ جالب صاحب نہیں تھے مگر وہ لمحہ لمحہ تقریب میں موجود رہے خود میرے افسانوں میں ان کی شاعری کی گونج موجود ہے۔ لہٰذا مقالوں اور گفتگو میں جالب صاحب شامل رہے۔

بدلا نہ میرے بعد بھی موضوع گفتگو
میں جاچکا ہوں پھر بھی تری محفلوں میں ہوں
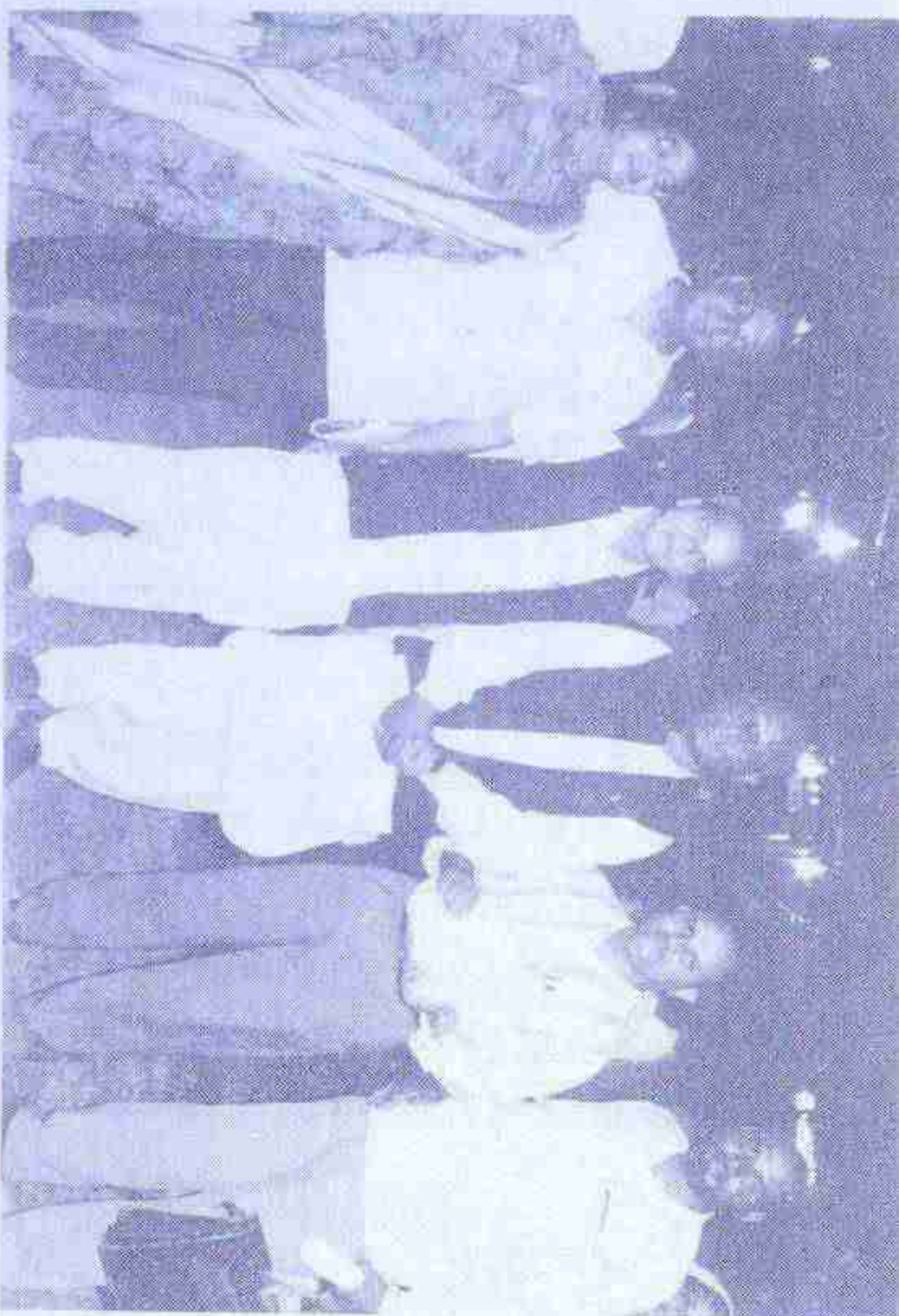
"نہ وہ سورج نکلتا ہے" کی تقریب میں سعید پرویز کے ہمراہ شہناز نور سحر انصاری اور دوسرے

جالب صاحب پر پابندی کے احکامات کی تعمیل

اپنی کتاب کی تقریب سے ہفتہ دس روز قبل میں لاہور گیا بھائی صاحب سروسز ہسپتال میں داخل تھے۔ میں نے انہیں اپنی کتاب دی وہ کتاب دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ میں نے بتایا کہ ۱۳ اکتوبر کو تقریب ہے یہ سن کر وہ بولے۔ کہ میں پہنچ جاؤں گا

میں نے کہا بھائی آپ کراچی نہیں آئیں گے۔

وہ بولے' نہیں نہیں میں ٹھیک ہوں میں آجاؤں گا

میں نے پھر کہا۔

آپ کے ٹھیک ہونے کی بات نہیں ہے بلکہ میں خود سے یہ چاہتا ہوں کہ میری کتاب کی تقریب میں میرا بھائی جالب موجود نہ ہو' لہٰذا اگر اس روز کراچی میں آپ کی کوئی مصروفیت بھی ہے تو اسے منسوخ سمجھیں اور ۱۳ اکتوبر ۱۹۹۲ء کے دن کراچی میں آپ کا داخلہ بند ہے۔

میری بات سن کر بھائی کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

وہ مجھے تحسین کی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

✲

آرٹس کونسل کراچی میں "نہ وہ سورج نکلتا ہے" کی تقریب میں دائیں سے بائیں انور ذنون' سعید پرویز' گلوکار سلامت علی اور قمر محمود

سروسز اسپتال میں آمنے سامنے
نثار عثمانی اور حبیب جالب

۱۹۹۲ء کے آخری مہینوں اکتوبر' نومبر' دسمبر میں صحافت کے حبیب جالب' نثار عثمانی اور جالب صاحب ایک ہی کمرے میں آمنے سامنے بستر ڈالے پڑے تھے۔ یہ کمرہ لاہور کے سروسز اسپتال کی پہلی منزل پر واقع تھا۔ کمرہ ڈاکٹروں کا تھا۔ جسے انہوں نے ان دو عظیم شخصیات کے لئے خالی کردیا تھا۔ میں نے دیکھا۔ کہ نثار عثمانی صاحب اپنی بیماری بھول کر جالب صاحب کی تیمارداری کے فرض کو زیادہ ادا کرتے تھے۔ وہ اپنا بیڈ چھوڑ کر جالب صاحب کے پاس جاتے اور انہیں تسلی دیتے۔ جالب صاحب' عثمانی صاحب کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سینے پر رکھ لیتے' اور کہتے۔

عثمانی صاحب! میں بستر سے کب اٹھوں گا۔

یہ آکسیجن کب میرا پیچھا چھوڑے گی۔ میں چاہتا ہوں۔ کہ اسپتال سے نکل کر اپنے عوام کے دکھوں کو بانٹ سکوں۔

پورا ملک خصوصا پنجاب شدید ترین سیلاب کی زد میں تھا۔ گاؤں کے گاؤں سیلاب میں بہہ گئے تھے۔

احمد بشیر صاحب اسپتال تشریف لائے' تو کمرے کے دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی بولے۔

اوئے جالب! اٹھ اوئے کہاں بستر پر لیٹا ہے' پنجاب تباہ ہوگیا ہے۔ گاؤں کے گاؤں صفحہ ہستی سے مٹ گئے ہیں۔

اور جالب بھائی پھر بھی بستر سے نہ اٹھ سکے۔

مال پر خواتین کے جلوس کی خاطر پولیس کی لاٹھیاں، گالیاں، کھانے والے جالب کا جی چاہتا تھا۔ کہ سیلاب کے مصیبت زدگان کے لئے عملاً کچھ کر سکے۔ مگر........

اگلے روز ایس ایم ظفر، مہناز رفیع صاحبہ کے ہمراہ جالب صاحب کی عیادت کو آئے، ان کے ساتھ جسٹس دوراب پٹیل بھی تھے۔ ظفر صاحب نے جالب بھائی کی ٹانگیں دبانا شروع کر دیں۔

شاہ صاحب! رہنے دیں۔

جالب صاحب بولے

نہیں حبیب! مجھے ٹانگیں دبانے دو۔

بیرسٹر ایس ایم ظفر، جالب بھائی کی ٹانگیں دبا رہے تھے اور بھائی نے مجھے اپنے تازہ ترین اشعار ظفر صاحب کو سنانے کے لئے کہا۔ جو انہوں نے سیلاب زدگان کے حوالے سے چند گھنٹے قبل لکھے تھے۔

میں نے کاپی اٹھا کر شعر پڑھنا شروع کر دیئے۔

نہ دل دیدو، نہ جان دیدو، بس اپنی ایک مل دیدو
زیاں جو کر چکے ہو قوم کا تم، اس کا بل دیدو

جالب بھائی کبھی مجھے دیکھتے، اور کبھی ایس ایم ظفر، مہناز رفیع اور جسٹس دوراب پٹیل صاحب کی طرف دیکھتے۔ جالب صاحب کے پھیپھڑے خراب ہو چکے تھے۔ بس جو تھوڑا بہت کام چل رہا تھا۔ وہ یہی کہ آکسیجن کے ذریعہ سانس کے نظام کو بحال رکھا گیا تھا۔ ڈاکٹرز نے جالب صاحب کے بولنے پر پابندی لگا دی تھی۔ کہ اس سے سانس اکھڑنے لگتی تھی، مگر میں نے دیکھا جالب صاحب جس قدر بھی بول سکتے تھے، بولتے تھے۔ اور وہ اپنی آخری سانس تک بولتے رہے۔ ان کی آواز زندگی بھر کوئی نہ دبا سکا۔ حتیٰ کہ ان کا منہ مرنے کے بعد بھی کھلا تھا۔ ان کا منہ بند کرنے کی ان کے ہونٹوں کو آپس میں ملانے کے بڑے جتن کئے گئے۔ مگر تمام کوششیں بے سود ثابت ہوئیں تمام عمر وہ کہتے رہے۔

اپنے ہونٹ سیئے ہیں تم نے

میری زباں کو مت روکو
تم کو اگر توفیق نہیں تو
مجھ کو ہی سچ کہنے دو
ظلم رہے اور امن بھی ہو
کیا ممکن ہے تم ہی کہو

اور مرنے کے بعد بھی ان کے ہونٹ وا تھے۔ ان کا منہ کھلا ہوا تھا۔

جالب بھائی کی حالت دیکھ کر نظر آ رہا تھا۔ کہ اب قدرت ہی چاہے۔ تو بھائی صاحب اس حالت سے نکل سکتے ہیں۔ وہ انتہائی کمزور ہو چکے تھے۔ ان سے زیادہ دیر بولا نہیں جاتا تھا۔ وہ بستر سے نیچے نہیں اتر سکتے تھے اور ان تکالیف میں دن بہ دن اضافہ ہو رہا تھا۔ مگر اس انتہائی صورتحال کے باوجود ان کا ذہن کام کرتا رہا اور قلم چلتا رہا۔

مظلوموں کے حق میں
ظالموں کے خلاف

سروسز اسپتال سے بھائی جالب شیخ زید اسپتال منتقل ہو گئے شیخ زید میں ڈاکٹر اقبال (اسسٹنٹ پروفیسر) گزشتہ ایک ڈیڑھ سال سے جالب بھائی کو دیکھ رہے تھے۔ لہٰذا وہ انہیں اپنے ہسپتال شیخ زید لے گئے۔

میں نے بھائی کی بیماری کے آخری ایام میں کراچی لاہور کے درمیان بہت سفر کیا۔ اس دوران جہاز پر اتنے سفر کئے۔ کہ میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ مگر مجبوری تھی۔ لاہور میں بھائی کو جس حال میں چھوڑ کر آتا تھا۔ وہ کراچی میں مجھے چین سے نہ رہنے دیتا تھا۔ اور میں پھر لاہور بھاگ جاتا تھا۔

جالب بھائی کی لندن روانگی

جالب بھائی کو حکومت اپنے خرچ پر بیرون ملک علاج کے لئے بھیجنا چاہتی تھی۔ مگر تمام

مصطفیٰ قریشی اور روبینہ قریشی، حبیب جالب کی عیادت کر رہے ہیں

حکومتیں یہ خواہش اپنے ساتھ لئے رخصت ہو گئیں۔ جنرل ضیا پیپلز پارٹی اور نواز شریف صاحب کی حکومتوں کی طرف سے بیرون ملک علاج کی پیشکش کے جواب میں جالب صاحب بس یہی کہتے رہے۔

یہاں لوگوں کو ڈسپرین میسر نہیں۔ اور میں بیرون ملک علاج کے لئے چلا جاؤں!

لیکن جنگ گروپ کے میر شکیل الرحمان، جالب صاحب کو علاج کے لئے لندن بھجوانے میں کامیاب ہو گئے۔ جنگ لاہور اور جالب صاحب کے مراسم وفات سے چند سال پہلے سے بہت اچھے چل رہے تھے۔ لندن بہ غرض علاج جانا بھی انہی محبتوں کا نتیجہ تھا۔

لندن روانگی سے قبل میں ایک مرتبہ پھر کراچی سے لاہور گیا۔ انہی دنوں جنگ پبلیکیشنز بھائی صاحب کی آپ بیتی "جالب بیتی" کے نام سے ترتیب دے رہے تھے۔ جنگ کے مظفر محمد علی صاحب اسپتال آئے، تو جالب بھائی نے ان سے میرا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔ کہ یہ میرا چھوٹا بھائی ہے۔ اور آپ اسے "جالب بیتی" چھپنے سے پہلے دکھائیں۔

یوں میں نے "جالب بیتی" کے لئے کام کیا جالب بیتی کے مرتب طا[illegible] کام [illegible] چکے تھے مگر جالب صاحب کے حکم پر، میری معاونت بھی اس میں شا[illegible]

مصطفیٰ قریشی انتظار کرتے رہے

جالب صاحب کے کہنے کے مطابق میں جب بھی لاہور آتا تو دن بھر جنگ لاہور کے دفتر میں گذارتا۔ جہاں بھائی صاحب کی آپ بیتی اشاعت کے مراحل تیزی سے طے کر رہی تھی۔ مظفر محمد علی، اور طاہر اصغر کے ساتھ ساتھ میری بھی خواہش تھی۔ کہ بھائی کی زندگی میں یہ کتاب چھپ جائے۔

میں حسب معمول جنگ گیا ہوا تھا۔ ادھر شیخ زید اسپتال میں جالب بھائی کے پاس مصطفیٰ قریشی آئے ہوئے تھے۔ اور جالب بھائی نے انہیں دو گھنٹے تک بٹھائے رکھا، کہ ابھی میرا بھائی سعید آنے والا ہے۔ تم اس سے مل کر جانا۔ مگر میں جنگ سے دیر سے اٹھا۔ اور جب

میں ہسپتال پہنچا۔ تو مصطفیٰ قریشی صاحب جا چکے تھے۔

دوسرے دن جالب بھائی لندن روانہ ہو رہے تھے مصطفیٰ قریشی' لاہور ایئرپورٹ پر ملے۔ تو بولے۔ سعید صاحب! کل آپ کا بہت انتظار رہا' مگر آپ سے ملاقات نہ ہو سکی۔

مصطفیٰ قریشی صاحب کا فراخدلانہ لہجہ ان کے بڑے پن کی دلیل تھا۔ ان کے بارے میں میرے اندزے بہت درست نکلے۔ وہ ہر طرح کے احساس سے عاری ایک بڑا انسان ہے۔

لاہور ایئرپورٹ سے روانگی

دسمبر کی وہ رات امید و بیم کے ملے جلے احساسات لئے شیخ زید اسپتال میں اتری تھی۔ اس رات جالب بھائی لاہور سے لندن کے لئے روانہ ہو رہے تھے' جہاں کرامویل ہسپتال میں ڈاکٹرز ان کے منتظر تھے۔ لاہور سے ان کے معالج ڈاکٹر اقبال بھی لندن جا رہے تھے۔ میں کراچی سے لاہور آیا ہوا تھا۔ اس دن جیسے گھڑی کی سوئیاں رک گئیں تھیں۔ بھائی ہر چند منٹ بعد پوچھتے

کیا ٹائم ہوا ہے؟

وہ اس رات بہت زیادہ بے چین تھے۔ لندن روانگی کی انہیں بہت جلدی تھی۔

اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے وقت تیزی سے دوڑ رہا ہے۔ میں لمحہ بھر کو بھی ان کے چہرے سے نظریں نہ ہٹاتا تھا۔ بس جی چاہتا تھا۔ کہ بھائی کو جی بھر کے دیکھ لوں نامعلوم پھر..........

ایئرپورٹ روانگی سے ایک گھنٹہ قبل' میں نے اپنے بھائی کو نیا شلوار قمیض پہنایا۔ انہیں بیڈ سے اتار کر کرسی پر بٹھایا گیا' اور پھر لباس تبدیل کیا گیا۔

ایمبولینس آ چکی تھی۔ ڈاکٹر اقبال صاحب نے ایمبولینس کا معائنہ کیا۔ آکسیجن سلنڈر موجود تھے۔

جالب صاحب کو لے آئیں

ڈاکٹر اقبال نے گرین سگنل دیا
جالب بھائی اپنے کمرے میں ویل چیئر پر بیٹھے تھے۔
بھابھی نے چیک بک مجھے دیتے ہوئے کہا۔
تین چار چیکوں پر اپنے بھائی سے دستخط کروالو۔ بھائی بیماری کی وجہ سے بے انتہا چڑ چڑے ہو چکے تھے اس دن خصوصاً" میرے ساتھ ان کے تعلقات زیادہ بہتر تھے۔ اسی لئے بھابھی نے چیک سائن کروانے کے لئے مجھے کہا۔ اور پھر میں نے بھائی سے چیک سائن کروائے۔
شیخ زید ہسپتال سے آنسوؤں اور سسکیوں کے ساتھ بھائی کو ان کی بیگم اور بیٹیوں نے رخصت کیا۔
ایمبولینس حبیب جالب کو لئے ایئرپورٹ کی جانب رواں دواں تھی۔ لاہور کے رستے جن پر حبیب جالب کی داستانیں رقم ہیں۔ انہی رستوں سے آج وہ ایمبولینس میں لیٹا ہوا گزر رہا تھا۔ ان کا بڑا بیٹا ناصر باپ کے سرہانے بیٹھا تھا۔ ڈاکٹر اقبال اگلی نشست پر بیٹھے تھے۔
ایمبولینس ایئرپورٹ کی حدود میں داخل ہوئی۔ اور اسے رن وے پر جانے والے گیٹ کے قریب روک دیا گیا۔ مصطفیٰ قریشی ایئرپورٹ پر پہلے ہی سے موجود تھے۔ پریس فوٹوگرافر بھی بڑی تعداد میں موجود تھے۔ اور ایمبولینس میں اسٹریچر پر لیٹے جالب بھائی کی تصاویر اتاری جا رہی تھیں۔ مصطفیٰ قریشی تمام وقت ایمبولینس میں جالب بھائی کے پاس بیٹھے رہے' وہ ذرا دیر کو ایمبولینس سے اترے۔ تو جالب بھائی بولے۔
قریشی صاحب مجھے رخصت کر کے جانا!
جالب بھائی کی بات سن کر مصطفیٰ قریشی صاحب ہنس کر بولے
جالب بھائی! ہم انشاءاللہ صحت یاب واپسی پر آپ کا استقبال بھی کریں گے۔
اس فقرے کے پیچھے جو غم چھپا ہوا تھا۔ اسے مصطفیٰ قریشی کے ساتھ ساتھ سبھی محسوس کر رہے تھے۔
ضروری کاغذی کارروائی کے بعد ایئرپورٹ سیکیورٹی والوں نے رن وے کا آہنی گیٹ کھول دیا' اور اب ایمبولینس کو رن وے پر جہاز کی سیڑھی تک جانا تھا۔

لندن روانگی سے قبل جالب صاحب شیخ زید ہسپتال لاہور میں

میں ایمبولینس میں داخل ہوا۔ اور بھائی کے رخساروں کے بوسے لئے۔ اور خدا حافظ کہہ کر اتر آیا۔

کہیں بھائی نہ دیکھ لیں اس لئے میں تیزی سے دوڑتا ہوا ایک کونے کی دیوار سے لگ کر روتا رہا، مصطفیٰ قریشی کی آنکھوں سے بھی آنسو رواں تھے۔ جنہیں وہ اپنے رومال میں جذب کر رہے تھے۔ ہمارے چچا زاد بھائی محسن، احسن، الیاس الماس عامر جالب صاحب کے تینوں بیٹے ناصر، انور، یاسر اور میری بیگم شائستہ ہم سب رن وے کے لئے جاتی ہوئی ایمبولینس کو ہاتھ ہلا ہلا کر رخصت کر رہے تھے۔ جالب بھائی۔ ایمبولینس کے اندر اسٹریچر پر لیٹے لیٹے ہمیں دیکھ رہے تھے۔ اور پھر ایمبولینس اندر داخل ہو گئی۔ اور گیٹ بند کر دیا گیا۔

ملک قاسم اچانک پہنچے

جالب بھائی کی ایمبولینس ایئرپورٹ کے رن وے کے لئے داخل ہو چکی تھی۔ کہ ملک قاسم صاحب ایئرپورٹ پہنچے۔ ہم نے انہیں بتایا۔ کہ جالب صاحب تو اندر جا چکے ہیں۔ یہ سن کر ملک قاسم تیزی سے ایئرپورٹ کے ارباب اختیار کی طرف بھاگے۔ اور پھر خصوصی اجازت پر جالب صاحب سے ملک صاحب کی ملاقات کروائی گئی۔

ملک صاحب، جالب صاحب سے ملاقات کے بعد جب باہر آئے، تو ان کے ہاتھ میں بھی رومال تھا۔ اور وہ آنسو پونچھتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

حبیب جالب کی عظمت کو ہزاروں سلام

کراموبل ہسپتال لندن روانگی سے قبل شیخ زید ہسپتال لاہور میں، بیگم حبیب جالب، ناصر جالب، انور جالب اور جاوید، جالب صاحب کے ساتھ

کراچی ایئرپورٹ آمد اور روانگی

لاہور سے روانہ ہو کر جہاز کراچی ایئرپورٹ پر اترا۔ جہاں جالب بھائی کو ریسیو کرنے کے لئے۔ مجاہد بریلوی' مجید بلوچ وغیرہ اور حمید بھائی' بھابی قیصر' حمید بھائی کے بیٹے' شرف اور مرتضیٰ کے علاوہ محمود بھی موجود تھا۔ جالب بھائی کا کراچی میں مختصر قیام تھا۔ لہٰذا انہیں "ہوٹل ان" میں ٹھہرایا گیا۔

کراچی میں چند گھنٹے قیام کے بعد جالب بھائی لندن کے لئے ڈاکٹر اقبال کی معیت میں روانہ ہو گئے۔

کرامویل ہسپتال لندن

دوسرے روز کے اخبارات میں جالب صاحب کے لندن پہنچ کر' کرامویل ہسپتال میں داخل ہونے کی خبر نمایاں طور پر اخبار میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے بعد اخبارات ہی کے ذریعے ان کے بارے میں اطلاعات موصول ہوتی رہیں۔ اور پھر یہ خبر بھی بذریعہ اخبار پہنچی' کہ لندن کے ڈاکٹرز نے کمزور حالت کے پیش نظر آپریشن کرنے سے معذوری کا اظہار کیا ہے۔ اور جالب صاحب پاکستان واپس آ رہے ہیں۔

تقریباً ایک ماہ لندن میں رہ کر جالب بھائی واپس شیخ زید ہسپتال لاہور میں آ گئے۔ کمزوری اور بڑھ چکی تھی۔ جس کی وجہ سے حواس خمسہ کا متاثر ہونا یقینی امر تھا' سو وہ ہوئے۔

یہ تو جالب بھائی ہی کا حوصلہ تھا کہ وہ مسلسل سات آٹھ ماہ تک آکسیجن کے سہارے بھرپور جئے اور اس طرح جئے کہ روزانہ ایک نظم اور بعض اوقات دو دو نظمیں لکھیں۔

جنگ لاہور کا نمائندہ روزانہ رات گیارہ بجے آ جاتا۔ اور جالب صاحب اسے اپنا تازہ کلام دے دیتے۔ جالب بھائی آپ نے درست کہا تھا۔

ہوتا اگر پہاڑ تو لاتا نہ تاب غم
جو درد اس دیار میں دل ہنس کے سہہ گیا

جالب صاحب کا آخری کلام

لندن سے واپس آئے بھائی جالب کو ایک ماہ سے زیادہ کا عرصہ ہو چکا تھا مگر ان کی حالت اس قدر خراب تھی کہ ایک غنودگی کا عالم ہر وقت ان پر طاری رہتا تھا۔ وہ بول نہیں سکتے تھے۔ بس ایک دو لفظ بولتے' اور بس۔ اسی لئے وہ ہر آنے والے سے کہا کرتے تھے کہ میں بول نہیں سکتا۔ لہٰذا آپ لوگ باتیں کریں۔ میں سن رہا ہوں۔

ایک آواز جو قوت سے اس طرح ابھرتی تھی کہ بڑی بڑی محل سرائیں' تھر تھرا جاتی تھیں۔ اسی آواز کی قوت کا مرکز طاقتور پھیپھڑے سکڑ کر خشک ہو چکے تھے۔

میں لاہور گیا ہوا تھا اور حسب معمول جنگ لاہور "جالب بیتی" پر کام کر رہا تھا۔ جنگ سے فارغ ہو کر شام میں جب ہسپتال پہنچا تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا اور میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ کہ جالب بھائی اپنی سب سے چھوٹی بیٹی حجاب فاطمہ کو اپنے تازہ اشعار لکھوا رہے تھے۔

کہاں تو یہ عالم کہ بھائی دواؤں کی وجہ سے غنودگی کے عالم میں رہتے اور کہاں میں یہ دیکھ رہا تھا کہ وہ مکمل ہوش و حواس کے ساتھ بالکل ہشاش بشاش شاعری فرما رہے تھے۔

مجھے جو دیکھا تو جالب بھائی نے اپنی بیٹی سے کہا کہ چچا کو پین اور کاپی دے دو۔

میں نے تازہ اشعار پر ایک نظر ڈالی۔

جالب بھائی مجھ سے بولے کہ اشعار پڑھو۔

میں نے نعتیہ اشعار پڑھنا شروع کئے اور جالب بھائی اکا دکا لفظ تبدیل کرواتے رہے۔ بعض مصرعے تبدیل کئے اور یہ معاملہ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ جاری رہا۔ حتیٰ کہ وہ اپنے اشعار سے مطمئن ہو گئے۔

ہاں پڑھو

جالب بھائی نے مجھے کہا۔

اور میں ان کے تازہ اشعار پڑھنے لگا۔

مجھ کم نصیب کو نہ ہوا' تیرا در نصیب
چاہیں گے جب حضورؐ تو ہوگا سفر نصیب

میں اڑ کے چوم آؤں حسیں راستوں کی خاک
ہوجائیں ان کے فضل و کرم سے جو پر نصیب

ان کے کرم کا کیا ہے ٹھکانہ کہ بخش دیں
ہوگی اب ان کے لطف سے وہ رہ گذر نصیب

ہونٹوں پہ دوستوں کے رہے' یہ دعا' مدام
جاگیں نصیب سے ترے اے چشم تر نصیب

نعت کے اشعار مکمل ہوتے ہوتے رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ بھائی نے مجھے کہا کہ یہ اشعار جنگ میں ابھی دے آؤ۔ اور میں اسی وقت ہسپتال سے جنگ کے دفتر کے لئے روانہ ہوگیا۔

نیوز روم میں راؤنڈ ٹیبل کے گرد صحافی حضرات مصروف تھے۔ میں نے جالب بھائی کی نعت کے بارے میں وہاں موجود حضرات کو بتایا' سبھی کئی دنوں بعد جالب صاحب کے اشعار کہنے پر خوش تھے۔ ایک صاحب نے میرے سامنے کاغذ رکھ دیا۔ اور بولے کہ اس پر نعت لکھ دیں۔ میں نے نہ صرف نعت لکھی' بلکہ خبر سرخی سمیت بھی بتائی۔ جو دوسرے دن کے اخبار میں من و عن شائع ہوئی۔

اگلے روز مجھے کراچی کے لئے روانہ ہونا تھا' بھائی بہت بہتر نظر آرہے تھے۔ جس روز مجھے روانہ ہونا تھا۔ وہ بالکل چاک و چوبند اپنے بستر پر لیٹے ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ اس قدر خوشگوار تبدیلی پر سبھی خوش تھے۔ اور میں بھی کراچی کے لئے خوش کن احساسات لئے روانہ ہوا تھا۔

کراچی میں زاہدہ حنا صاحبہ سے ملاقات ہوئی۔ تو میں نے ان کو بھی بتایا کہ بھائی کی حالت

اچانک بہت بہتر ہو گئی ہے۔ مگر اب بھی وہ مسلسل بول نہیں سکتے اور وہ آنے والوں کو باتیں کرنے کے لئے کہتے ہیں۔

۱۴ رمضان کو میں نے لاہور کے شیخ زید ہسپتال فون کیا۔ بھائی کے کمرے سے عامر فون سننے کے لئے آیا (عامر بھابی کا خالہ زاد بھائی ہے اس بچے نے جالب بھائی کی بیماری کے دوران بہت خدمت کی تھی) فون پر عامر نے مجھے کہا کہ آپ آجائیں۔ میں نے پوچھا کہ بھائی کی طبیعت کیسی ہے وہ بھائی کی حالت بتاتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔ اور یہی کہہ رہا تھا۔ کہ آپ آجائیں۔ میں نے عامر سے کہا کہ عید کے اگلے روز لاہور پہنچ جاؤں گا۔ عامر میرا جواب سن کر خاموش سا ہو گیا۔ میرا دل بھی بے تحاشا دھڑک رہا تھا۔ مگر یہ کیفیت تو مہینوں سے چل رہی تھی جو کچھ ہونے والا تھا۔ اب تو اس کے لئے ہم سب گھر والے خود کو تیار کر چکے تھے۔ بھائی کی لمحہ لمحہ کیفیت کے ساتھ ساتھ میں ان سے سینکڑوں میل دور ہوتے ہوئے بھی چل رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ عید تک خود کو کھینچ لے جائیں گے۔ مگر ان کے لئے تو خدا نے رمضان کے باسعادت مہینے کا ہی انتخاب کر رکھا تھا۔ کہ جس مہینہ میں بغیر حساب کتاب کے جنت میں داخلہ نصیب ہوتا ہے۔

بھائی آپ ہی تو مرنے سے چند روز پہلے کہا تھا۔

مجھ کم نصیب کو نہ ہوا تیرا در نصیب
چاہیں گے جب حضورؐ تو ہوگا سفر نصیب

تو رمضان ہی میں آپ کی ایک منزل کا سفر ختم ہو کر' آئندہ سفر کا آغاز لکھا گیا تھا۔

اور یوں ۱۸ رمضان المبارک مطابق ۱۴۱۳ھ ۱۳ مارچ ۱۹۹۳ء رات تقریباً ساڑھے بارہ بجے مظلوم کے حق میں اور ظالم کے خلاف تاحیات گونجنے والی آواز بالکل خاموش ہو گئی۔

سو گیا شہر تو بھی اب سو جا
آپ ڈھل جائے گی یہ شب سو جا
سو گئے خامشی بتاتی ہے
جاگنے والے سب کے سب سو جا

اب رہیں چین سے بے درد زمانے والے
سوگئے خواب سے لوگوں کو جگانے والے

آخری سفر

فون کی گھنٹی بج رہی تھی' میں نے لائٹ جلائی' رات کے ڈھائی بجے تھے۔
ہیلو' میں نے ریسیور اٹھایا۔
لاہور سے آپ کی کال ہے' بات کریں' آپریٹر نے اتنا کہا۔ اور پھر میرا بھتیجا مقصود (مشتاق مرحوم کا بیٹا) بولا۔
ہیلو چچا' آپ کھڑے ہیں یا بیٹھے؟
میں کھڑا ہوں۔ اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو چکی تھیں' بات میری سمجھ میں آ رہی تھی۔
تو چچا آپ بیٹھ جائیں۔
مقصود کے کہنے پر میں بیٹھ گیا' اب میرا سر بری طرح گھوم رہا تھا۔
چچا! وہ چچا جالب کا انتقال ہو گیا ہے۔
یہ خبر سننے کے لئے میں ڈیڑھ' دو ماہ پہلے سے ہی خود کو تیار کر چکا تھا۔ خصوصاً" جالب بھائی کی لندن سے واپسی کے بعد سے
اور میں سوچا کرتا تھا اتنی بھرپور زندگی گزارنے والے کی موت کی خبر میں کیسے سنوں گا۔ اور کیا حالات ہوں گے۔

۱۹۴۷ء میں بٹوارے کے بعد کراچی ہمارا آبائی شہر بن گیا تھا' ہمارا گھر' دہلی سے سیدھا کراچی پہنچا تھا' جہاں بلاک نمبر ۳۵ کا کوارٹر نمبر ۳ مشتاق بھائی کے نام الاٹ ہوا تھا۔ ہماری باہمت مزدور ماں' اسی شہر کی مٹی اوڑھے ابدی نیند سو رہی ہے۔

جالب بھائی کے انتقال کی اطلاع حمید بھائی (جالب صاحب اور میرے درمیان کے بھائی) محمود (مشتاق مبارک بھائی کا بڑا بیٹا) اور کل ہی لاہور سے کراچی پہنچنے والے اپنے چچازاد بھائی احسن کو دینا ہے۔ مجاہد بریلوی اور عزیز میمن بھی اس فہرست میں شامل ہیں۔

جب ہم پونے چھ بجے صبح جہاز میں داخل ہوئے تو سامنے اخبارات پڑے تھے۔ جن میں پہلے ہی صفحے پر انتقال کی خبر نمایاں طور پر شائع کی گئی تھی۔

حبیب جالب انتقال کر گئے

حبیب جالب چل بسے

حبیب جالب زندگی کی قید سے آزاد ہو گئے۔

میں سوچا کرتا تھا کہ اتنے بھرپور انسان کی یہ خبر شائع ہو گی۔

لو دیکھ لو' پڑھ لو

ٹھیک چھ بجے صبح جہاز روانہ ہوا' اور جب ہم لاہور ایئرپورٹ سے باہر آئے تو صبح کے آٹھ بج رہے تھے' جالب بھائی کے گھر کے لئے ایئرپورٹ سے ٹیکسی میں روانہ ہوئے۔ لاہور شہر کی مانوس سڑکیں' سرسبز راستے' بہت خاموش تھے' اداس تھے۔ یہ میرے اندر کی فضا ہے۔ میں نے خود کو ٹٹولا' اور پھر ناصر کاظمی یاد آ گئے۔

دل تو اپنا اداس ہے ناصر
شہر کیوں سائیں سائیں کرتا ہے

جالب بھائی کے گھر جانے والی گلی کے سامنے ہم ٹیکسی سے اترے۔ جالب کے دو حقیقی چھوٹے بھائی' ایک بھتیجا اور ایک چچازاد بھائی۔ ان قربتوں کو لئے جب ہم گھر میں داخل ہوئے' تو ایک کہرام مچ گیا۔ جالب بھائی کے بچے خصوصاً" مجھ سے زیادہ مانوس ہونے کی وجہ سے شدت سے میرا انتظار کر رہے تھے۔ بڑا بیٹا ناصر' چھوٹا انور تیسرا یاسر' بڑی بیٹی افشاں جو

ایک بڑی نظم کا حوالہ بھی ہے۔ وہ چھوٹی سی تھی کہ ایک بار بھائی صاحب کو پولیس والے ہتھکڑی لگا کر گھر لے آئے تو یہی بچی باپ کی ہتھکڑی سے کھیلنے لگی۔ اور یوں وہ نظم ہوئی۔

اس کو شاید کھلونا لگی ہتھکڑی
میری بچی مجھے دیکھ کر ہنس پڑی
یہ ہنسی تھی سحر کی بشارت مجھے
یہ ہنسی دے گئی کتنی طاقت مجھے
کس قدر زندگی کو سہارا ملا
ایک تابندہ کل کا اشارہ ملا

لیلیٰ جالب' یہ نام فلسطینی مجاہدہ کو خراج تحسین ہے۔ اور اسی بچی کے خط کے جواب میں جالب صاحب نے حیدر آباد جیل سے نظم لکھ کر بھیجی تھی۔

میری بچی میں آؤں' نہ آؤں
آنے والا زمانہ ہے تیرا

طاہرہ' رخشندہ زویا اور حجاب فاطمہ' یہ سب بچے ہم سے لپٹ لپٹ کر رو رہے تھے۔ درودیوار بھی رو رہے تھے۔ اپنی عظیم بھابی' جالب صاحب کی عظیم جدوجہد کی لمحہ لمحہ ساتھی۔ آہنی عزم اور فولادی جسے والی ہماری چچازاد بہن ممتاز (بیگم جالب) آج ٹوٹ پھوٹ رہی تھی' وہ دھڑام سے فرش پر گری اور بے ہوش ہو گئی۔ آہ وبکا کا شور یک لخت تھم گیا' لوگ بھابی کو سنبھال رہے ہیں' مگر وہ جلد ہی ہوش میں آچکی ہیں۔ یقیناً" ایسا ہی ہونا تھا۔ کیونکہ جالب کی ساتھی کو اب دوہری ذمہ داریوں کا بوجھ جو اٹھانا تھا۔ اور ہمارے بھائی بھی کیا خوب ہیں جاتے جاتے بھابی سے وعدہ لیا کہ تم میرے بعد بھی حکومت یا کسی ادارے کی کوئی امداد قبول نہیں کرو گی۔

تدفین کا پروگرام اخبارات میں شائع ہو چکا ہے۔ جس کے مطابق بعد نماز عصر تقریباً" ساڑھے چار بجے جالب بھائی گھر سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رخصت ہوں گے۔ ان کی ابدی آرام گاہ سبزہ زار کالونی کے شاہ فرید قبرستان میں تیار ہو چکی ہے۔

جالب بھائی چھ سات ماہ سے ہسپتال میں تھے۔ پہلے تین ماہ سروسز ہسپتال میں رہے جہاں نثار عثمانی اور جالب صاحب ایک ہی کمرے میں آمنے سامنے پڑے تھے دونوں کو ایک ہی عارضہ لاحق تھا۔ پھیپھڑوں کی خرابی' سانس کی تکلیف' زندگی میں بھی دونوں کو ایک ہی عارضہ لاحق رہا۔ سچ بولنے کا عارضہ۔

سروسز ہسپتال میں تین ماہ رہنے کے بعد جالب شیخ زید ہسپتال شفٹ ہوگئے۔ کیونکہ ان کے خصوصی معالج ڈاکٹر اقبال لندن سے آچکے تھے۔ اسی ہسپتال میں ایک ماہ گزارنے کے بعد وہ ڈاکٹر اقبال کے ہمراہ جنگ کے میر شکیل الرحمٰن کی وساطت سے لندن روانہ ہوئے تقریباً" ۲۷ یوم لندن میں گزرانے کے بعد وہ پھر شیخ زید ہسپتال آگئے کیونکہ لندن کے کراموہل ہسپتال کے ڈاکٹر نے انتہائی کمزوری کے باعث آپریشن کو ناممکن قرار دیا تھا۔ لندن سے واپسی کے بعد سے ہی جالب صاحب اور ہم سب اپنے اپنے طور پر سمجھ چکے تھے کہ اب کھیل ختم ہو رہا ہے۔ مگر اتنا عرصہ کھینچ جانا۔ یہ جالب صاحب کا ہی حوصلہ تھا۔ بیماری کے دوران وہ مسلسل شعر کہتے رہے۔ جنگ لاہور ان اشعار کو روزانہ شائع کرتا تھا۔ اس وقت مجھے ڈاکٹر اجمل نیازی کا جالب صاحب سے لیا ہوا انٹرویو یاد آرہا ہے۔ جس کے ابتدا میں نیازی صاحب نے لکھا ہے۔

عمر بھر "زندگی" حبیب جالب کی منتظر رہی۔ اور اب "موت" بھی ان کا انتظار کر رہی ہے۔

چلو جالب بھائی کو ہسپتال سے لے آئیں۔

میں نے اپنے چچازاد بھائی محسن سے کہا۔

بس ابھی چلتے ہیں غسل دینے والا آجائے۔

ڈیڑھ بجے دوپہر غسل دینے والے صاحب آگئے۔ درمیانہ قد سرخ سفید رنگت۔ ہمارے اباجی کی طرح مٹھی بھر سفید داڑھی' اور پھر میں' حمید بھائی' محمود' احسن' عاصم' مقصود اور غلام عباس شیخ زید ہسپتال روانہ ہوگئے۔ استقبالیہ شیخ زید ہسپتال پر ہم نے اپنی آمد کا مدعا بیان کیا' اس دن کائنات میں ایک ہی نام کی گونج تھی

حبیب جالب

استقبالیہ کلرک ہمارا مدعا سمجھ چکا تھا اس نے ہمیں جالب صاحب کے کمرے کی راہ دکھلائی۔ ہم درمیانے قدم اٹھاتے ہوئے اس سرد کمرے میں پہنچے۔ جہاں شاعر آتش نواء ٹھہریئے مجھے ایک واقعہ یاد آگیا۔ ہم گھروالے ایک بار ٹیکسی میں سفر کررہے تھے۔ ہماری باتوں سے ٹیکسی ڈرائیور سمجھ گیا کہ ہم جالب صاحب کے گھروالے ہیں۔ وہ بولا کہ جالب صاحب اگر کسی عمارت کی جانب اپنا شعر پڑھ دیں تو اس عمارت میں آگ لگ جائے۔ ہاں وہی حبیب جالب جنہیں شاعر آتش نواء بھی کہاگیا۔ سردخانے میں پڑا تھا۔ میں جالب صاحب کو کراچی ایئرپورٹ پر اکثر (Receive) کیا کرتا تھا۔ اور آج بھی ضروری کاغذات پر دستخط کرکے میں ہی انہیں Receive کررہا ہوں۔

جالب بھائی اسٹریچر پر لیٹے ہوئے ہیں۔ ایمبولینس کو سردخانے تک لایا جارہا ہے' میں ان کے چہرے کو' ہاتھوں کو چھورہا ہوں۔ گزشتہ رات پونے ایک بجے ان کی سانسوں کی ڈور ٹوٹی تھی۔ یوں بارہ گھنٹوں سے زیادہ وقت سے وہ سردخانے میں موجود تھے۔ مگران کے جسم میں لچک موجود ہے۔ چہرہ پر سکون' اور ہونٹوں پر ہلکی سی مسکان ہے۔

ہم جالب بھائی کو لے کر گھر روانہ ہورہے ہیں' ایمبولینس میں اسٹریچر پر میرے سامنے جالب بھائی پڑے ہوئے ہیں۔ ابھی کچھ دیر پہلے اخبار "خبریں" کے سرفراز صاحب سے گفتگو ہورہی تھی۔ وہ جالب بھائی کی تصاویر اور اشعار کے لئے پوچھ رہے تھے۔ میں کہ جسے جالب صاحب کا اکثر کلام ازبر ہے۔ انہیں شعر لکھوا رہا ہوں۔ انہی اشعار میں سے ایک شعر جالب بھائی کو ابدی نیند سوتے دیکھ کر یاد آرہا ہے۔

اب رہیں چین سے بے درد زمانے والے
سوگئے خواب سے لوگوں کو جگانے والے

جس وقت میں یہ شعر لکھوا رہا تھا تو قریب بیٹھے احمد راہی صاحب کی آنکھوں میں تیرتی شبنم کو میں واضح طور پر دیکھ رہا تھا۔

ایمبولینس گلی میں داخل ہوئی تو اک ہجوم اپنے محبوب شاعر کی جانب لپکا۔ ایمبولینس

رینگتی ہوئی گھر کے دروازے پر پہنچی اور درودیوار ایک بار پھر رونے لگے۔ جالب صاحب کو غسل کے لئے گھر کے عقبی حصے میں لے جایا جا رہا ہے۔ میں' احسن' عاصم' الماس' اعجاز' سجاد' عامر' غلام عباس اور محمود کے علاوہ عاشق جٹ کا بیٹا' غسل دینے میں معاونت کر رہے ہیں۔

سبحان اللہ' سبحان اللہ

بخشے ہوئے بندے ہیں جی

غسال بابا جالب بھائی کے بارے میں کہہ رہا ہے

جسم تو نرم پڑا ہے۔

جوڑ جوڑ نرم' ریشم کی طرح۔

سبحان اللہ' سبحان اللہ

بابا مسلسل جالب صاحب کے جسم کی نرمی پر انہیں داد دے رہا تھا۔ اور میں سوچ رہا تھا کہ اس وقت بھائی حلقہ یاراں میں گھرے ہوئے ہیں' ورنہ میں ان کی بہت سی گرفتاریوں کا عینی شاہد ہوں کہ جب بڑی بڑی فورسز انہیں گرفتار کرنے آتی تھیں تو وہ آہنی عزم' آنکھوں میں انقلاب کی چمک' سر اٹھا کر اور سینہ تان کر گرفتاری دیتے تھے۔

ہو حلقہ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

لیجئے جالب صاحب کو غسل دے دیا گیا ہے۔ اور انہیں سفید براق لباس پہنایا جا چکا ہے۔ مگر یہ کیا

ان کا منہ کھلا ہے ہونٹ وا ہیں

غسال بابا احسن سے کہہ رہے ہیں۔ ان کی تھوڑی کو اس کپڑے سے لپیٹ میں لے کر سر پر زور سے گرہ لگائیں تاکہ ہونٹ آپس میں مل جائیں اور یوں منہ بند ہو جائے۔

احسن' بابا کی ہدایت کے مطابق عمل میں مصروف ہے۔ مگر جالب بھائی کا منہ بند نہیں ہو رہا ہے۔

میں بات سمجھ چکا ہوں' اور کہہ رہا ہوں۔

یہی تو ایک وصف تھا' میرے بھائی میں! بڑے بڑے سورما آئے' زور لگایا' لاکھ جتن کرڈالے' مگر اس منہ کو بند کرنے میں ناکام و نامراد رہے ان ہونٹوں کو کوئی نہ سی سکا۔ آپ لوگ بیکار وقت ضائع نہ کریں۔ یہ منہ کھلا ہی رہے گا۔ یہ ہونٹ وا ہی رہیں گے۔

اور میری بات جیسے سب کی سمجھ میں آچکی تھی۔ پھر میں نے سرخ گلاب' جی ہاں' جالب بھائی کا رنگ۔ سرخ' ان کے چہرے کے گرد پھیلا دیا۔ عہد نامہ لاؤ بھئی عہد نامہ۔ نہلانے والے بابا بولے۔ اور پھر عہد نامہ جالب صاحب کے سینے پر رکھ دیا گیا۔ اور اس لمحے مجھے جالب بھائی کی کلیات حرف سردار کا دیباچہ یاد آرہا ہے۔ جس کے آخر میں جالب صاحب لکھتے ہیں۔

"بزرگوں سے سنتے آئے ہیں کہ اے خدا' ساتھ ایمان کے قبر میں اتارنا' تو اس کے معنی میں یہی سمجھا ہوں کہ لوگوں سے باندھے گئے پیمان وفا پر آخری سانس تک قائم رہنا۔"

کلمہ شہادت کے ساتھ اس شخص کو اٹھایا جارہا ہے جس کی لمحہ لمحہ زندگی گواہی تھی۔

ایک بہادر کو اس کی بہادر بیوی اور بیٹیوں کے پاس لایا جارہا ہے۔

ایک بار پھر آہ و بکا کا شور

لوگ کہہ رہے ہیں۔ انہیں اچھی طرح رو لینے دو۔

انہیں جی بھر کے دیکھ لینے دو۔

مگر یہ بھی تو سچ ہے کہ کروڑوں دلوں کی دھڑکن اور پھر اپنے کلام کی صورت وہ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

اب آہستہ آہستہ ان کی بیوی اور بچیوں کو ان سے ذرا دور کیا جارہا ہے۔ تمام خواتین کو بھی ہٹایا جارہا ہے تاکہ مرد حضرات بھی جالب صاحب کا دیدار کرسکیں۔ لیجئے شیخ رفیق آرہے ہیں۔

میں کہتا ہوں بھائی کے وکیل آرہے ہیں۔ اور پھر شیخ رفیق عوام کے شاعر کے حضور سر کو ذرا سا احتراماً" جھکاتے ہوئے کہہ رہے ہیں۔

"ایسے بیٹے مائیں روز روز پیدا نہیں کرتیں' اور میں جالب کی بہادر بیوی کو بھی سلام پیش کرتا ہوں۔"

ہاں شیخ صاحب درست کہا آپ نے۔ کہ ایسے بیٹے مائیں روز روز پیدا نہیں کرتیں اور اسی لئے وہ عظیم ماں' جس کا نام رابعہ بصری تھا وہ اپنے عظیم بیٹے کو ساتھ لے جانے کے لئے خود آئی تھی۔

میں لاہور پہنچا تو بھابی نے مجھے بتایا کہ آخری وقت میں بھائی صاحب مسلسل کہہ رہے تھے۔

میری اماں کمرے کے باہر آئی ہے۔ کھڑی ہے۔

اسے تاج (ہماری بھابی) اندر لے آؤ۔

دیکھو وہ مجھے لینے آئی ہے۔

مجھے جانا ہے۔

مگر اماں کو اندر تو لے آؤ۔

بھابی کہتیں کہ باہر تو کوئی بھی نہیں ہے میں دیکھ کر آئی ہوں۔ مگر بھائی صاحب بھابی پر بگڑ بگڑ جاتے۔

جاؤ جاؤ۔ میری ماں باہر کھڑی ہے۔

دروازے کھول دو۔

کھڑکی کھول دو۔ اور بالآخر عظمت' عظمت کو لے گئی۔

بھابی نے کمرے کے باہر جا کر رو رو کر کہا۔ لاکھ منت سماجت کی کہ اماں تم کو ہم پر رحم نہیں آتا۔ کیوں لے جا رہی ہو' اپنے بیٹے کو

مت لے جاؤ۔

مگر بھائی بھی تو رکنے کو تیار نہیں تھے۔ وہ خود کہہ رہے تھے کہ مجھے جانا ہے۔

میں جا رہا ہوں۔

شیخ رفیق صاحب کے بعد ایک طویل سلسلہ اکابرین کا۔ سیاسی رہنما' شاعر' ادیب' صحافی'

وکلاء جج صاحبان' دانشور' اور جالب صاحب کے اصل وارث عوام اپنے محبوب شاعر کا دیدار کر رہے تھے۔ میں بھیگی آنکھوں کے ساتھ گلی میں نکل آیا کہ عاصم میرے قریب آیا اور بولا۔

سعید بھائی موسم اچانک بدل گیا ہے۔ کالے بادل چھا گئے ہیں بارش ہو گئی تو کیا ہو گا۔

میں اس سے کہتا ہوں کہ ایمبولینس کا انتظام کر لیتے ہیں

پھر میں' عاصم' مقصود کی جیپ میں ایمبولینس کے لئے نکل جاتے ہیں' موسلا دھار بارش شروع ہو چکی ہے۔ کڑکتی دھوپ میں ہم جالب بھائی کو ہسپتال سے لائے تھے۔ یہ دیکھتے ہی دیکھتے آسمان کیوں رونے لگا۔

مقصود نے جیپ ایک طرف روک دی ہے۔ پانی کی سفید چادر سی آنکھوں کے سامنے تن چکی ہے۔ ایسے میں جیپ نہیں چلائی جا سکتی۔ ہمیں بارش کا زور ٹوٹنے کا انتظار کرنا ہو گا۔ ہم تینوں جیپ میں بیٹھے ہیں۔ میں پھر سوچوں کے دھاروں پر بہتا چلا جا رہا ہوں۔

آج تمام عالمی نشریاتی ادارے اپنے اپنے طور پر "فکر امن عالم" کے شاعر کو رخصت کر رہے ہیں۔ اور مجھے اپنے آبائی گاؤں "میانی افغاناں" کے قریبی گاؤں "ٹانڈہ" کے بابا دولے شاہؒ یاد آ رہے ہیں کہ جنہوں نے مشتاق بھائی کے میٹرک پاس کرنے کی شنید بڑے جلال میں رزلٹ آنے سے پہلے ہی سنا دی تھی۔ اور اباجی سے کہا تھا کہ "رب دی سوں" اگر تیرا بیٹا پاس نہ ہوا تو میں اس مزار کو اینٹ اینٹ کر دوں گا۔ ہم یوں ہی کتے رنگڑ فقیر نہیں بنے ہیں۔ ہم نے اپنے مرشد کے حضور عرض پیش کر دی ہے۔ اور وہ بارگاہ الٰہی میں منظور ہو چکی ہے۔ بابا والے شاہؒ کی گفتگو جاری تھی کہ جالب بھائی کے پرائمری کے ٹیچر احمد حسن صاحب آ گئے۔ انہوں نے بابا کو خاص کیفیت میں دیکھا تو کہا کہ بابا جی کچھ ہمارے شاگرد حبیب کے بارے میں بھی دعا فرما دیں۔ تو بابا دولے شاہ بولے کہ "اس کی تو خوشبوئیں دور دور تک پھیلیں گی۔"

آسمان کھل کر رو چکا ہے۔ بارش کا زور ٹوٹ چکا ہے۔ ایسے میں ہم جیپ اسٹارٹ کر کے آگے بڑھتے ہیں۔ چند قدم کے فاصلے پر ایدھی ایمبولینس کا اسٹیشن ہے۔

ایدھی ایمبولینس لے کر ہم گھر کی جانب لوٹ رہے ہیں۔

بارش مسلسل ایک ہی رفتار سے، مگر دھیمی۔ دھیمی برس رہی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ایسے میں جالب صاحب کو ان کی ابدی آرام گاہ پہنچانے کے لئے روانہ ہوا جائے۔

کلمہ شہادت کے ساتھ جالب صاحب گھر سے روانہ ہوتے ہیں، گلی کے دونوں اطراف مکانوں کے شیڈز کے نیچے کھڑے ملک کے مختلف شعبوں کے نامور لوگ کندھا دینے کے لئے آگے بڑھتے ہیں۔ مگر جالب صاحب کو تو ایدھی ایمبولینس کے ذریعے لے جایا جارہا ہے۔ لوگوں کا ایک ہجوم ایمبولینس کے آگے پیچھے چل رہا ہے۔ کاریں، ویگنیں، موٹر سائیکل ایک طویل جلوس کی قیادت جالب صاحب کر رہے ہیں۔ علامہ اقبال ٹاؤن سے سبزہ زار کالونی کے شاہ فرید قبرستان کا ڈیڑھ میل کا فاصلہ طے کر کے جلوس جنازہ، نماز کے لئے قبرستان کی مسجد کے باہر پہنچ کر رک گیا ہے۔

بارش مسلسل جاری ہے۔ نماز کے لئے قطاریں بنائی جارہی ہیں۔ نماز جنازہ سے پہلے، قبرستان پہنچنے والوں کو جالب صاحب کا دیدار کروایا جارہا ہے۔ یہاں سے جالب صاحب کی ابدی آرام گاہ چند قدم کے فاصلے پر ہے۔ عشاق چند قدم انہیں اپنے کندھوں پر اٹھا کر لے جانا چاہتے ہیں اور جالب صاحب نے جیسے دوستوں کی یہ بات مان لی ہے

دوست انہیں کندھوں پر اٹھائے آہستہ آہستہ چل رہے ہیں۔

یہ کون ہے! سرخ سفید، گورا چٹا، جسم پر کھدر کا لباس پہنے، کھدر کی چادر گلے میں لپیٹ کر بازو پر ڈالے، یہ شخص جالب صاحب کو بالکل عسکری انداز میں سلوٹ پیش کر رہا ہے۔ ہاں، ہاں یہ خاکسار لطیف بٹ ہے۔ وہ مسلسل رو رہا ہے۔

جالب صاحب کو ان کی ابدی آرام گاہ کے قریب پہنچایا جاچکا ہے۔ ابدی آرام گاہ تیاری کے آخری مراحل میں ہے۔ مصطفےٰ قریشی اپنی نگرانی میں کام کروا رہے ہیں۔ وہی خاکسار لطیف بٹ دھاڑیں مار مار کر رو رہا ہے

رلا رہا ہے۔

جالب کس کے سہارے چھوڑے جارہے ہو۔

ہم کسے اپنا غم سنائیں گے۔

کون ہماری غم گساری کرے گا۔ اعتزاز احسن رو رہے ہیں۔ احمد ندیم قاسمی صاحب کی نظریں جالب صاحب کی قبر پر گڑ کر رہ گئی ہیں۔ دمے کے مریض شیخ رشید مسلسل بارش میں بھیگ رہے ہیں۔ سرد ہوائیں بھی چل رہی ہیں۔ مگر سب بے نیاز سے کھڑے ہیں۔

لیجئے وہ وقت آن پہنچا کہ جب عوام کے شاعر کو زمین کے سپرد کیا جا رہا ہے' اور اب بات کو آگے بڑھانے کے لئے میں اخبار ''خبریں'' کی سرخی کا سہارا لے رہا ہوں ''روتے موسم میں حبیب جالب ہمیشہ ہمیشہ کے لئے آنکھوں سے اوجھل ہو گئے۔'' شیخ رشید بیماری و کمزوری کے باوجود جالب صاحب کو مٹی دینے کے لئے آگے بڑھ رہے ہیں' لوگ انہیں پکڑ رہے ہیں۔ بارش کی وجہ سے پھسلن بہت ہو گئی ہے۔ مگر وہ خود مٹی دینے کے لئے بضد ہیں۔ لطیف بٹ نے مٹی دینے کے بعد' قبر کی مٹی کو اپنے منہ پر مل لیا ہے۔ مٹی دینے کے عمل کے بعد عشاق قبر پر پھول چڑھا رہے ہیں۔ اور مجھے جالب صاحب کی آواز سنائی دے رہی ہے۔

کسی کی آنکھ نہ ہو نم' یہ سوچتے ہیں ہم

جالب صاحب کو خاک کے سپرد کر کے' احباب واپس جا رہے ہیں۔ پھر چند قدم چل کر لوگ رک گئے ہیں۔ سب کا رخ جالب صاحب کی جانب ہے۔ جیسے وہ کہہ رہے ہوں۔

پھر کبھی لوٹ کر نہ آئیں گے
ہم ترا شہر چھوڑ جائیں گے
شمع ماہ و نجوم گل کر کے
آنسوؤں کے دیئے جلائیں گے
دور افتادہ بستیوں میں کہیں
تیری یادوں سے لو لگائیں گے
آخری بار اک غزل سن لو
آخری بار ہم سنائیں گے

بابا نجمی کی کتاب ''اکھراں وچ سمندر'' کی تقریب حبیب جالب کی صدارت پر، ہمراہ مخدوم خلیق الزماں مہمان خصوصی کے علاوہ ایس۔ ایم۔ انعام، سعید پرویز اور بابا نجمی

صورت موجہ ہوا جالب
ساری دنیا کی خاک اڑائیں گے

تم کیا گئے

جالب بھائی آہستہ آہستہ چلے ہی جا رہے تھے۔ اور پھر جب اماں ان کے استقبال کے لئے آگئیں تو بھلا جالب بھائی کیونکر رک سکتے تھے۔ تمام عمر فرمانبردار بچے کی طرح انہوں نے کبھی اماں ابا کی بات نہ ٹالی تھی۔ تو آخری عمر میں وہ اماں کے ساتھ جانے سے انکار کیسے کر دیتے۔

میری ماں مجھے لینے آئی ہے۔
مجھے اس کے ساتھ جانا ہے'
مگر اماں کو اندر تو لے آؤ۔ پھر چلتے ہیں۔

جالب بھائی! اپنے آخری سفر پر روانگی سے دو روز پہلے سے یہی ایک بات مسلسل کہہ رہے تھے۔ بھابی نے تو باہر جا کر اماں سے رو رو کر خوشامد کی کہ اماں اپنے بیٹے کو مت لے جاؤ کیا تمہیں ہم پر ترس نہیں آتا!

مگر بات یہ نہیں تھی' کہ اماں کو ترس کیوں نہیں آ رہا تھا۔ اب جالب صاحب خود بھی رکنے کے لئے تیار نہ تھے۔ بقول ڈاکٹر اجمل نیازی ''تمام عمر زندگی جالب صاحب کی منتظر رہی اور اب وہ موت کو بھی انتظار کروا رہے ہیں''

اور جب بھائی نے چاہا۔ تو وہ چل دیئے۔

میں کراچی میں بابا نجمی سے اکثر کہا کرتا تھا۔ کہ یار جالب بھائی کے بعد میرا انتظار ختم ہو جائے گا۔ وہ جو مجھے ہمیشہ انتظار رہتا ہے کہ بھائی لاہور سے کراچی آنے والے ہیں۔

وہ انتظار۔
وہ ختم ہو جائے گا

میری بات سن کر بابا نجمی ' کچھ بھی نہ کہہ پاتا۔ اور خاموشی سے گردن جھکا دیتا۔ بابا نجمی نے بھی جالب صاحب کو خوب پیار کیا ہے۔ کبھی کبھی تو دن رات مسلسل جالب صاحب کے ساتھ گزارے ہیں۔ بابا نجمی کی شاعری کے بارے میں جالب صاحب کہا کرتے تھے۔

اوئے بابا! تیری شاعری کو پیئے لگے ہوئے ہیں۔ بابا نجمی کی پہلی کتاب "اکھراں وچ سمندر" آئی بابا نے کتاب کی تقریب کی صدارت کے لئے جالب صاحب سے درخواست کی۔ جسے انہوں نے قبول کیا کارڈ چھپے تقسیم ہوئے۔ عین موقع پر جالب صاحب ہسپتال میں داخل ہوگئے۔ ان کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔

بابا نجمی نے بھی تقریب ملتوی کردی۔ اور پھر تقریب ایک ڈیڑھ سال بعد ہوئی تو کرسی صدارت پر جالب صاحب ہی بیٹھے تھے۔ جب کہ مخدوم خلیق الزماں مہمان خصوصی تھے۔

پاکستان کا ہر شہر جالب کا شہر تھا۔ اور پھر کراچی سے تو ان کا یوں بھی خاص تعلق تھا۔ اس شہر میں ان کے یار محمود شام' عبدالحمید چھاپرا' منہاج برنا' ایس ایم انعام کپتان (پریس کلب کراچی) مجاہد بریلوی' مجید بلوچ' مشتاق گزدر' ڈاکٹر بدر صدیقی ڈاکٹر طارق سہیل معراج محمد خان' اقبال حیدر نفیس صدیقی' ڈاکٹر سرور' حمید کاشمیری' زاہدہ حنا فہمیدہ ریاض' سعیدہ گزدر' سہیل اور عزیز میمن۔

ویراں ہے میکدہ خم و ساغر اداس ہیں
تم کیا گئے' کہ روٹھ گئے دن بہار کے

آہ جالب صاحب آہ
نہیں
واہ جالب صاحب واہ

گھر کے قلم کار

گوشۂ صوفی عنایت اللہ

دعا

مانگت ہوں، بھکاری ہوں، مولا مجھے حرمت دے
بس اپنا بنا لیجئے اب غیر سے نفرت دے
یہ میری تمنا ہے اپنی ہی محبت دے
آزاد طبیعت دے، توقیر دے عزت دے
کر دور یہ بدحالی، جاگی ہوئی قسمت دے
اسلام پہ مرنا ہو، اسلام پہ جینا ہو
ایسی مجھے ہمت دے، ایسی مجھے طاقت دے

حق حق ہے تری شان ہے حق ذات ہے تیری
تو مالک ومیراث السموات ہے تیری
ہر رنگ میں خوشبو میں عیاں ذات ہے تیری
یہ غوث وقطب سب میں کرامات ہے تیری
جن پہ ہے نظر تری وہ کھوٹی بھی کھری ہے
چاہے جسے عزت دے، چاہے جسے ذلت دے

ان نوری ضیاؤں سے دل میرا منور ہو
پہنچوں میں مدینے میں یہ میرا مقدر ہو
جی بھر کے دعا، مانگوں میں سامنے روضے کے

آنکھوں میں وہ نقشہ ہو' دل میں وہ تصور ہو
پھر جھولی کو پھیلا کر منہ سے یہ پکاروں میں
معمور خزانے سے ایمان کی دولت دے

جھولی مری خالی ہے انعام سے بھر دیجے
جو کام ادھورے ہیں ان کاموں کو کر دیجے
کب میں نے تمنا کی آقا مجھے زر دیجے
مجھ کو تو مدینے کا بس زاد سفر دیجے
دیکھوں ترے روضے کو وہ پاک نظر دیجے
بے چین مرا دل ہے' روضے پہ بلا لیجے

معراج کی شب آقا نبیوں کی امامت کی
اور امت عاصی کی اللہ نے شفاعت کی
سب بگڑی بنا ڈالی سرکار نے امت کی
بھر دے مری جھولی میں خیرات محبت کی
رہتی ہے دعا حق سے ہر سانس عنایت کی
اسلام کو غلبہ دے' اسلام کو نصرت دے

بارگاہِ الٰہی میں دعا

ہم گناہ گاروں کو یارب کر گناہوں سے بری
سوکھی اعمالوں کی کھیتی یا خدا کر دے ہری

ہم بھٹکتے جارہے ہیں، منزلِ مقصود سے
واسطہ اپنے حبیبِ پاک کا، کر رہبری

صدقۂ شاہِ دو عالم اور صدقہ پنجتن
صدقۂ غوث الوریٰ کا کر ہماری بہتری

اور سارے اولیائے پاک کے یارب طفیل
میرے پلّے میں جو پونجی کھوٹی ہے کر دے کھری

کہنے والا، حق، کوئی منصور حق حق کہہ گیا
اس زمانے میں نہیں ہے، کوئی بھی مردِ جری

نفسی نفسی لب پہ، دل میں جذبہ ملی بھی ہے
بلہوس رہبر ہماری کیا کریں گے رہبری

شعر موتی ہیں ترے، پر ہے پرکھنے والا کون
قدر زر زرگر بداند، قدر جوہر جوہری

سب کی ہے تجھ پر عنایت، سب ہیں تیرے مہرباں
نقشبندی، سہروردی، صابری وقادری

منسلک ہو کر کسی سے پا صراط مستقیم
منکشف ہوں، تجھ پہ راز باطنی و ظاہری

مارچ ۱۹۶۵ء
۳ر۳۵ جٹ لائن
کراچی

نعت

ناز ہے مجھ کو غلام شہِ ابرار ہوں میں
گرچہ مجرم ہوں مگر بندۂ سرکار ہوں میں

یا رسولِ دوسرا لاج مِری رکھ لینا
گو گنہگار، جفاکار، سیہ کار ہوں میں

روزِ محشر کو مرے عیب نہ کھل جائیں حضور
نام لیوا ہوں تمہارا سگِ دربار ہوں میں

آپ کے روضۂ اقدس پہ میں کیسے آؤں
زادِراہ پاس نہیں اس لئے لاچار ہوں میں

یا الٰہی مجھے کعبہ کی زیارت ہو نصیب
ایک مدت سے اسی شوق میں سرشار ہوں میں

میں برا ہوں یا بھلا آپ کا کہلاتا ہوں
آپ کی چشمِ عنایت کا طلب گار ہوں میں

غلامی

غلامی پنجتن کے گھر کی اور در کی غلامی ہو
غلامی بانیٔ اسلام کے گھر کی غلامی ہو
غلامی شیرِ یزداں شاہِ حیدر کی غلامی ہو
غلامی حضرتِ زہرہ و اطہر کی غلامی ہو
غلامی حضرتِ شبیر و شبیر کی غلامی ہو
مِرے مولا مری قسمت میں اس گھر کی غلام ہو
غلامی قبلۂ سرکار جیلاں کی غلامی ہو
جنابِ غوثِ اعظم پیرِ پیراں کی غلامی ہو
غلامی والیٔ اجمیر ذیشاں کی غلامی ہو
معین الدین قطب الدین سلطاں کی غلامی ہو
فرید الدین ولیٔ گنج پنہاں کی غلامی ہو
الٰہی مجھ کو ان سب اہلِ عرفاں کی غلامی ہو
مجھے خاصانِ خاصاں حق کے دلبر کی غلامی ہو
جنابِ حضرتِ مخدوم صابر کی غلامی ہو

علاءالدین چشتی ایسے رہبر کی غلامی ہو
مجھے اجمیر ولی اور کلیر کی غلامی ہو
غلامی ہو مجھے بابا فرید الدیں کے پیارے کی
نظام الدین محبوبِ الٰہی ماہ پارے کی
غلامی ہو مجھے حضرت نصیرالدیں دلارے کی
جنابِ حضرتِ خسروِ سخی روشن ستارے کی
مجھے ان اولیائے پاک کی مولا محبت دے
کروں میں پیروی ان کی الٰہی مجھ کو ہمت دے
غلامی فخر ہے مجھ کو انہی جان پیمبر کی
محمد کے صحابی حضرتِ صدیق اکبر کی
غلامی عمرؓ کی اسلام کے اس میرِ لشکر کی
فدایانِ محمد حضرتِ عثماں دلاور کی
علی خیبر شکن جدِ پیمبر شاہِ حیدر کی
غلام ان کا میں کہلاؤں غلامی ہو نہ ورد کی
عقیدت ہے مجھے سب سے اگرچہ قادری ہوں میں
غلامانِ نظامی ہوں غلامِ صابری ہوں میں

منقبت

مِرے ٹوٹے ہوئے دل کا سہارا غوثِ اعظم ہیں
مِرے دکھ درد کا اور غم کا چارا غوثِ اعظم ہیں

کیا اسلام کو زندہ محی الدیں لقب پایا
نبیؐ کے دین کا روشن ستارا غوثِ اعظم ہیں

مِری سرکار کو ہے لاج میں ہوں آپ کا خادم
مجھے ہر دور میں کامل سہارا غوثِ اعظم ہیں

وہی غم خوار و مونس ہیں وہی حامی و ناصر ہیں
وہی رہبر وہی یاور ہمارا غوثِ اعظم ہیں

خدا کی بارگاہ میں گڑگڑا کر عرض کرتا ہوں
مصیبت ٹل گئی جب بھی پکارا غوثِ اعظم ہیں

مریدی لاتخف فرمانِ عالی شاہِ جیلاں ہے
سہارا ہے مجھے ان کا اگرچہ خالی داماں ہے

جناب غوث اعظم کا میں منگتا ہوں بھکاری ہوں
سخی ان کا گھرانہ ہے سخاوت ان کے شایاں ہے

حضور اب خطۂ بغداد میں مجھ کو بلا لیجے
یہی اب دل میں حسرت ہے یہی اب دل میں ارماں ہے

ترے دربارِ عالی پر میں مفلس کس طرح آؤں
قرض کا بار سر ہے سخت مشکل میں مری جاں ہے

حضور اب دیر کیا ہے کیجئے امداد بے کس کی
نہ طاقت ہے نہ ہمت ہے نہ پلّے میرے ساماں ہے

میں ہوں مقروض یا حضرت مری غیبی مدد کیجئے
میں اس غم میں پریشاں ہوں۔ مرا دل سخت ویراں ہے

بچالو دشمنوں سے یا شہِ جیلاں مرید اپنا
حضور اس دَور میں چاروں طرف خطرے کا ساماں ہے

مدح سرکار بغداد

مری وردِ زباں ہر دم جو نامِ غوثِ اعظم ہے
جدھر جاتا ہوں کہتے ہیں غلامِ غوثِ اعظم ہے

مہینہ گیارھویں کا آیا ہر سو نور چھایا ہے
جدھر دیکھو ادھر ذکرِ سلامِ غوثِ اعظم ہے

پیو آکر پیو اے عاشقو سرشار ہو جاؤ
نجف ہے میکدہ گردش میں جامِ غوثِ اعظم ہے

نوشاہی سہروردی قادری چشتی ولی جتنے
تعالیٰ اللہ سب پر فیضِ عامِ غوثِ اعظم ہے

بڑی گیارھویں شریف کے موقع پر حضرت مولانا ضیاء القادری کے مکان ۲/۲۲ جٹ لائن کراچی طرحی مشاعرہ میں پڑھی گئی۔

مصرعہ طرح: نجف ہے میکدہ گردش میں جام غوث اعظم ہے

عرض بدرگاہ پیرانِ پیر سیدنا غوث الاعظم

تم نبی کے لاڈلے اور مرتضیٰ کے تم ہو لال
حضرتِ حسنین کے تم چمن کے ہو نونہال
جان بہ لب ہوکر میں، کہتا ہوں تو ورنہ کیا مجال
تم سا میرا پیر ہو پھر یہ مصیبت ہو محال
امداد کن امداد کن از رنج و غم آزاد کن
در دین و دنیا شاد کن یا غوث الاعظم دستگیر

وقار غوث اعظم ہے

مرا دل اور میری جاں نثارِ غوثِ اعظم ہے
مرا قبلہ مرا کعبہ دیارِ غوثِ اعظم ہے

شریعت ان کے گھر کی ہے طریقت ان کے گھر کی ہے
جہانِ معرفت پر اقتدارِ غوثِ اعظم ہے

تمامی اولیا کی گردنوں پر ہے قدم ان کا
گروہِ اولیا میں یہ وقارِ غوثِ اعظم ہے

محی الدین جیلانی

نہیں سنتا کوئی تجھ بن مری فریاد جیلانی
خدارا کیجئے اب تو مِری امداد جیلانی
ترے دربار میں دکھیا کہانی لے کے آیا ہوں
مری سن لو مری سن لو مری رو داد جیلانی
میں ڈرتا ہوں ' بڑا ہی خوف چھایا ہے مرے دل پر
بچالو دشمنوں کی سازشوں سے اے مرے یاور
غم دنیا کی سختی سہہ نہیں سکتا دلِ مضطر
نہ طاقت ہے نہ ہمت ہے نہ پلّے میرے مال و زر
پھنسا ہے سخت مشکل میں تمہارا بندۂ بے زر
کرو امداد اے لخت دل مشکل کشا حیدر

محی الدین جیلانی
محی الدین جیلانی

بیٹے کے لئے باپ کی دعا

مرے لختِ جگر کو دولتِ ایمان دے یارب
بچا لے اس کو یا مولا، طفیلِ شیریزدانی

یہی ہے التجا میری، یہی ہے آرزو میری
اسے مومن بنا دو، دل میں بھر دو نورِ ایمانی

بچا لے حاسدوں، مطلب پرستوں، دھوکے بازوں سے
جو دل میں کینہ رکھتے ہیں، محبت جن کی ہے فانی

اسے اللہ والوں کی دعاؤں نے نوازا ہے
وہی اللہ والے کر رہے ہیں اس کی نگرانی

نصیحت کارگر ہوتی نہیں اس پر، بری صحبت مسلط ہے
بھٹکتا جا رہا ہے، کیجئے اس کی نگہبانی

بچالو اس کو ان ہمدم نما دشمن کے پھندوں سے
جو ظاہر میں مسلماں ہیں بہ باطن کفر کے بانی

میں ڈرتا ہوں' بڑا ہی خوف چھایا ہے مرے دل پر
غمِ دنیا کی سختی سہہ نہیں سکتا دلِ مضطر

بچا لے یا خدایا میرے بچوں کو شریروں سے
دعا کرتا ہوں' اللہ اور اللہ کے فقیروں سے

بینتی

کراں بینتی اس دربار اگے جہنے بخشیا سب ظہور مینوں
کراں شکر تے لکھ کروڑ سجدہ دتا اکھیاں دے وچ نور مینوں

سبھے نعمتاں تے دنیا دا میوہ دتا رب نے کیتا بھرپور مینوں
جو کجھ منگیا پیر دستگیر کولوں اوہو بخشیا رب غفور مینوں

ہے پر اک غم ہے دل دے وچ میرے جہنے بہت کیتا چور چور مینوں
نکر جھلاں گا نزع دے ویلڑے نوں ایہو غم کردا رنجور مینوں

جدوں تن وچوں رخصت روح ہووے کلمہ پڑھن دا دیویں شعور مینوں
قبر وچ پواں دس ڈاہڈیاں دے غصے نال ویکھن گھور گھور مینوں

جدوں اوہناں نوں میں جواب دیواں، دیویں روشنی قلب سُرور مینوں
مومن بندہ حضور دا امتی ہاں، کلمہ پاک کیتا نور نُور مینوں

میری اکھ وچ نشہ محمدی اے جامِ وحدت دا ہے سُرور مینوں
میرے رب نے بخشیا اے شرف مینوں لوکی جاندے بے شعور مینوں
اودے فضل تے کرم دا آسرا اے نیک عمل دا نئیں غرور مینوں

اک نزع تے دوجا قبر اندر، پل صراط دی لنگنا ضرور مینوں
چوتھے حشر نوں موماناں سنگ رل کے، پیش ہو وناں ربِ غفور مینوں

دل چھل تے دغا فریب میرا، کھل جائے ہے خطرہ ضرور مینوں
کرکے کرم اوس ویلے غریب اتے، آقا بخش دیویں میرا قصور مینوں

خطا معاف کرکے بخشیں قرب اپنا، نہ کریں اپنے در تھیں دور مینوں
حاضر وچ حضوری دے رکھ آقا، بھاویں سد کرکے کور کور مینوں

دریا جوش وچ لپھاں ماردا اے، ٹکر لگاں ہے خطرہ ضرور مینوں
ہے ملاح جس بیڑے دا غوث الاعظم پار لا اس بیڑے دے پور مینوں

میں ہر حال وچ شکر گزار اوس دا جس تھاں رکھے رکھے منظور مینوں

۲ جنوری ۱۹۷۴ء

اللہ دے محبوب محمدؐ

اللہ دے محبوب محمد سر پر تاج شہانہ
نبیاں دے سردار محمد سر پر تاج شہانہ
او سوہناں سب سوہنیاں نالوں رتبہ جیدا یگانہ
کعبے وانگوں اوہدا کوچہ جتھے اوہدا ٹھکانہ
نوری خاکی جن ملائک جھکے سب زمانہ
مینوں وی اک وار دکھاوے او دربار شہانہ
تیرا رتبہ سب تھیں اُچا اے محبوب غفاری
دین دنی دی تینوں بخشی اللہ نے سرداری
اول آخر ظاہر باطن فیض ترا اے جاری
خلق عظیم ترا اے عالی عالی ترا گھرانہ
اس دنیا وچ جد آیا سی قدم مبارک تیرا

چار چوفیرے کفر شرک دا چھایا ہویا سی ہنیرا
اللہ دا پیغام سنا کے چکیا کفر دا ڈیرا
شمع توحید دی روشن کر کے خلق کیتی پروانہ
غفلت وچ جوانی روہڑی یاد کراں پچھتاواں
بڈھا ہو کے پڑھاں نمازاں دل دے وچ شرماواں
میرے نالوں سب جگ چنگا جد میں جھاتی پاواں
اتھے اوتھے دویں جہانی عملاں دا پھل پاواں
وچ گناہاں اندر بھریا تینوں کیویں مناواں
آن ڈگا در تیرے اُتے ہور میں کس در جاواں
کر منظور مری ہن توبہ تاں خلاصی پاواں
استغفار کراں ہر ویلے تاں میں بخشیا جاواں
عمر دا لوڈا ویلا آیا ڈھل گیا پرچھاواں
بخشش دی میں آس لگا کے دل نوں پیا سمجھاواں
نال کرم دے کردے مولا میریاں معاف خطاواں
غوثُ الاعظم پیر میراں دا میں مرید کہاواں
آمین یا رب العالمین

دعا

سارے جگ توں سوہنیا چن ماہیا تیرے عشق کیتا سرشار مینوں
میرے دل دے وچ اے شوق ڈھاڈا جے کر سد لویں دربار مینوں
دیکھا رج کے پاک دربار تیرا' نالے منگاں جو کجھ درکار مینوں
تیرے پاک دربار توں جان صدقے جے کر سد لویں اک بار مینوں
تیرا نام لیوا تیرا منگتا میں نہ ہن اپنے درتوں دھتکار مینوں
جیہڑے تیری حضوری چہ آون والے کریں اینادے وچ شمار مینوں
دریا شر شیطان دا و گدا اے دھکے دیوے موذی مکار مینوں
پیر تلک نہ پوے کمزور میرا بانہوں پھڑکے پار اتار مینوں
صدقہ حسن بے مثل دا یا آقا وقت نزع دے دیویں دیدار مینوں
کلمہ پڑھن دی آخری دم ویلے کلی ہوش روے سرکار مینوں
(آمین یارب العالمین)

۱۹۴۵ء

جنت اے کوچہ تیرا

جنت اے کوچہ تیرا تیرے دیوانیاں نوں
تیرا گھر کعبہ دسے تیرے مستانیاں نوں
عشق دی شمع تے جو جل کے منور ہوگئے
دوزخ نے ساڑنا کی اوہناں پروانیاں نوں
سچے دربار دے وچ جیدی رسائی ہوگئی
اوہناں نے فیر کی کرنا تاج شہانیاں نوں
رب دیاں یاداں وچ گوشہ نشین ہوجا
چھڈ کے دکھ ہوجا اپنے بیگانیاں نوں

دنیا توں دکھ ہو کے حال وچ مست ہوجا
یاد نہ کرتوں پیارے بیتے زمانیاں نوں
دل نوں مصفّا کرلا میل کچیل دھولا
بھل جا سارے پچھلے پیار پرانیاں نوں
شہر بغداد عالی کلیر اجمیر دلی
رب نے شرف دتا اینہاں ٹھکانیاں نوں

دلی والوں کی ایک سال میں پانچ عیدیں

دلی والے، حضور نظام الدین اولیا رحمتہ اللہ کا نام نامی اسم گرامی کو بڑے پیار سے مختصر سے لقب سلطان جی کہہ کر پکارتے ہیں۔ دلی والوں کی پانچ عیدیں یوں ہوتی ہیں۔ یہ دلی والے حضرت نظام الدین محبوب الٰہی کی سترویں کے عرس کو اور حضرت امیر خسرو کے عرس کی سترویں کو بھی عیدین کی خوشی سے کم نہیں سمجھتے۔ دلی کے پیر پرست لوگ بزرگان دین سے محبت و عقیدت رکھنے والے دونوں سترویوں کو بھی ایک اسلامی تہوار سمجھتے ہیں ان مذکورہ عرسوں کی خوشی میں یہ اپنے اور اپنے بچوں کے نئے کپڑے بناتے ہیں۔ نہایت خوشی و خوشنودی کا اظہار کرتے ہیں۔ بستی نظام الدین شہر دلی سے باہر تین میل مقبرہ ہمایوں کے متصل واقع ہے۔

عرس کے دنوں میں شہر سے ہر طبقہ کے لوگ جوق در جوق معہ اہل و عیال سترویں شریف کے عرس میں بڑی عقیدت مندی سے حاضری دیتے ہیں۔ سبحان اللہ کیا ہی وہ اچھا زمانہ تھا جب کہ میرا بڑا لڑکا مشتاق حسین مرحوم دلی وائسرائے کے دفتر میں ملازم تھا ۱۹۳۹ تا ۱۹۴۷ تک

کا یہ دور مجھ پر ایک زریں دور گزرا ہے یہ حسن اتفاق تھا کہ میں نے معہ اہل و عیال سات آٹھ سال دلی میں گزارے ہیں تو میں نے بھی معہ اہل و عیال ہمراہ مشتاق حسین کے حضرت محبوب الٰہی کے دربار فیض آثار کی زیارت کی ہے اور معہ اہل و عیال کے اکثر ہر سال سترویں شریف کا نورانی منظر دیکھا ہے۔ میں اس زمانے کو زریں دور اس لئے کہتا ہوں کہ کہاں میانی افغاناں ایک چھوٹا سا قصبہ اور کہاں دلی شہر ہندوستان کا دارالخلافہ۔ میرے تمام بچوں نے دلی میں ہوش سنبھالی ہے۔ خوش قسمتی سے میں نے بزرگان دہلی کے تمام درباروں پر حاضری کی سعادت حاصل کی ہے دیگر دہلی کے تمام تاریخی مقامات بھی دیکھے ہیں۔

یہ مسلمہ بات ہے کہ مجھے بزرگان اولیا سے سچی عقیدت ہے۔ میرا بڑا لڑکا مشتاق حسین بھی اولیائے کرام کا عقیدت مند تھا۔ خداوند کریم مشتاق حسین کو بزرگان اولیا کا صدقہ جنت الفردوس عطا کرے آمین۔ مشتاق حسین مرحوم ۴۷ سال کی عمر میں ۷۹ء میں فوت ہو گیا اور ہم بوڑھے والدین کو داغ جدائی دے گیا اس لائق فائق بیٹے کے طفیل ہم نے دلی جیسا مرکزی شہر دیکھا۔ اسی کا اثر میرے چھوٹے بچوں پر بھی پڑا۔ یہ بھی لائق ہیں۔ مشتاق حسین مرحوم میٹرک پاس تھا لیکن بزرگوں کی دعاؤں سے محکمہ اطلاعات و نشریات شعبہ فلم میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر تھا اس کا دل بزرگوں کی عقیدت سے سرشار تھا۔ عرسوں پر حاضری دیتا۔ قوالی کا بھی شائق تھا اور عمدہ شاعر بھی تھا تو ہم لوگ ہمراہ مشتاق حسین کے حضرت محبوب الٰہی کی سترویں شریف کا خوش منظر اور نورانی سماں ہر سال دیکھتے تھے۔ ہندوستان کے نامی گرامی مشہور قوال پارٹیوں کی قوالی سن کر بھی محظوظ ہوتے تھے۔ حضرت محبوب الٰہی کا عرس حضرت کے دربار سے باہر مقبرہ ہمایوں تک پھیلا ہوا ہوتا تھا۔ رنگ برنگ مٹھائیوں کی دکانیں ہوٹل جہاں موسم کے لحاظ سے ہر چیز کھانے کو تازہ بہ تازہ میسر ہوتی تھیں۔ قسم قسم کی دکانیں آراستہ و پیراستہ ہوتی تھیں۔ باہر کے دروازے کے قریب ہار پھول پتی اگربتی شیرینی کی دوکانیں دو رویہ سجی ہوئی ہوتی تھیں جہاں سے زائرین ہار پھول خرید کر دربار پر چڑھاتے تھے میں نے یہ سماع بچشم خود حضرت کی سترویں کے عرس کا خوش نصیبی سے دیکھا ہے۔

دلی والوں کی پانچ عیدیں اس طرح ہیں

(۱) عیدالفطر یعنی میٹھی عید (۲) اسی ماہ اس کے بعد ۷ اشوال کو حضرت امیر خسرو کا عرس۔
(۳) ۱۰ ذالحجہ کو عید الاضحی بڑی عید
(۴) ۱۲ ربیع الاول کو عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم
(۵) ۱۷ ربیع الاول کو سلطان نظام الدین محبوب الٰہی کا عرس یعنی محبوب الٰہی کی سترویں یہ پانچ عیدیں جنہیں دو سترویوں کے عرس اور دو عیدین اور سب سے افضل حضورؐ کی پیدائش عید میلا النبیؐ جسے تمام مسلمان جذبہ اسلام سے ذوق و شوق سے مناتے تھے۔

عرس کے دنوں میں شہر دلی کے مختلف محلوں سے خاص حضرت محبوب الٰہی مرحوم کی درگاہ تک اسپیشل بسیں چلائی جاتی تھیں زائرین کی سہولت کے لئے درگاہ محبوب الٰہی میں نہایت اچھا انتظام ہوتا تھا۔ مگر پھر بھی لوگ وفور شوق میں پیدل جاتے تھے۔

فوارہ چاندنی چوک سے

قطب روڈ سے

پہاڑ گنج سے

قرول باغ سے

سبزی منڈی سے

نئی دلی رائے سینہ سے

دلی دروازے

لوہاری گیٹ سے

علی ہذالقیاس شہر دلی سے لے کر بستی حضرت نظام الدین محبوب الٰہی تک قطار در قطار مخلوق خدا سترویں کے عرس کی طرف رواں دواں نظر آتی۔ کوئی بسوں میں کوئی دیگر سواریوں پر کوئی پیدل شوق میں چلا جارہا ہے۔ کئی لوگ ٹھیلوں پر اپنے بال بچوں کو لادے ہوئے جارہے

ہیں۔ زائرین محبوب الٰہی کی سترویں پر جاکر اپنے اپنے وکیل صاحب کی وساطت سے شب و روز عرس میں شمولیت کرکے جاتے۔ رہائش کا انتظام کرتے اور با حفاظت سامان رکھ کر پھر عرس کا لطف اٹھاتے۔ بھنڈارے سے دونوں وقت کھانا لیتے۔ خود کھاتے اور اپنے بچوں کو کھلاتے عقیدت سے نذرانے پیش کرتے۔ محبوب الٰہی کے آستانے پر رات دن نمازیں پڑھتے اور فیض پاتے یہ وہاں نہایت اچھا طریقہ تھا کہ پیر زادوں میں سے زائرین کی سہولیت کے لئے زائرین کے وکیل بن جاتے۔ اس میں زائرین کا ہی فائدہ ہوتا تھا ورنہ اتنے بڑے اژدھام میں رہائش کا کھانے کا انتظام ہونا دشوار ہو جائے یہ وکیل صاحب کی وساطت سے آرام و آسائش حاصل ہوتا تھا لہٰذا ہمارے وکیل صاحب بھی حضرت سید فضل شاہ صاحب ہوتے تھے ان کی محبت و شفقت سے ہمیں بڑا آرام ملتا تھا۔ ایک دفعہ آپ ہمیں کراچی میں آکر ملے تھے یہ ایک واقعہ ہے کہ چاند کی سترویں تاریخ کی کیا تعریف کی جائے آسمان پر چاند اپنی پوری آب و تاب سے روشن ہوتا اس چاندنی رات کو شہر دلی سے مضافات سے لوگ ہر طرف سے میلے پر آتے ساری رات کی چاندنی کا شمار نورانی اور رات بھی سہانی لوگوں کا تانتا بندھا ہوا ہے۔ یوں لگتا کہ یہ حضرت کے پروانے اپنے دل میں پاک محبت کا جذبہ لئے رواں دواں ہیں جیسے وہ پرواز کر رہے ہوں جیسے ان کے پاؤں زمین پر ٹکتے ہی نہ ہوں جیسے ان کے پاؤں کو زمین چھوتی ہی نہ ہو جیسے یہ قافلے در قافلے اسی ٹھنڈی ٹھنڈی چاندنی میں حضرت محبوب الٰہی کی محبت میں سرشار ہو کر محویت کے عالم میں جا رہے ہوں۔

آسمان پر چاند بھی خوش ہو رہا ہو اور اپنی نورانی شعاعیں ان پر برسا رہا ہو۔

سترویں کی رات بھی نورانی اوپر آسمان پر چاند بھی نورانی ان محبوب الٰہی کے پرستاروں کے دل بھی نورانی ان کے چہرے بھی نورانی محبوب الٰہی کا دربار بھی نورانی میں نے ایسا سماں نور اعلیٰ نور زندگی میں خوش قسمتی سے یہاں دیکھا ہے میری قسمت میں ان باکمال بزرگوں کے آستانوں کی زیارت ایسا ہے جیسا کہ میں گناہوں سے پاک ہو گیا ہوں اللہ مجھے ان بزرگان اولیا کے طفیل گناہوں سے پاک کرے آمین ثم آمین میں نے جب پہلی بار حضرت محبوب الٰہی رحمتہ اللہ کا دربار دیکھا تھا تو خوشی کے عالم میں میری آنکھوں سے آنسو جاری

تھے۔ سبحان اللہ میں نے محبوب الٰہی کا دربار شاہانہ ان گناہگار آنکھوں سے دیکھا۔ آپ کے دربار کی زیارت مجھے نصیب ہوئی۔ میں اس وقت اپنی قسمت پر ناز کر رہا تھا۔

تذکرہ حضرت امیر خسرو رحمتہ اللہ

آپ کی پیدائش ۶۵۱ ہجری (تاریخ کتاب دار الحکومت دہلی سے لکھی ہے) آپ کا نام ابو الحسن یمین الدین تھا۔ خسرو تخلص فرماتے تھے۔ گو آپ کی پیدائش ہندوستان جنت نشان قصبہ پٹیالی ضلع ر۔ٹہ کی ہے مگر آپ کا ترکستان سے تعلق تھا۔ حضرت امیر کے والد بزرگوار سیف الدین' شمس کے لقب سے مشہور تھے آپ نے امیر کو بڑے ناز و نعمت سے پالا تھا حضرت امیر خسرو ظاہری حسن و جمال میں لاثانی تھے اور حسن سیرت سے بھی مالا مال تھے آپ کے والد ماجد امیر سیف الدین ترک چین سردار قوم ترک ہزارہ بلخ ہزارہ کے تھے اور امیر زادوں میں سے تھے جو چنگیز خاں کے زمانے میں ملک ہندوستان چلے آئے تھے مومن آباد عرف پٹیالی مضافات بدایوں جو گنگا کے کنارے ہے رہائش پذیر ہوئے۔ یہیں حضرت امیر خسرو کی پیدائش ہوئی۔ جب یہ پیدا ہوئے تو آپ کے والد ایک کپڑے میں لپیٹ کر محلے میں رہائش پذیر ایک مجذوب کے پاس لے گئے اس باکمال بزرگ نے انہیں دیکھ کر فرمایا۔ آپ میرے پاس ایسے شخص کو لائے ہو جو خاقانی سے بھی دو قدم آگے ہوگا۔ پھر آپ کے والد نے امیر خسرو کو حضرت محبوب الٰہی کا مرید کرایا۔ جب حضرت امیر خسرو آٹھ سال کے ہوئے تو آپ کے والد بزرگوار آپ کو اور آپ کے دو بھائیوں کو جن کے نام عزیز الدین علی شاہ و حسام الدین تھے ہمراہ لے کر حضرت محبوب الٰہی رحمتہ کی خدمت میں روانہ ہوئے راستے میں حضرت امیر خسرو نے اپنے والد سے عرض کی کہ آج آپ ہمیں کہاں لے جا رہے ہیں۔ آپ کے والد بزرگوار نے فرمایا کہ میں تم تینوں بھائیوں کو حضرت شیخ نظام الدین اولیا محبوب الٰہی رحمتہ اللہ کا مرید بنوانے کے لئے لے جا رہا ہوں۔ حضرت امیر نے اپنے والد ماجد کی خدمت میں عرض کی مرید ہونے کے لئے شیخ کا انتخاب میری مرضی پر منحصر ہے آپ کے والد یہ جواب

سن کر اندر تشریف لئے گئے روایت ہے کہ حضرت امیر خسرو آستانے کے بیرونی دروازے پر بیٹھ گئے اور بیٹھے بیٹھے تصور کیا کہ اگر شیخ کامل ہستی ہیں تو میں یہ رباعی کہتا ہوں۔ وہ میری رباعی کا جواب دے کر مجھے اندر بلا لیں گے

رباعی

تواں شاہی کہ ایوان قصرت
کبوتر گر نشید باز گردو
غریبے مستمندے بردر آمد
بیائد اندروں یاباز گردو

حضرت محبوب الٰہی کو کشف کے ذریعہ امیر خسرو کا حال معلوم ہو گیا حضرت نے اسی وقت خادم سے فرمایا کہ دیکھو باہر دروازے پر ایک لڑکا بیٹھا ہے تم اسے جا کر یہ رباعی پڑھ کر سنا دو (رباعی) حضرت محبوب الٰہی

بیائد اندروں مرد حقیقت
کہ باماایک نفس ہم رازگردو
اگر ابلہ بوداں مردناداں
ازاں راہے کہ آمد بازگردو

حضرت امیر خسرو یہ رباعی سن کر متاثر ہوئے اندر جا کر زیارت سے مستفید ہوئے آپ تینوں بھائی حضرت کے مرید ہوئے۔ آپ نہایت ہونہار اور ذہانت کے مجسمہ تھے اس وقت امیر کی عمر ۸ سال تھی (دارالحکومت دہلی درج ہے) ایک سال بعد آپ کے والد ماجد کا انتقال پچاس برس کی عمر میں ہوا آپ کے والد کفار کے ہاتھوں شہید ہوئے تھے۔ پھر حضرت امیر خسرو کی پرورش آپ کے نانا نے کی آپ کے نانا عماد الملک نے انہیں اپنی سرپرستی میں لے لیا تھا آپ کے نانا غیاث الدین بلبن کے امرا میں سے تھے۔ آپ کے نانا اگرچہ بوڑھے تھے مگر زندہ دل ہونے کی وجہ سے جوانی کی آب و تاب رکھتے تھے آپ کے نانا کو ہندوستانی موسیقی سے بے حد شغف تھا آپ علم موسیقی سے بڑی دلچسپی رکھتے تھے آپ کے ہاں اکثر راگ رنگ

کی محفلیں جمتی رہتی تھیں۔ گویئے اور موسیقار خوش گلو سنگیت کار آپ کے در دولت پہ آتے اور اپنے فن کا مظاہرہ کرتے یہ ہر فن کار کے قدر دان تھے کوئی نہ کوئی سنگیت کار آپ کے ہاں قیام پذیر ہوتا تھا۔

جہاں گھڑا جائے وہاں سونا گرے گا یہی سبب خاص ہے کہ حضرت امیر خسرو کے کان میں راگ ودھیا کے سریلے سروں کی سماعت ہوئی۔ امیر خسرو بچپن میں ذہین تھے دن رات راگ راگنیوں کو سنکر ان کے پیچ وخم زیر وبم سے بخوبی واقف ہو گئے اور سر تال اور لے کاری کے نشیب و فراز سے بخوبی آشنا ہو گئے۔

اتفاقاً" تخت دہلی کے شاہی تاجدار بلبن سے لے کر جلال الدین خلجی تک جتنے بھی حکمران ہوئے ہیں سب علم موسیقی سے ذوق و شوق رکھتے تھے۔ رفتہ رفتہ حضرت کو اپنے نانا کی صحبت سے علم موسیقی میں وہ نمایاں مقام حاصل ہوا کہ آپ گائین ودھیا کے نائیک کہلائے۔ اپنے پیرو مرشد کی توجہ سے آپ کو ہر فن میں کمال حاصل ہوا دیگر سلطنت دہلی کے حکمرانوں سے بھی حضرت امیر کے روابط مخلصانہ اور دوستانہ رہے۔

حضرت امیر خسرو جنگی کارناموں میں شاہی رسالوں کے ہمرکاب بھی رہے۔ بہر حال حضرت امیر خسرو ہر موقع پر شاہان دہلی کے مقرب درباری کی حیثیت سے اعلیٰ منصب پر فائز رہے ہیں۔

آپ کا مقام درباری شاعر ہونے کی حیثیت سے بھی اعلیٰ اور بلند رہا ہے شاعری کی مقبولیت کے سبب آپ کا نامی اسم گرامی قیامت تک رہے گا۔

✲

گوشۂ مشتاق مبارکؔ

حمد

ہے کتنا ترا مجھ پہ لطف و کرم
کیا خلق انساں سنوارا جنم

تری قدرتوں کے مظاہر ہیں سب
یہ ارض و سما عرش و کرسی قلم

ترے قرب کے جو سزاوار ہیں
چلا مجھ کو ان کے قدم بہ قدم

الٰہی وہ کر چشمِ بینا عطا
رہے کوئی جھگڑا نہ دیر و حرم

مجھے تو نے بخشا وہ عز و شرف
کہ میں ہوں غلامانِ شاہِ اُمم

میں اپنی غریبی میں مسرور ہوں
ہو ان کو مبارک یہ جاہ و حشم

نعت شریف

ختم ہے تیری ذات پر سلسلۂ پیمبری
تجھ پہ نثار جان ودل مظہرِ شانِ داوری

نام ترا نشاطِ دل ذکر ترا سکونِ جاں
اے شہِ خاورِ جمال ماہِ منیر دلبری

دست بہ سینہ روبرو تیرے غرورِ خسرواں
تیرے حضور سجدہ ریز جاہ و جلالِ قیصری

حاصلِ رازِ کُن فکاں نازشِ بزم دو جہاں
عرشِ اوعلیٰ کے راز داں شمعِ حریمِ برتری

ظلمت جہل تھی عزیز جن کو وہ دور ہی رہے
حلقہ بگوش ہو گئے نورِ خرد کے مشتری

کفر کی یورشیں تھیں ہیچ تیرے عمل کی راہ میں
تیری نظر میں گرد تھا دبدبۂ سکندری

مِل گئی منزلِ نجات جھوم رہی ہے کائنات
راہبروں کے راہبر ختم ہے تجھ پہ رہبری

تھے جو ترے عدوئے جاں ان کو بھی بخش دی اماں
واہ رے لطفِ بے کراں واہ ری بندہ پروری

ہے یہی میرا مدعا ہے یہی میری آرزو،
صرف ہو تیری مدح میں میرا کمالِ شاعری

ہو گا مِرا سرِ نیاز اور ترا آستانِ ناز،
کی جو میرے نصیب نے تیرے کرم سے یاوری

تیرے مقامِ عِلم کو کوئی سمجھ سکے کا کیا
تیرے حضور سجدہ ریز دانشِ علمِ حیدری

در پہ مبارکؔ آپ کے آئے جو اے شہہِ عرب
اس کو بھی بخش دیجئے دولتِ فقرِ بوذری

نعت

وردِ زباں ہے نام خدا کے رسول کا
یہ مرتبہ ہے ایک ظلوم و جہول کا

ہونٹوں پہ میرے اشہد ان لا الٰہ ہے
دل منتظر ہے رحمتِ حق کے نزول کا

نعتِ رسول سے ہے مری روح وجد میں
گنجینہ مل گیا مجھے حسنِ قبول کا

خود اٹھ رہے ہیں سوئے مدینہ مرے قدم
احساس کیوں ہو راہِ محبت میں طول کا

غافل میں کس لئے ہوں درود و سلام سے
درماں یہی تو ہے مرے قلبِ ملول کا

نظروں میں میری اسوۂ خیر الوریٰ ہے
رشتہ یہی ہے خلدِ بریں کے حصول کا

کچھ اور بڑھ گیا گلِ طیبہ کا اشتیاق
کانٹا چُبھا جو راہ میں کوئی ببول کا

کرنا پڑے گا عالمِ امکاں کو اتباع
آخر محمدؐ عربی کے اصول کا

ہر شعر نعت کا ہے یہ مشتاق دل نواز
چوما ہے منہ بہار نے ایک ایک پھول کا

بارگاہِ نبوی میں

نورِ احمد جب حرم کے در سے پہنچا بام پر
چھا گئی ہیبت یکایک آذری اصنام پر

ایک سرمایہ ہے قلب و روح کی تسکین کا
کیوں نہ ہوں قرباں دل و جاں مصطفیٰؐ کے نام پر

احمدِ مرسل کے در کی ہو غلامی گر نصیب!
رشک ہو گا اک جہاں کو میرے صبح و شام پر

یہ غلامانِ محمد مصطفیٰؐ کی شان ہے
آج بھی وہ خندہ زن ہیں گردشِ ایّام پر

رازِ تکمیلِ نبوّت کو سمجھنے کے لئے
اک نظر آغاز پر ہو اک نظر انجام پر

کر رہے ہیں لوگ تجدیدِ رسالت کس لئے
حرف آتا ہے خدا کے آخری پیغام پر

نعت شریف

یہ رفعت یہ شوکت یہ عظمت نبی کی
کہ مدحت سرا خود ہے فطرت نبی کی
ہمارے لئے مشعلِ زندگی ہے
محبت خلوص اور سیرت نبی کی
زہے خوش نصیبی کہ ہنگامِ محشر
مرے کام آئے شفاعت نبی کی
یہ اک مختصر سی تمنّا ہے دل میں
الٰہی نظر آئے صورت نبی کی
نبی جانتے ہیں خدا کی حقیقت
خدا جانتا ہے حقیقت نبی کی
کشود و رموزِ دو عالم مبارکؔ
ہے ادنیٰ سی یہ اک کرامت نبی کی

نعت شریف

منحصر ہے اسی امّید پہ جینا میرا
اے شہِ دیں کبھی مسکن ہو مدینہ میرا

یہ ترا فیض ہے اے ساقیٔ میخانۂ دیں
بادۂ عشق سے لبریز ہے مینا میرا

کلمہ گو ہوں تیرا حق ہے میرا خلدِ بریں
نورِ توحید سے پُر نور ہے سینہ میرا

ناخدائی کا شرف آپ کی حاصل ہے اسے
کیوں گرفتارِ تلاطم ہو سفینہ میرا

بوئے گلہائے عرب سے ہے معطر دل وجاں
عطر سے کم نہیں خوشبو میں پسینا میرا

آپ کا پیرو ِ صادق ہوں بہ احسانِ خدا
کیوں نہ ہو قابلِ تقلید قرینہ میرا

ہو گا حاصل مجھے عرفانِ الٰہی بھی ضرور
کہ ہے عشقِ شہِ لولاک ہی زینہ میرا
دیکھ لیں ایک نظر دل کو اگر سرور دیں
خاتمِ عشق کے قابل ہو نگینہ میرا
اے مبارک مئے کوثر کا تمنائی ہوں
حشر کے دن پہ ہی موقوف ہے جینا میرا

نیر تاباں

ہوا طلوع افق پر وہ نیرِ تاباں!
کہ جس کے نور سے روشن ہے عالمِ امکاں
یہ جس کو دیکھ رہا ہے خدائے ہر دو جہاں
محمدِ عربی ہے بنائے کون و مکاں
خدائے جلوۂ سرکار و سرور دوراں
متاعِ عمر گریزاں نشاط روح و رواں
خدا گواہ درودِ محمدِ عربی
ہے عالمِ بشریت پہ اس کا اک احساں
نثار ختمِ رسل تجھ پہ کائناتِ حیات
کہ تو نے ہم کو عطا کی ہے دولتِ قرآں
جلائی شمعِ ہدایت برائے نوعِ بشر
بتایا منزلِ حق آگہی کا نام و نشاں

وہ دل جو کفر کی آماجگاہ تھے ان کو
بیک نگاہ بنایا ہے مرکزِ ایماں
غرورِ لات و ہبل پاش پاش ہو کے رہا
ہوئی بلند جو بیتِ حرم میں بانگِ اذاں
نہیں ہے کون و مکاں میں ترا شریک و سہیم
تو بے نظیر ہے واللہ رسولِ ہر دو جہاں
خدا نصیب کرے تیری پیروی سب کو
کہ پیروی میں ہے تیری' نجات کا ساماں
ترے اصول رہیں گے ازل سے تابہ ابد
بنائے عظمتِ انسان و رفعتِ انساں
ترا خلوص ترا خلق تیرا طرزِ حیات
چراغِ محفلِ ایقان و منزلِ عرفاں
یہی ہے دل کی تمنائے آخری آقا
ترے دیارِ مبارک میں ہوں میں زمزمہ خواں

عرضِ حال

ہوں اسیرِ رنج و غم یا رحمت اللعالمین
مجھ پہ بھی چشمِ کرم یا رحمت اللعالمین
آپ کی ذاتِ مقدّس ہے شفیع عاصیاں
کس کے در پر جائیں ہم یا رحمت اللعالمین
رو کشِ صحنِ حرم ہے اہلِ دل کے واسطے
آپ کا نقشِ قدم یا رحمت اللعالمین
یاد میں جو آپ کی گزریں بہ اُمیدِ نجات
ہیں وہ لمحے مغتنم یا رحمت اللعلمین
میکدے کا آپ کے جامِ سفالیں ہے ہمیں
رو کشِ صد جامِ جم یا رحمت اللعالمین
رہروانِ راہِ یثرب موجۂ صرصر سے بھی
ہو گئے ہیں تازہ دَم یا رحمت اللعالمین

مل گئی ہے دولتِ عشق آپ کی جن کو انہیں
کیوں ہو فکرِ بیش و کم یا رحمت العالمین

پوچھئے، مجھ سے تو صحرائے عرب کے سامنے
ہیچ ہے باغِ اِرم یا رحمت اللعالمین

آگئے ہیں یاد جب مجھ کو مصائب آپ کے
ہو گئی ہے آنکھ نم یا رحمت اللعالمین

ہو رہے ہیں کیوں غلاموں پر مسلسل آپ کے
دہر کے ظلم وستم یا رحمت العالمین

حسب سابق دہر میں لہرا رہا ہے آج بھی
حق پرستی کا علم یا رحمت العالمین

ہے محبت آپ سے جن کو انہیں ہوتی نہیں
خواہشِ دام و درم یا رحمت العالمین،

اہلِ باطل ہم پہ غالب آنہیں سکتے کبھی،
ہم کہ ہیں اہلِ اُمم یا رحمت العالمین

فیض سے تیرے نبی صحرا نوردوں کی کنیز
شوکت وشانِ عجم یا رحمت العالمین

آپ ہی کے دَر سے ہوتی ہے مبارکؔ کو عطا
دولتِ حسنِ رقم یا رحمت العالمین

غزلیات

جس گھڑی جلوہ فگن وہ مہ پُرنور ہوا
اس کے پرتو سے جہاں جلوہ گہہِ طور ہوا

اس کے اندازِ کرم کا ہے یہ ادنیٰ سا کمال
جس پہ کی چشمِ عنایت وہی منصور ہوا

اس کی نازک سی حقیقت ہے ترا حسن و جمال
عشق بن کر مری فطرت میں جو مستُور ہوا

وہ بھی تھے موسمِ گل بھی تھا فضا بھی رنگین
حشر پھر تیرا بتا کیا دلِ رنجور ہوا

اف وہ انگڑائی کا عالم وہ امنگوں کا ہجوم
دفعتاً" ٹھیس لگی شیشۂ دل چور ہوا

ہے سراسر یہ میرے شوقِ جنوں کا اعجاز
حسن اس وسعتِ عالم میں جو مشہور ہوا

مختلف دیدۂ ساقی نے دکھائے اعجاز
کوئی سرشار کوئی بے خود و مخمور ہوا

شہرتِ حسن کے باعث ہے میرا شورِ جنوں
ورنہ کیوں وسعتِ آفاق میں مشہور ہوا

پیرِ میخانہ کا اللہ رے فیضانِ کرم
کوئی شبلی کوئی سرمد کوئی منصور ہوا

کب سے بے تاب ہیں مشتاق نگاہیں میری
آکہ اب ختم مرے صبر کا مقدور ہوا

غزلیات

وہ تیرے آتشیں عارض پہ سُرمگیں آنچل
رخِ شفق پہ ہو جیسے خفیف سا بادل

ہوا کی چھیڑ سے یوں پھیلتا گیا جیسے
کسی کی نرگسی مخمور آنکھ میں کاجل

عجیب منظرِ فطرت تھا دیکھ کر جس کو
غریبِ دل کی امنگوں میں پڑ گئی ہلچل

ہجومِ یاس سے کچھ تو فسردہ خاطر تھے
دکھا کے جلوہ ہمیں اور کر گئے بیکل

دل و نگاہ کی افسردگی ارے توبہ
سَرک رہا ہے گلوں سے بہار کا آنچل

چمن میں کسی گل رعنا کی آمد آمد ہے
کلی کلی کا ہے انداز چلبلا چنچل

گزار دیں شب فرقت کی ساعتیں ہم نے
جلا جلا کے ترے انتظار کی مشعل

مرے جنوں کے فسانے ہیں آج بھی اے دوست
برائے اہلِ خرد عقدہ ہائے لاینحل

ہزار سعی مسلسل کے باوجود ایدوست
نہ محو دل سے ہوئے تم نہ آنکھ سے اوجھل

جاتے ضرور دشت میں ان کو پکارنے
الجھا دیا ہمیں دلِ وحشت شعار نے
مارا تھا جن کو گردشِ لیل و نہار نے
بیٹھے ہیں اب وہ وقت کی زلفیں سنوارنے
کچھ اور ان کو رشک کے قابل بنا دیا
سادہ مزاج بخش کے پروردگار نے
شیرازہ حیات پریشان کر دیا
کافر ادا کی اک نگہِ شرمسار نے

جُنونِ عشق میں کچھ لطفِ سوز و ساز نہیں
شریکِ درد اگر وہ ستم نواز نہیں
تری خودی میں اگر بوئے فخر و ناز نہیں
جہانِ عشق میں غافل تو سرفراز نہیں
تعینات کے پردے اٹھا کے دیکھ ذرا
سوائے تیرے کوئی غیر محوِ ناز نہیں
نہیں ہے دل وہ حقیقت میں اور ہی شے ہے
جو تیرے عشق کی دولت سے سرفراز نہیں
ہے سربسر یہ ہماری نظر کی کوتاہی
کہاں وگرنہ تری جلوہ گاہِ ناز نہیں
وفورِ شوق سے رگ رگ میں درد بھرجائے
اگر یہ کیف نہیں ہے تو پھر نماز نہیں
میں اپنے غم کا مبارک ہوں آپ دیوانہ
وہ غزنوی ہوں کہ جس کو غمِ ایاز نہیں

زندگی نغمۂ بے ساز ہے کچھ اور نہیں
نگہِ ناز کا اعجاز ہے کچھ اور نہیں

دل کی دھڑکن پہ نہ کیسے ہمہ تن گوش رہوں
یہ فقط آپ کی آواز ہے کچھ اور نہیں

زندگی کا ہے جو انجام وہی اے ناداں
سربسر نکتۂ آغاز ہے کچھ اور نہیں

کیوں ترے غم کو نہ سینے سے لگا کر رکھوں
عالمِ ہجر کا دل ساز ہے کچھ اور نہیں

بدگمانی تری خاموش نگاہی پہ ہے کیوں
یہ ترے عشق کی غمّاز ہے کچھ اور نہیں

آپ کے حسنِ تغافل کا گِلہ ہو مجھ کو
یہ بھی اک آپ کا انداز ہے کچھ اور نہیں

زندگی مائلِ آرام و سکوں ہو کیسے
جس کی بنیاد تگ و تاز ہے کچھ اور نہیں

ترے ہونے کا یقیں تیرے نہ ہونے کا گماں
یہ بھی تخیل کی پرواز ہے کچھ اور نہیں
دلِ مشتاق میں آنے سے تکلف کیا ہے
آپ کی جلوہ گہ ناز ہے کچھ اور نہیں
سطح بیں اس کو سمجھتے ہیں نہ جانے کیا کیا
عشق تو پردہ در راز ہے کچھ اور نہیں
جانے کیوں ایک زمانے کو ہے مشتاق پہ ناز
تیری نظروں میں سرافراز ہے کچھ اور نہیں

مستی بھری نگاہ تو نکھرا ہوا شباب
گویا سمٹ کے آگیا ساغر میں آفتاب
اٹھی یہ کس کے عارضِ پُرنور سے نقاب
عالم مری نظر میں ہے اک نقشِ اضطراب
ہاں یاد ہیں مجھے وہ تری سحر کاریاں
اندازِ التفات میں اک رنگِ اجتناب
میں تابِ حسن لا نہ سکوں اس سے کیا غرض
اپنی تجلیوں کو تُو ہونے دے بے نقاب
ہیں میرے جذبِ شوق کی نیرنگیاں تمام
یہ تازگئ حسن یہ رنگینئ شباب
لرزاں حریمِ حسن ہے اس امتزاج پر

رقصندہ شوخیوں میں وہ آمیزشِ حجاب
جُز آرزوئے دید نہ تھی اور کچھ خطا
اتنی سی بات پر ہے یہ کیوں اس قدر عتاب
خود ملتفت نگاہ سے دیکھا کئے مجھے
میری نظر ملی تو انہیں آگیا حجاب
تو ہے کمالِ حسن تو میں ہوں کمالِ عشق
گر تو ہے لاجواب تو میں بھی ہوں لاجواب
کیفیّتوں سے کتنی عبارت ہے ایک دل
ہے یہ امینِ سوز و الم دردو اضطراب
میرے جنونِ شوق کی یہ وسعتیں تو دیکھ
ذرّوں سے کر رہا ہوں میں تخلیقِ آفتاب
صرفِ سجود اور ہو پھر عشق کے حضور
یارب مزاجِ حسن میں کیسا یہ انقلاب
رازِ شہود و شاہد و مشہود کیا کھلے
تنہا مری، نظر ترے جلوے ہیں بے حساب

وہ بھیگی پلکیں تھیں اشکوں پہ ایسے سایہ فگن
پڑی ہو رخ پہ ستاروں کے جس طرح چلمن
کلی کلی ہے امینِ بہارِ حسنِ چمن
مچل رہا ہے گلوں پر بہار کا دامن
مری سرشت ہے خود حسنِ ذات کا مخزن
الجھ نہ مجھ سے تو اے برقِ وادیٔ ایمن
شگفتہ نورس و نوخیز و نوبہارِ چمن
شباب و حسن کا سرچشمہ ہے وہ غنچہ دہن
یہ رنگ و روپ' یہ سج دھج یہ مدھ بھرا جوبن
ہیں دم بخود گل و لالہ و نرگس و سوسن
یوں گیسوؤں میں چمکتے تھے آتشیں عارض
ہو ابرپاروں میں جس طرح چاند چشمک زن

نہ جانے کتنی امیدوں کا خون ہے ساقی
جسے سمجھتا ہے تو جرعۂ شرابِ کہن

حریم دل میں وہ پھر درد بن کے آئے ہیں
تھی جن کے دم سے کبھی شمعِ زندگی روشن

نہ آرزو کا نشاں ہے نہ خواہشوں کی نمود
جسے سمجھتے ہو دل حسرتوں کا ہے مدفن

نقوشِ ماضی وہیں جاگے لے کے انگڑائی
کسی نے چھیڑی جہاں داستانِ رنج و محن

اگر ہو جذبہ عزم و عمل صداقت کیش
عجب نہیں کہ ہو تازہ حدیثِ دارورسن

تصورات کی دنیا میں آکے ایسے گئے
طرارے بھرتا نکل جائے جس طرح سے ہرن

رہِ طلب میں قدم اپنے ڈگمگا نہ سکے
ہزار راہ مبارک تھی ہر طرح سے کٹھن

ہزار شرم و حیا پردہ دار ہوکے رہی
ضیائے حسن مگر جلوہ بار ہوکے رہی

دل و نگاہ کی افسردگیٔ پیہم پر
وہ چشمِ ہوشربا اشکبار ہوکے رہی

تمہاری جلوہ گری عام تھی جہاں میں مگر
بقدرِ تاب نظر آشکار ہوکے رہی

کلیم جس کی سرِطور تاب لا نہ سکے
وہ اک جھلک مری پروردگار ہوکے رہی

نگاہِ ناز کی شوخی حجاب کا عالم
جھکی جھکی سی نظر دل کے پار ہوکے رہی

کسی کی سادہ و معصوم بھولی صورت پر
میری حیاتِ تمنا نثار ہوکے رہی

جہاں جہاں بھی چھپے تم وہیں پہ میری نظر
تمہارے حسن کی آئینہ دار ہوکے رہی

بارگاہ مرتضوی رضؓ میں

علیؓ تو اصل میں وہ مشعلِ امامت ہے
کہ جس کے نور سے روشن حریمِ فطرت ہے
علیؓ ہے بازوئے احمدؐ علیؓ ہے فخرِ اُمم
نہیں کلام کچھ اس میں یہ وہ حقیقت ہے
علیؓ ہے عقدہ کشائے جہاں کلیدِ حیات
علیؓ کہ دینِ محمدؐ کی زیب و زینت ہے
علیؓ کی شان ہویدا ہے فتحِ خیبر سے
علیؓ خزینۂ نصرت ہے دستِ قدرت ہے
علیؓ کا جس پہ کرم ہو اسے ولی کر دے
علیؓ کی ذات وہ سرچشمۂ ولایت ہے

بلند تر ہے مقام اس کا عرشِ اعظم سے
خوشا وہ دل کہ علیؓ سے جسے عقیدت ہے
بجا ہے ان کو اگر شاہِ اولیاء کہیئے،
ہر ایک عارف کامل انہی سے بیعت ہے
غلامِ ساقی کوثر ہوں تشنہ کام رہوں
اِدھر بھی چشمِ کرم ہو یہ کیا قیامت ہے
میں اپنی خوبیٔ قسمت پہ کیوں نہ ناز کروں
کہ حُبِ ساقیٔ کوثر عجیب نعمت ہے

مقام علیؓ

خوشا بہارِ رسالت زہے مقامِ علیؓ
فروغِ کلمۂ توحید ہیں نبیؐ و ولی،
علیؓ کہ نام ہے جس کا وقارِ دینِ مبیں،
علیؓ کہ ذکر ہے جس کا لطافتِ ابدی،
علیؓ کہ دینِ خدا کی بنائے محکم ہے،
علیؓ کہ جس پہ ہے نازاں شجاعتِ عربی
علیؓ ہے فاتحِ خیبر علیؓ ہے فخرِ عرب
علیؓ کہ ختم کیا جس نے زورِ بُولہبی
علیؓ ہے کاسرِ اصنامِ خانۂ کعبہ
علیؓ ہے قاطعِ حبل و درازِ تیرہ شبی

علیؓ مفسرِ ام الکتاب برحق ہے
علیؓ ہے عالمِ اسرار عالم ازلی
علیؓ ہے بابِ علوم و مدینۂ شہِ دیں
علیؓ کی ذات پہ ہے ختم عظمتِ ادبی
علیؓ ہے دینِ محمدؐ میں صادقُ الاسلام
علیؓ پہ کیوں نہ ہو نازاں رسولِ مُطلّبی
علیؓ کی ذات پہ اوصاف کا ہوا اِتمام
سمجھ علیؓ کو اگر ہے نصیب دیدہ وری
علیؓ کا عشق مبارک بنائے ایماں ہے
یہی ہے راہِ طلب میں چراغِ راہبری

یا علیؓ

جب زبانِ شوق پر خلوت میں آیا یا علی
رقص میں آئی بساطِ رنگ و بو پر زندگی
وہ علیؑ مرتضیٰ کہتے ہیں جن کو بو تراب
کی عطا اس خاک کے ذرّوں کو جس نے روشنی
وہ علیؑ مرتضیٰؓ خیبر شکن مرحب شکار
خاک میں جس نے مِلایا ہے غرورِ عنتری
وہ علیؑ مرتضیٰؓ فتاحِ بابِ عِلم و فن
جنبشِ چشمِ کرم جس کی ہے کنزِ آگہی
وہ علیؑ مرتضیٰ اسلام کا حصنِ حصین
وارثِ علمِ رسول و ذوالفقارِ حیدری

وہ علیؑ مرتضٰی مولودِ آغوشِ حرم
نازکش طفلی میں بھی جس کی تھی شانِ داوری
وہ علیؑ مرتضٰی از در شکار وقلعہ گیر
زورِ بازوئے رسول اللہ جاں باز وجری
وہ علیؑ مرتضٰی تنویر سیمائے ازل
جس نے بخشی چہرۂ کونین کو تابندگی
بند ہو سکتا نہیں بابِ ولایت حشر تک
ختم ہو سکتا نہیں فیضِ رواں جس کا کبھی
دیدنی شانِ سخاوت ہے کہ ہنگام نماز
بخش دی سائل کو بحرِ جود نے انگشتری
اللہ اللہ فاتحِ خیبر کی شانِ بے عدیل
سیرت و کردار میں ہے پرَتوِ پیغمبری
بسترِ احمد پہ جو سویا کیا ہجرت کی شب
پاس بھی خوفِ عدو جس کے نہیں آیا کبھی
مقصدِ واحد تھا اس کا خدمتِ دینِ الا
ملّتِ اسلام کا بانکا سپاہی تھا علی

اے کربلا کی خاک

اے کربلا کی خاک نہ ہو کیسے تجھ پہ ناز
سینے میں تیرے عظمتِ اسلام کا ہے راز
کیا یاد ہے تجھے وہ زمانہ کہ دین کا
تنہا حسین ابن علیؓ ہی تھا چارہ ساز
پھیلی ہوئی تھی کفر و ضلالت کی تیرگی
اہلِ ہوس کی اہلِ دول سے تھی سازباز
اسلام کے اصول نگاہوں میں خار تھے
باطل کی ہر ادائے تمرّد تھی دلنواز
آئینِ حق پرستی وایماں سے تھا گریز
اک شعبدہ نگاہ میں تھے روزہ و نماز

خوشنودیٔ یزید ہی منشائے زیست تھا
ہر شخص چاہتا تھا کہ ہو جائے سرفراز
ممکن نہیں تھا فتنہ طرازی سے اجتناب
کرتے نہیں تھے ظلم وشقاوت سے احتراز
جاہ وجلالِ دہر کے خواہاں تھے کم نظر
ذہنوں پہ اہلِ شر کے مسلط تھی حرص وآز
وابستہ ان کی تھی درِباطل سے ہر امید
کیوں آستانِ حق پہ جُھکاتے سرِنیاز

آفتابِ صبح

رنگِ زمانہ یہ تھا کہ اک مردِ باخبر
میدانِ کربلا میں ہوا ایسے جلوہ گر
جیسے طلوع ہو سرِ چرخ آفتابِ صبح
جیسے بساطِ عرش پہ ہو جلوۂ قمر
جیسے نسیمِ صبح پیامِ بہار لائے
جیسے نشاط روح بنے چہرۂ سحر
یہ مردِ باخبر تھا حسینِ جہاں پناہ
جس کی بلند وپست زمانہ پہ تھی نظر
لختِ دلِ بتول جگر گوشۂ علی
نورِ نگاہ و جانِ دلِ سیّد البشر

تھا سربکف تحفظِ اسلام کے لئے
شبیر جس کے تابعِ فرماں تھے بحروبر
جس کی نگاہ میں تھا جلالِ ابو تراب
ذاتِ خدا تھی پشت پناہ جس کی سربسر
خائف نہ تھا جو کثرتِ اعدائے شوم سے
جنگ آزما۔ تھا کفر سے بے حرف و بے خطر
نرغہ سے دشمنوں کا مگر واہ رے حسین
چوکھٹ پہ خم ہے خالقِ ارض وسما کی سر

معرکۂ کربلا کو دیکھ!

گہری نظر سے معرکۂ کربلا کو دیکھ،
ہاں دیکھ اور منزلِ صبرورضا کو دیکھ

ہستی پہ جن کی چادرِ تطہیر کو تھا ناز
حسرت سے آج اُن کے سرِ بے رِدا کو دیکھ

سجدے میں زیرِ تیغ بھی ہے سر حسین کا
اس بندگی کی شان کو اور اس وفا کو دیکھ

رہبر ہیں تیرے، نقشِ شہیدانِ کربلا
تو بھول کر بھی اب نہ کسی رہنما کو دیکھ

انسانیت کا درس دیا جو حسین نے
اس درسِ بے نظیر کی شانِ بقا کو دیکھ

سب کچھ خدا کی راہ میں قربان کر دیا
آ اور اہلِ بیت کے صدق و صفا کو دیکھ

ہر ذرہ ہے جمالِ حقیقت کا آئینہ
میری نظر سے خاکِ رہِ کربلا کو دیکھ

مشتاق پنجتن کے ہے دیدار کی طلب
آکر درِ علیؓ پہ مآلِ دعا کو دیکھ،

بارگاہ حسینی میں

پوچھو اسی سے عزت و عظمت حسین کی
جس دل میں موجزن ہے محبت حسین کی
کچھ تھی یزید سے نہ عداوت حسین کی
تھی کذب و افترا سے بغاوت حسین کی
فسق وفجور و کذب وریا شر کے برخلاف
ہے مستقل جہاد شہادت حسین کی
اس کی نظر میں دولتِ کونین کچھ نہیں
ورثے میں جس کے آئی محبت حسین کی
سر دے کے رسمِ سجدہ ادا کی حسین نے
اللہ رے یہ شانِ عبادت حسین کی
انسانیت کو رازِ حقیقت بتا دیا
اسلام کی ہے روح بصیرت حسین کی
چشمِ کرم کی ان کا ہے مشتاق منتظر
کب اس پہ ہو گی دیکھئے رحمت حسین کی

پہلے بھی وہ امام تھا اب بھی امام ہے

کتنا وہ خوش نصیب ہے عالی مقام ہے،
جو شخص اہلِ بیت کے در کا غلام ہے
حق بات میں کسی کو بھلا کیا کلام ہے
بے حبِ اہلِ بیت عبادت حرام ہے،
انسانیت کو جس نے دیا درسِ لاالہ
پہلے بھی وہ امام تھا اب بھی امام ہے
سجدے میں سر کو دے کے ہوا ہے جو سرفراز
اس ذاتِ پاک ہی کا تو شبیر نام ہے،
کنبہ خدا کی راہ میں قربان کر دیا
یا شاہِ کربلا یہ تمہارا ہی کام ہے
اس شان سے نہ ہو گی ادا صبح حشر تک
شبیر کی نماز کا جو التزام ہے،

حسینؑ ابن علیؓ

عزم و استقلال کے خود دار پیکر ہیں حسین
گامزن راہ حقیقت میں برابر ہیں حسین
کربلا کا ذرہ ذرہ اب بھی ہے اس کا گواہ'
ذوالفقارِ حضرتِ حیدر کے جوہر ہیں حسین
ہم تو کیا اغیار بھی اس بات کے ہیں معترف
امتیازِ حق وباطل کے وہ مظہر ہیں حسین
ہو نہیں سکتی اثر انداز بادِ کفر بھی
محفلِ اسلام کی شمعِ منور ہیں حسین
وہ کسی کے سامنے سر کو جھکا سکتا نہیں
جس کے آقا جس کے ہادی جس کے رہبر ہیں حسین
کس لئے ہو مجھ کو فکرِ انقلابِ روزگار
سایۂ رحمت کی صورت میرے سر پر ہیں حسین
ہوں مبارکؔ اس لئے آلِ محمدؐ پر نثار
مالک و مختار میرے بندہ پرور ہیں حسین

امام منتظر سے

اے سپہرِ دینِ برحق کے درخشاں آفتاب
اے امامِ منتظر والا گہر عالی جناب
جلوہ فرما ہو کہ دل بے چین ہے تیرے لئے
اے وقارِ نوعِ انساں محرم ام الکتاب
دیدہَ و دل کی تمنا ہے کہ فرشِ راہ ہو
پردہَ غیبت سے تو جس وقت آئے بے حجاب
آہ کہ تاریکی ہی تاریکی ہے بزمِ دہر میں'
آہ کہ ہے بے نور چشمِ آفتاب وماہتاب
سرفروشانِ وفا شیوہ سے بزمِ دہر میں
تاکجا یہ پردہ داری تابکے یہ اجتناب
خاکِ پا درکار ہے چشمِ عقیدت کے لئے
اے امامِ پاک ہم کب تک نہ ہونگے فیض یاب
ہے فروغِ دینِ برحق کا تجھی پر انحصار
کفر کے فتنوں کا ممکن ہے تجھی سے سدِباب
نعرہَ توحید گونجے جس سے زیرِ آسماں
اس جہانِ نو کو اب درکار ہے وہ انقلاب

سوئے کربلا گئے

آئی ندا کہ مالکِ ارض و سما گئے
چشم و چراغِ حیدر وخیر الوریٰ گئے
دین متیں کے راہرو ناخدا گئے
بیت الحرم کے آج وہ نغمہ سرا گئے
میدانِ امتحاں میں بہ حسن ادا گئے
عرصہ گہ حیات میں آل عبا گئے
لیکر متاعِ فقروغنا و رضا گئے
کس شان سے حسین سوئے کربلا گئے
اک نعرہ آفریں کا ہوا دفعتاً بلند
مقصد کو اپنے حضرتِ شبیر پا گئے
حقانیت پہ سر کو کٹا کر امام وقت
انسانیت کو اصل میں جینا سکھا گئے
ان کے غلام آج بھی ہیں راکب جہاں
ان کے غلام وسعتِ عالم پہ چھا گئے

شہید کربلا

حریفوں کی تگ و دو سے بالآخر، کیا ہو گا
سوا کچھ اور بھی ذکرِ شہیدِ کربلا ہو گا
رہے گا تذکرہ جاری یونہی آلِ محمدؐ کا
اسی انداز سے اعدائے مِلت کا گلا ہو گا
سنائی جائے گی رودادِ مظلوماں بہرصورت
بہر عالم ستم کیشوں کا شکوہ برملا ہو گا
اسی شدت سے تڑپے گا دلِ درد آشنا اپنا
اسی صورت بیاں کرب و بلا کا ماجرا ہو گا
اسی اخلاص سے تبلیغِ دینِ مصطفے ہو گی
اسی جرأت سے ذکرِ مصطفٰی و مرتضٰی ہو گا

اسی ضبط و تحمل سے حدیثِ غم سنائیں گے
اسی حسن عقیدت سے بیانِ کربلا ہو گا
اسی شانِ جلالی سے علم لہرائے گا اپنا
اسی جوشِ وغا سے سرخ رو دینِ خدا ہو گا
اسی دیوانگی سے یا حسین آئے گا ہونٹوں پر
اسی دل بستگی سے ذکر تسلیم و رضا ہو گا'
اسی درد آفرینی پر کریں گے ناز ہم پیہم
اسی خونابہ افشانی سے نخلِ غم ہرا ہو گا
اسی فرزانگی سے عام ہو گا نورِ ایمانی
اسی حق دوستی سے خوش خدائے دوسرا ہو گا
اسی در پر جھکیں گے شرپسند وفتنہ گر اک دن
اسی گھر سے انہیں پروانۂ جنت عطا ہو گا
اسی سرکار سے پائے گی فیض اب نوعِ انسانی
اسی دربار میں شاہ وگدا سب کا بھلا ہو گا
مبارک ختم ہو جائیں گے سارے تفرقے اس دن
زمانہ جب حسین ابن علی سے آشنا ہو گا

نماز

ایسی نماز جس کی نہیں ہے کوئی مثال
کرتا ہے کربلا میں ادا سیدہ کا لال
گھر لُٹ چکا جدا علی اصغر بھی ہو چکے،
ابرو پہ بَل ہے اور نہ کسی طرح کا ملال،
اہل وعیال کے نہیں مٹنے کا کوئی غم
دل میں فقط رضائے الٰہی کا ہے خیال
جاتی ہے راہِ حق میں اگر جان بھی، تو جائے
آنے نہ پائے دینِ متیں کو مگر زوال
آجائے کام خونِ حسین اس کا غم نہیں
گلزارِ مصطفٰے کا ہو شاداب ہر نہال

محوِ نبردِ کفر سے اس کا نواسہ ہے
ہے ختم جس کی ذات گرامی پہ ہر کمال
مرعوب ہو سکا نہ شکوہِ یزید سے
حق آشنا تھا' فاطمہ زہرا کا خوش خصال
دقتِ شکست اس کی نگاہوں میں ہیچ تھی'
پیشِ نظر شہادتِ عظمیٰ کا تھا مآل
صدقہ حسین ہی کی شہادت کا ہے دراصل
اسلام کا عروج صداقت کا یہ کمال

سلام

نبردِ حق و باطل کی بس اتنی سی کہانی ہے
سرِ شبیر پر تاجِ حیاتِ جاودانی ہے

خیالِ بیعتِ فاسق سے بہتر ہے کہ کٹ جائیں
کچھ ایسی جی میں اپنے کربلا والوں نے ٹھانی ہے

یزیدِ بدگہر کا نام بھی لیتا نہیں کوئی،
دلوں پر سبطِ پیغمبر کی اب تک حکمرانی ہے

چراغِ کعبہ آنکھ اس سے ملائے ہو نہیں سکتا
وہ دل جس میں جمالِ شاہِ دیں کی ضوفشانی ہے

حرارت پیکرِ اسلام میں ہے خونِ سرور کی
جمال افروز ہم شکلِ پیمبر کی جوانی ہے

جلا دے خرمنِ باطل کو جو اک آن میں یکسر
محبانِ علی کے دل میں آگ ایسی لگانی ہے
حیات اسلام کی مضمر ہے جس روداد میں اب تک
وہی رودادِ غم تو عمر بھر مجھ کو سنانی ہے
امامت کی نظر اس راز کی محرم ہے پہلے سے
شکستِ ظاہری آغازِ فتح و کامرانی ہے
مجھے ملنا تھا جو کچھ بھی اسی در سے ملا آخر
دیارِ علم و فن کی میں نے برسوں خاک چھانی ہے
تصور ذوالفقارِ حیدری کا بندھ گیا جب سے
مرے اشعارِ گوہر بار میں کیسی روانی ہے
غم آل نبی پر عشرت دنیا ودیں صدقے
خدا رکھے یہی تو حاصلِ دنیائے فانی ہے
مرا ہر شعر ہے آئینہ کردارِ حسینی کا
حسین ابنِ علی کی مجھ پہ کتنی مہربانی ہے
دل و جاں اور ایماں تجھ پہ خاک کربلا قرباں
محمد مصطفیٰ کی تیرے دامن میں نشانی ہے

نذرِ عقیدت

ہر عیش اہلِ کفر پہ دنیا میں عام ہے
عُشاقِ اہلِ بیت کو جینا حرام ہے
شیرازۂ حیات پریشاں ہے آج بھی
مشکل میں اب بھی اُمّت خیرُالانام ہے
ہیں بے کسوں پہ جبرِ تشدّد کی یورشیں
اب بھی حیات صورتِ مرگِ دَوام ہے
قائم ہیں اب بھی حق و صداقت پہ بندشیں
باطل بساطِ دہر پہ محوِ خرام ہے
یوں تو بڑے خلوص سے ملتے ہیں اہلِ کیں
لیکن دلوں میں جذبۂ صد انتقام ہے

کب سے اڑا رہی ہے خرد عشق کا مذاق
کب سے جنوں پہ ثبت سکوتِ دَوام ہے

اے بے نیازِ ہوش تجھے کچھ خبر بھی ہے
مدت سے تو رہینِ غمِ صبح و شام ہے

کھاتا ہوں تیری جراتِ بے باک کی قسم
جتنی یہ کائنات ہے تیری غلام ہے

اٹھ اور اٹھ کے وقت کے دھارے کو موڑ دے
پینا اگر تجھے بھی شہادت کا جام ہے

اک اور انقلاب پئے امن و عافیت
رودادِ کائنات ابھی ناتمام ہے

عزمِ حسینیت کو زمانے میں عام کر
تو عاشقِ حسین علیہ السَّلام ہے

جمہوریت

جمہوریت کا طرز جو اسلام نے دیا
اپنے عروج پر تھا وہ عہدِ رسول میں
حیرت سے دیکھتے تھے جسے اہلِ شرق و غرب
وہ آب و رنگ و بو تھی اسی ایک پھول میں
بعدِ رسول اس پہ جو گذری نہ پوچھیے
بکھرا بساطِ خاک پہ اس کا ورق ورق
حسنِ ملوکیت کے پرستار ہو گئے
جو اہلِ حق تھے بھول گئے رازِ امرِ حق
صدیوں ملوکیت کا جہاں میں رہا رواج
جمہوریت کا حسن ناز نہ چمکا زمانے میں
جمہوریت کے دب گئے خال وخدِ جمیل
اڑتی رہی وہ خاک اس آئینہ خانے میں
جمہوریت کے نام پہ کچھ اہل اقتدار
کھیلا کئے خلوص و وفائے عوام سے

ان کی نظر تھی منصب وجاہ و جلال پر
ان کو مدام کام رہا اپنے کام سے
جورِ ملوکیت ہوا جس وقت آشکار
جو اہلِ عقل وہوش تھے بیزار ہو گئے
جمہوریت کا رنگ جمانے کے واسطے
جو اس کے قدر داں تھے وہ تیار ہو گئے
جمہوریت کا جس میں ہو قائم نظامِ نو
وہ ملک بھی خدا نے بالآخر عطا کیا
جو ساحلِ مراد پہ لایا سفینے کو
ہم کو خدائے غیب نے وہ ناخدا دیا
پیارا خدا کو جلد ہوا ناخدائے قوم
زد میں سفینہ قوم کا طوفاں کی آگیا
سورج ہوا غروب امید وعروج کا'
اک ابرِ یاس ورنج والم سر پہ چھا گیا
جب دورِ اضطراب نے پیسا عوام کو
میداں میں آیا ایک مجاہد کفن بدوش
اونچے تھے مہروماہ سے بھی جس کے حوصلے
جس کے نقوشِ پائے مبارک تھے گلفروش

رباعیات

تیری ہی عطا ہے خوش بیانی میری
تیرا ہی کرم ہے نکتہ دانی میری
مداحِ حسین ابن علی ہوں مولا
دولت ہے بقائے جاودانی میری

توصیفِ رسولِ عربی کرتا ہوں
مداحیٔ "امّی لقبی" کرتا ہوں
معراجِ سخن کیا ہے یہ مجھ سے پوچھو
ذہنوں پہ جِلائے ادبی کرتا ہوں

گرداں ہے اک آفتاب میرے دل میں
جولاں ہے اک انقلاب میرے دل میں
قسمت کرۂ خاک کی اٹھے گی
ہے جلوۂ بوتراب میرے دل میں

ممنونِ عطائے کبریائی ہوں میں
دانائے رموزِ کربلائی ہوں میں
بوبکرؓ و عمرؓ عثمانؓ و علی حیدرؓ
ہیں جانِ رسول ان کا فدائی ہوں میں

مشتاق مبارک

دوستوں کی ستم ظریفی کو
ہم فقط اپنی سادگی سمجھے
دوست میرے خلوص کو اکثر
میرا احساسِ کمتری سمجھے

حسبِ حال

منصب و عہدہ بڑھا کچھ اور بھاری ہو گئے
جب سے ہم اے۔ او بنے ہیں اشتہاری ہو گئے
شغل و تفریحات سے کرنا پڑا آخر حذر
دوستو ہم مائلِ پرہیز گاری ہو گئے

۱۔ ایڈمنسٹریٹو آفیسر

پانی

پانی ہے جس کا نام ہے سرچشمۂ حیات‘
پانی کی سطحِ نرم پہ رقصاں ہے کائنات
پانی ہے ناگزیر برائے بقائے ذات‘
پانی کی کیا بیان کرے آدمی صفات
پانی عطائے خاص ہے ربِ کریم کی
برہان پائیدار ہے لطفِ عمیم کی‘
نشوونمائے برگ وثمر فیضِ آب ہے
شادابی وفروغ شجر فیضِ آب ہے
یہ آب و تابِ موج وگہر فیضِ آب ہے
رعنائی عِذارِ بشر فیضِ آب ہے
آبِ رواں ہے آئینۂ کیفِ زندگی
آبِ رواں کو دیکھ سرِ آب جو کبھی
اے بے خبر نہایتِ بحرِ رَواں کو دیکھ
رنگینیٔ بہار ہے کیا گلستاں کو دیکھ‘
سُنبل پہ کر نظر کبھی سروِجواں کو دیکھ
ہر کشتِ سبزوسبزہ ہے تسبیح خواں کو دیکھ

ہر منظرِ حسیں ہے جوانی لئے ہوئے'
جو اصل زندگی ہے وہ پانی لئے ہوئے

پانی ہے جانِ کوثر و تسنیم و سلسبیل
پانی ہے ایک نعمتِ بے مثل و بے عدیل
پانی حیاتِ عالمِ امکاں کا ہے کفیل
اس کی کوئی نظیر نہ اس کا کوئی مثیل'
یکتائے روزگار ہے پانی کہیں جسے
دریائے زندگی کی روانی کہیں جسے

کیوں مثلِ گل شگفتہ ہے ہر پیکرِ کلی
اس پر بھی تو نے غور کیا آج تک کبھی
عنصر دراصل کونسا ہے اصل زندگی
منجملہ' عناصرِ ہستی ہے آب ہی'
انساں کی زندگی کا اسی پر مدار ہے
دنیائے رنگ و بو کی اسی سے بہار ہے

پانی ہوا کے ساتھ ہی موجِ نفس میں ہے
پانی رواں دواں رگِ ہر خار و خس میں ہے'
سینے میں ہے پھلوں کے تو پھولوں کے رس میں ہے
انسان ہی نہیں شکمِ ہر مگس میں ہے'
پانی غذائیت کا ہے جوہر لئے ہوئے

جس پر بجا ہے ناز وہ گوہر لئے ہوئے
پانی ہے اپنی تہہ میں خزینے لئے ہوئے
بے مثل و بے نظیر دفینے لئے ہوئے
جو بے بہا ہیں ایسے نگینے لئے ہوئے
سینے پہ تندوتیز سفینے لئے ہوئے
ایوانِ فکروہوش کے دَر کھولتا ہوا
ساحل سو بڑھ رہا ہے گہر رولتا ہوا

اللہ رے یہ فطرتِ بشری کا انقلاب
انساں کبھی ہے برسرِ پیکار بحرِ آب
سینے میں ہے چھپائے ہوئے شعلۂ عتاب
طوفانِ انتقام وتباہی ہے ہم رکاب
انسانیت کا پا کے شرف پست ہو گیا
پندارِ قیصری ہے یہ بدمست ہو گیا

میدانِ جنگ میں صف آرا برائے آب
اس پستیٔ خیال کا بھی ہے کہیں جواب
حیرت سے دیکھتے ہیں اسے ماہ وآفتاب
اللہ رے ضلالتِ انساں کا یہ شباب
پانی کیا ہے بند شہِ مشرقین پر
یہ ظلم بے پناہ جنابِ حسین پر

ہیں زیرِ سطحِ آب تمدن بھی کچھ نہاں
پائے ہیں جن کے دیدۂ تحقیق نے نشاں
جن سے نقوشِ عہدِ قدیم اب بھی ہیں عیاں
سرمایۂ حیات ہے یہ گنج شایگاں
تاریخ کا اسی سے اک ابھرا ہے باب بھی
روشن ہے اوجِ فکر پہ یہ آفتاب بھی
دیکھ ان کو خورد بینِ حقیقت سے بار بار،
ان میں کھلے ہوئے ہیں ثقافت کے لالہ زار
انداز زندگی کا ہے اب وجدِ آشکار،
سانس ان میں لے رہی ہے وہ تقویمِ روزگار
انسان عصرِ نو کا ہے جس کی تلاش میں
کیا کیا نگار و نقش تھے اس بود و باش میں
احسان مند کیوں نہ ہوں پانی کے نکتہ بین،
پانی بھی کائنات میں ہے عہد آفرین
اس کی بھی ارتقا سے درخشندہ ہے جبین
اس کی بھی موج موج ہے تابندہ و حسین
واقف ہیں اہلِ فکر ہی اَسرارِ آب سے
روشن مشامِ جاں ہے انہی کے گلاب سے
سرچشمۂ فیوض ہے آئینۂ کرم،

اوصاف اس کے سب کو ہیں معلوم بیش و کم
شدت میں تشنگی کی ہے قطرہ بھی مغتنم
کیسے کہیں نہ اس کو متاعِ عزیز ہم
جس کا نظر طواف کرے وہ متاع ہے
لیکن کبھی کبھی یہ بنائے نزاع ہے'
نوعِ بشر پہ لاتا ہے کیا کیا تباہیاں
ویران اس نے کر دیا شہروں کو الاماں
آبادیوں کے مٹ گئے کچھ اس طرح نشاں
گویا وجودِ نوعِ بشر ہی نہ تھا یہاں
دل پر کھلا یہ راز کھنڈر دیکھنے کے بعد
آنکھیں کھلی ہیں ایک نظر دیکھنے کے بعد
ایٹم کے تجربات کا میداں یہی تو ہے'
شعلوں سے کھیلتا ہے جو داماں یہی تو ہے
ابرو بخارو برق بداماں یہی تو ہے
پروردۂ تلاطم و طوفاں یہی تو ہے
سائنس کے فروغ کا اک زندہ باب ہے
رقصندہ و جہندہ و تابندہ باب ہے
انساں ہوئے ہیں گرمِ وغا اس کی سطح پر
کیا کیا نہیں ہوا ہے بھلا اس کی سطح پر

تہذیب کا نشان جلا اس کی سطح پر
انساں ابھر ابھر کے مٹا اس کی سطح پر
بحری لڑائیوں کا فسانہ دراز ہے
پانی کی سطحِ نرم بھی فتنہ طراز ہے
اس آبِ تیز رَو نے وہ طوفاں اٹھائے ہیں
جس پر اس آسماں نے بھی آنسو بہائے ہیں
گل بزمِ آب و گل میں کچھ ایسے کھلائے ہیں
رخ انقلابِ دہر نے کیا کیا دکھائے ہیں
جن کا بیاں بھی باعثِ کربِ عظیم ہے
جن کے خیال سے دلِ انساں دونیم ہے
تقسیمِ آب پر ہوا باہم جب اختلاف
کرنے لگے ضمیرِ شرافت سے انحراف
مانندِ آئینہ رہے انساں کے دل نہ صاف
میدانِ جنگ میں یہ ہوئے مائلِ مصاف
انساں کو ظلم کیش ستم راں بنا دیا
اک آن میں چراغِ محبت بجھا دیا
اکثر ہوا ہے ایسا بھی ہنگامِ برشگال
وہم و گماں ہو جس کا نہ دل میں کوئی خیال
برسا کچھ اس طرح کہ سراسر تھا اک وبال

فصلیں ہری بھری ہوئیں اس طرح پائمال
انساں کو قحطِ جنس نے محتاج کر دیا
خوشحالیوں نے باغ کو تاراج کر دیا
اکثر حکومتوں میں بھی تقسیمِ آب سے
کیا کیا نہ اہلِ فکر کو پیش آئے مرحلے
ٹوٹے کبھی، کبھی ہوئے پھر سے معاہدے
دریا نکات و بحث کے ہر سو بہا گئے
آیا ہے بل جبینِ تدبّر پہ بار بار
پیدا ہوئے مسائلِ پیچیدہ بے شمار
کیا کیا نہ بھاپ ہی نے مشینیں چلائی ہیں
انسان کو معاش کی راہیں دکھائی ہیں
امید کی دماغ میں شمعیں جلائی ہیں
تاریکیاں دماغِ بشر سے مٹائی ہیں
پانی میں جو چمک ہے وہ سحرِ حلال ہے
کیا خوب امتزاجِ جمال وجلال ہے
زائیدہ برق و قوتِ برقی اسی کی ہے
لے کام مقدرت یہ مگر آدمی کی ہے
حاجت قدم قدم پہ اسے آگہی کی ہے
منکر ہو فیضِ آب سے جرأت کسی کی ہے

سرچشمۂ فیوض و فراواں یہی تو ہے
انساں نواز چشمۂ حیواں یہی تو ہے

پانی کو بس میں کر کے ہمیں روشنی ملی
تاریک تھے جو گھر انہیں تابندگی ملی
ظلمت نے مات کھائی درخشندگی ملی
انسانِ عصرِ نو کو نئی زندگی ملی

پایا صلہ تلاش کا دل کا کنول کھلا
کوشش کا حسبِ سعی وطلب ہم کو پھل ملا

ہنگامہ ہو گیا کبھی برپا سوئیز پر!
مائل کچھ اہلِ شر ہوئے آخر ستیز پر
نازاں تھا کوئی بم پہ کوئی تیغِ تیز پر
منصوبہ بندیاں ہوئیں کیا کیا یہ میز پر
اربابِ حل و عقد کے ایسے قلم چلے
جیسے بصد خروش و شغب موجِ یم چلے

پہنچا ہے اس سے گاہ معاشی خسارہ بھی
دامانِ کشتِ زار ہوا پارہ پارہ بھی
مہلک ہوا کبھی، کبھی اس کا اجارہ بھی
دیکھا ہے دل شکن کبھی اس کا نظارہ بھی
گذریں تمدنِ بشری پر قیامتیں

کیا کیا ہوئی ہیں نوعِ بشر کو ندامتیں

اشکالِ خاص برق بخارات اسی کے ہیں
پَن چکیوں کی چال میں نغمات اسی کے ہیں
پابوس زیرِ سطح بھی ذرات اسی کے ہیں
دنیا میں بے شمار کمالات اسی کے ہیں
بالائے ارض و تحتِ زمیں فیض اسی کا ہے
یہ آبِ رخ یہ تابِ جبیں فیض اسی کا ہے

آہن کو بھاپ نے متحرک بنا دیا
دنیا میں دامِ رسل و رسائل بچھا دیا
انسانِ شرق وغرب کو باہم ملا دیا
جس کا گماں نہ تھا وہ کرشمہ دکھا دیا
سکہ دلوں پہ اس نے بٹھایا ہے بار بار
انساں کے حوصلوں کو بڑھایا ہے بار بار

وہ تیرے آتشیں عارض پہ سرمگیں آنچل
رخِ شفق پہ ہو جیسے خفیف سا بادل

چمن میں کس گلِ رعنا کی آمد آمد ہے
کہ رعبِ حسن سے تھرا رہی ہے ہر کونپل
ہزار سعیٔ مسلسل کے باوجود اے دوست
نہ محو دل سے ہوئے تم نہ آنکھ سے اوجھل

نگاہِ ناز کی شوخی حجاب کا عالم
جھکی جھکی سی نظر دل کے پار ہو کے رہی

کلی کلی ہے امینِ بہار حسنِ چمن
مچل رہا ہے گلوں پر بہار کا دامن

خود ملتفت نگاہ سے دیکھا کئے مجھے
میری نظر ملی تو انہیں آگیا حجاب

نہ جانے کونسی منزل تھی، کیا تھا اور کہاں ہم تھے
فقط جلوے ہی جلوے تھے نگاہوں میں جہاں ہم تھے

اس عالم کیف و مستی میں یہ پند و نصیحت کیا معنی
بیکار ہے اب پرہیز کہ ساقی رات گزرنے والی ہے

مری محبت بھی حادثہ ہے تری جوانی بھی حادثہ ہے
انہیں حوادث میں زندگی کے حسین لمحات بہہ رہے ہیں

اب محفلِ نشاط ہے بیگانۂ سرور
وہ اہتمامِ فصلِ بہاراں نہیں رہا

لذتِ غم کی قدر کیا جانیں
جو نہیں ہیں امینِ سوز و گداز

یہ جنوں کا ہے تقاضہ کوئی وضعِ نو تراشو
کہ ہے رسمِ چاک داماں وہی بات اک پرانی

خِرد تراش رہی ہے نئے نئے اصنام
مگر جُنوں کی نظر میں یہ آذری کیا ہے

انسان ہے کہ پھر بھی تغیّر پسند ہے
گو لاکھ انقلاب کے طوفاں گزر گئے

یاد ہیں وہ چاندنی راتیں کہ میرے دوش پر
عنبریں زلفوں کے سائے منتشر ہوتے رہے

ابھی کمی ہے کوئی اور کیا جفاؤں میں
یہ کیوں نگاہِ کرم بار بار ہوتی ہے
حقیقتِ خلشِ غم کسی کو کیا معلوم
عجیب نعمتِ پروردگار ہوتی ہے

فضائے رنگِ عالم دیکھ کر محسوس ہوتا ہے
کوئی پھر انقلاب آنے کو ہے شاید زمانے میں

اتفاقاً" ملتفت ہے وہ نگاہِ فتنہ ساز
احتیاطاً" گردشِ ایام کی باتیں کرو

خاطر میں لائے وہ کیا زمانے کے انقلاب
دیکھے ہیں جس نے تیری نظر کے تغیّرات

آخر سمٹ کے ایک ہی مرکز پہ آگئے
ان کا غرورِ حسن مری عاجزی کی بات

الٰہی کونسی منزل میں ہے احساسِ نظّارہ
نگاہیں ڈھونڈتی پھرتی ہیں کس کو بزمِ امکاں میں

یہی ہیں محرم اسرار ہستی
نظر جو آرہے ہیں بے خبر سے

سنادے اے غمِ دل چاہتا ہوں
یہی دو چار جملے مختصر سے

ظلمت حجاب دیدۂ بیدار بھی نہیں
لیکن طلوعِ صبح کے آثار بھی نہیں

رہتا نہیں جنون و خرد میں کچھ امتیاز
آتا ہے راہِ عشق میں ایسا مقام بھی
الجھو نہ شرحِ گردشِ لیل و نہار میں
یہ سلسلہ تمام بھی ہے نا تمام بھی

آداب بزم ناز کا احساس ہے مگر
ایسا بھی کیا کہ لے نہ سکوں تیرا نام بھی

غزل

وہ تیرے آتشیں عارض پہ رنگیں آنچل
رخِ شفق پہ ہو جیسے خفیف سا بادل

ہوا کی چھیڑ سے یوں پھیلتا گیا جیسے
کسی کی نرگسِ مخمور آنکھ میں کاجل

عجیب منظرِ فطرت تھا دیکھ کر جس کو
غریب دل کی امنگوں میں پڑ گئی ہلچل

ہجومِ یاس سے کچھ تو فسردہ خاطر تھے
دکھا کے جلوہ ہمیں اور کر گئے بیکل

دل و نگاہ کی افسردگی ارے توبہ
سرک رہا ہے گلوں سے بہار کا آنچل

چمن میں کس گلِ رعنا کی آمد آمد ہے
کلی کلی کا ہے اندازِ چلبلا چنچل

مشتاق مبارک
13-11-60.

گزار دیں شبِ فرقت کی ساعتیں ہم نے -
جلا جلا کے ترے انتظار کی مشعل -

ترے جنوں کے رفیقانِ بزم آج بھی اے دوست
ہیں راہِ اہلِ خرد عقدہ ہائے لاینحل

نزارِ سوختیٔ مسلسل کے باوجود اے دوست -
نہ محو دل سے ہوئے غم نہ آنکھ سے اوجھل -

مشتاق مبارک

مورخہ ۱۳ نومبر ۱۹۶۰ء

گوشۂ حبیب جالبؔ

حمد

اپنے بندوں کی کر مدد یا رب
ظلم کی ہو گئی ہے حد یا رب

توڑ دے سامراج کا یہ غرور
کر اس آئی بلا کو رُد یا رب

غیر تیری ہنسی اُڑاتے ہیں
تجھ پہ بھی پڑ رہی ہے زد یا رب

کیوں ہیں آزادیوں کی سمت رواں
غرب کو ہم سے ہے یہ کَد یا رب

نیک لوگوں پہ حکمراں بن کر
آئے ہیں کیسے کیسے بَد یا رب

آج بھی اقتدار میں ہیں وہی
کوئی جن کا نہیں ہے قد یا رب

کیوں مسلّط ہیں آسماں کے تلے
ہم پہ صدیوں سے چند صد یا رب

نعت سرکار مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم

پتھر دلوں کو پیار کا کلمہ پڑھا دیا
انسان کو حضور نے انساں بنا دیا

پیش نظر حیات میں باطل کی راہ تھی
حق بین وحق شناس نہ اپنی نگاہ تھی
سچ تو یہ ہے کہ آپ نے جینا سکھا دیا

ویران کس قدر تھیں محبت کی بستیاں
اپنے عروج پر تھیں تکبر کی بستیاں
سر آپ نے غرور کا آکر جھکا دیا

موج وغم و الم کا کنارا نہ تھا کوئی
ٹوٹے ہوئے دلوں کا سہارا نہ تھا کوئی
سب کا نصیب آپ نے آکر جگا دیا

غیر مطبوعہ

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش

جہالت کا اندھیرا دور کرنے کے لئے آئے
محبت کا نظر میں نور بھرنے کے لئے آئے
محمدؐ عرش سے دل میں اترنے کے لئے آئے
وہ آئے اور اجالا ہو گیا بزم دو عالم میں
مروت آگئی ہم میں صداقت آگئی ہم میں

مدینہ جھوم اٹھا' مالک ہر دو جہاں آئے
عرب کے بھاگ جاگے حاصل کون ومکاں آئے
لئے مہرو محبت کا' وہ مہر ضوفشاں آئے
ہوئی کافور ظلمت کفروباطل کی زمانے سے
ہمیں قندیل قرآں مل گئی صرف ان کے آنے سے

شکستہ کشتی دل کا سہارا بن کے آپہنچے
الم کی تند موجوں میں کنارا بن کے آپہنچے
غریبوں کے مقدر کا ستارا بن کے آپہنچے
محبت سے دیا درس محبت کم نگاہوں کو
دکھایا جادہ انسانیت گم کردہ راہوں کو

چراغ آدمیت یوں فروزاں تھا کہاں پہلے
دلوں میں اس طرح سے درد پنہاں تھا کہاں پہلے
حضورؐ ایسا کوئی غم خوار انساں تھا کہاں پہلے
حضورؐ آئے تو انساں میں غم انسانیت جاگا
سویرے کی کرن پھوٹی، اندھیرا کفر کا بھاگا

ہماری زندگی پر کس قدر احسان ہے ان کا
ہمارے سامنے خود وہ ہیں اور قرآن ہے ان کا
چراغ راہ ہر منزل میں ہر فرمان ہے ان کا
مگر ہم ان کی تعلیمات سے غافل ہوئے ایسے
خدا کو بھول جائے عیش و عشرت میں کوئی جیسے

وہی خون غریباں سے دیئے جلتے ہیں محلوں میں
وہی فرعون نازو نعم سے پلتے ہیں محلوں میں
وہی خنجر گلوئے صدق پر چلتے ہیں محلوں میں
زبانیں کھینچ لی جاتی ہیں سچی بات کہنے پر
وہی تعزیر کہنہ رات کو ہے رات کہنے پر

حضورؐ اب آپ کے لطف و کرم کا وقت آپہنچا
علاج گردش شام و سحر کا وقت آپہنچا
غریبوں کی دعاؤں کے اثر کا وقت آپہنچا
حضور انسان کو نور ہدایت کی ضرورت ہے
حضور اک بار پھر شمع رسالت کی ضرورت ہے

غیر مطبوعہ

وہ غم خوار امت وہ پیارے محمد
وہ ٹوٹے دلوں کے سہارے محمد
بچالیں گے خورشید محشر سے ہم کو
شفاعت کریں گے ہمارے محمد
بدل جائے رخ گردش آسماں کا
اگر کوئی دل سے پکارے محمد
ازل سے یہی ہے تمنائے جالب
کہ امت کی بگڑی سنوارے محمدؐ

غیر مطبوعہ

نعت

دنیا نہیں دیتی تو نہ دے ساتھ ہمارا
ہم کو ہے بہت شاہ عرب تیرا سہارا

ہر چیز بدل جائے ترا پا کے اشارہ
کیا گردش افلاک ہے' کیا وقت کا دھارا

ہر سمت تھا پھیلا ہوا' طوفان تباہی
انسان کی کشتی کو ملا' تجھ سے کنارہ

پھر آپ کی جانب ہیں زمانے کی نگاہیں
پھر ایک نظر حاصل کونین خدارا

جالب کو یقیں ہے کہ تری چشم کرم سے
چمکے گا غریبوں کے مقدر کا ستارا

غیر مطبوعہ

بین الاقوامی رحمۃ للعالمین کانفرنس لاہور ۱۹۹۱ء کے موقع پر

بارگاہِ رسالت مآب میں

نذرانۂ عقیدت

نظر نظر تھی محبت ادا ادا تھی شفیق ‏ ‏ کہاں تھی تیرے یہاں اونچ نیچ کی تفریق

چراغِ جادۂ ہستی ترا پیام بنا ‏ ‏ ترے درود سے نوعِ بشر کا کام بنا

ہوا نہ ہو گا کوئی تجھ سا خلق یار و خلیق

کہاں تھی تیرے یہاں اونچ نیچ کی تفریق

تری نظر میں ہے جو ہو رہا ہے آج یہاں ‏ ‏ نثارِ فخر ہے ظلمت کے سر پہ تاج یہاں

ستم گروں سے بچا ہم کو بے سوائے رفیق

کہاں تھی تیرے یہاں اونچ نیچ کی تفریق

شہ و شیوخ ہیں صیہونیت کے دست نگر ‏ ‏ مفادِ ذات ہے ان بے حسوں کے پیشِ نظر

انہیں عزیز نہ منشا ترا نہ تیرا طریق

کہاں تھی تیرے یہاں اونچ نیچ کی تفریق

ہیں گردِ راہ ستارے ملا سبق تجھ سے ‏ ‏ ہوا جہاں پہ روشن ثبوتِ حق تجھ سے

خدا نے کی تری سچائیوں کی خود تصدیق

کہاں تھی تیرے یہاں اونچ نیچ کی تفریق

اٹھائیں فیض صدا تیری رہنمائی سے ‏ ‏ ملے نجات ہمیں کاسۂ گدائی سے

کریں بلند ترا نام ہم کو دے توفیق

کہاں تھی تیرے یہاں اونچ نیچ کی تفریق

دل کی بات لبوں پر لا کر اب تک ہم دکھ سہتے ہیں
ہم نے سنا تھا اس بستی میں دل والے بھی رہتے ہیں

بیت گیا ساون کا مہینہ موسم نے نظریں بدلیں
لیکن ان پیاسی آنکھوں سے اب تک آنسو بہتے ہیں

ایک ہمیں آوارہ کہنا کوئی بڑا الزام نہیں
دنیا والے دل والوں کو اور بہت کچھ کہتے ہیں

جن کی خاطر شہر بھی چھوڑا جن کے لیے بدنام ہوئے
آج وہی ہم سے بیگانے بیگانے سے رہتے ہیں

وہ جو ابھی اس راہ گزر سے چاک گریباں گزرا تھا
اس آوارہ دیوانے کو جالبؔ جالبؔ کہتے ہیں

محبت کی رنگینیاں چھوڑ آئے
ترے شہر میں اک جہاں چھوڑ آئے

پہاڑوں کی وہ مست و شاداب وادی
جہاں ہم دلِ نغمہ خواں چھوڑ آئے

وہ سبزہ، وہ دریا، وہ پیڑوں کے سائے
وہ گیتوں بھری بستیاں چھوڑ آئے

حسیں پنگھٹوں کا وہ چاندی سا پانی
وہ برکھا کی رُت وہ سماں چھوڑ آئے

بہت دُور ہم آ گئے اُس گلی سے
بہت دور وہ آستاں چھوڑ آئے

بہت مہرباں تھیں وہ گلپوش راہیں
مگر ہم انھیں مہرباں چھوڑ آئے

بگولوں کی صورت یہاں پھر رہے ہیں
نشیمن سرِ گلستاں چھوڑ آئے

یہ اعجاز ہے حسنِ آوارگی کا
جہاں بھی گئے داستاں چھوڑ آئے

چلے آئے اُن رہگزاروں سے جالب
مگر ہم وہاں قلب و جاں چھوڑ آئے

مشاعرہ

ابھی جو پاس سے گزری ہے خاک اڑاتی ہوئی
یہی وہ کار تھی جس میں وہ لوگ آتے تھے
حضور آپ ہی جالب ہیں آپ کی خاطر
تمام شہر میں دیوانہ وار گھومے ہیں
کسی طرح سے کہیں آپ کا سراغ ملے
حضور ہم نے بگولوں کے پاؤں چومے ہیں
ابھی جو پاس سے گزری ہے خاک اڑاتی ہوئی
مشاعرے میں اسی کار سے گیا تھا میں

ہم دیکھتے ہیں

۲ جون ۱۹۸۶ء کو لاہور میں نابیناؤں کی امدادی انجمن کے مشاعرے میں پڑھی گئی

وہی عالم ہے جو تم دیکھتے ہو
نہیں کچھ مختلف عالم ہمارا
جلائے ہم نے پلکوں پر دیئے بھی
نہ چمکا پھر بھی قسمت کا ستارا
وہی ہے وقت کا بے نور دھارا

وہی سر پر مسلّط ہے شبِ غم
اندھیرے ہر طرف چھائے ہوئے ہیں
نہیں ملتی خوشی کی اک کرن بھی
مہ و خورشید گہنائے ہوئے ہیں
یہ کس بستی میں ہم آئے ہوئے ہیں

شکایت ہے تمھیں آنکھوں سے اپنی
یہاں آنکھیں کہاں روشن رفیقو
کلی کی آنکھ نم، روتی ہے شبنم
سلگتے ہیں گلوں کے تن رفیقو
نظر آتے ہیں گلشن بن رفیقو

جنھیں ہم شعر میں کہتے ہیں جادو
اُن آنکھوں کو یہاں نم دیکھتے ہیں
لبوں پر آہ اور زلفیں پریشاں
غزل کو وقفِ ماتم دیکھتے ہیں
ستم کیا کم ہے یہ ہم دیکھتے ہیں

ہتھکڑی

اُس کو شاید کھلونا لگی ہتھکڑی
میری بچی مجھے دیکھ کر ہنس پڑی

یہ ہنسی تھی سحر کی بشارت مجھے
یہ ہنسی دے گئی کتنی طاقت مجھے

کس قدر زندگی کو سہارا ملا
ایک تابندہ کل کا اشارا ملا

دستور

دیپ جس کا محلّات ہی میں جلے
چند لوگوں کی خوشیوں کو لیکر چلے
وہ جو سائے میں ہر مصلحت کے پلے

ایسے دستور کو صبحِ بے نور کو
میں نہیں مانتا · میں نہیں مانتا

میں بھی خائف نہیں تختۂ دار سے
میں بھی منصور ہوں کہہ دو اغیار سے
کیوں ڈراتے ہو زنداں کی دیوار سے

ظلم کی بات کو، جہل کی رات کو
میں نہیں مانتا · میں نہیں مانتا

پھول شاخوں پہ کھلنے لگے، تم کہو
جام رندوں کو ملنے لگے، تم کہو
چاک سینوں کے سِلنے لگے، تم کہو

اِس کھلے جھوٹ کو ذہن کی لوٹ کو
میں نہیں مانتا، میں نہیں مانتا

تم نے لُوٹا ہے صدیوں ہمارا سکوں
اب نہ ہم پر چلے گا تمھارا فسوں
چارہ گر میں تمھیں کس طرح سے کہوں

تم نہیں چارہ گر، کوئی مانے، مگر
میں نہیں مانتا، میں نہیں مانتا

جمہوریت

دس کروڑ انسانو!
زندگی سے بیگانو!

صرف چند لوگوں نے
حق تمہارا چھینا ہے

خاک ایسے جینے پر
یہ بھی کوئی جینا ہے

بے شعور بھی تم کو
بے شعور کہتے ہیں

سوچتا ہوں یہ ناداں
کس ہوا میں رہتے ہیں

اور یہ قصیدہ گو
فکر ہے یہی جن کو

ہاتھ میں علم لے کر
تم نہ اٹھ سکو لوگو

کب تلک یہ خاموشی
چلتے پھرتے زندانو

دس کروڑ انسانو!

یہ ملیں یہ جاگیریں — کس کا خون پیتی ہیں
بیرکوں میں یہ فوجیں — کس کے بل پہ جیتی ہیں
کس کی محنتوں کا پھل — داشتائیں کھاتی ہیں
جھونپڑوں سے رونے کی — کیوں صدائیں آتی ہیں
جب شباب پر آ کر — کھیت لہلہاتا ہے
کس کے نین روتے ہیں — کون مُسکراتا ہے
کاش تم کبھی سمجھو — کاش تم کبھی جانو

دس کروڑ انسانو!

علم و فن کے رستے میں — لاٹھیوں کی یہ باڑیں
کالجوں کے لڑکوں پر — گولیوں کی بوچھاڑیں
یہ کرائے کے غنڈے — یادگارِ شب دیکھو
کس قدر بھیانک ہے — ظلم کا یہ ڈھب دیکھو
رقصِ آتش و آہن — دیکھتے ہی جاؤ گے
دیکھتے ہی جاؤ گے — ہوش میں نہ آؤ گے

اے خموش طوفانو!
دس کروڑ انسانو!

سینکڑوں حسن ناصر ہیں شکار نفرت کے
صبح و شام لٹتے ہیں قافلے محبت کے
جب سے کالے باغوں نے آدمی کو گھیرا ہے
مشعلیں کرو روشن دور تک اندھیرا ہے
میرے دیس کی دھرتی پیار کو ترستی ہے
پتھروں کی بارش ہی اس پہ کیوں برستی ہے
ملک کو بچاؤ بھی ملک کے نگہبانو

دس کروڑ انسانو!

بولنے پہ پابندی سوچنے پہ تعزیریں
پاؤں میں غلامی کی آج بھی ہیں زنجیریں
آج حرفِ آخر ہے بات چند لوگوں کی
دن ہے چند لوگوں کا رات چند لوگوں کی
اٹھ کے دردمندوں کے صبح و شام بدلو بھی
جس میں تم نہیں شامل وہ نظام بدلو بھی
دوستوں کو پہچانو دشمنوں کو پہچانو

دس کروڑ انسانو!

کراچی میں جب صباحت جاہ نے جھونپڑے جلائے

نشیمنوں کو جلا کر کیا چراغاں خوب
سنوارتے ہیں یونہی چہرۂ گلستاں خوب

کھلا کے شاخِ دل و جاں پہ پھول زخموں کے
مسرتوں کو کیا آپ نے نمایاں خوب

لہو اچھال کے اہلِ وفا کی راہوں میں
قدم قدم پہ کیا پاسِ دلفگاراں خوب

مچی ہے چاروں طرف آپ کے کرم کی دھوم
نبھائے آپ نے الفت کے عہد و پیماں خوب

ہر ایک بجھتا ہوا دیپ کہہ رہا ہے یہی
تمام رات رہا جشنِ نو بہاراں خوب

تم سے پہلے وہ جو اک شخص یہاں تخت نشیں تھا
اُس کو بھی اپنے خدا ہونے پہ اتنا ہی یقیں تھا

کوئی ٹھہرا ہو جو لوگوں کے مقابل تو بتاؤ
وہ کہاں ہیں کہ جنھیں ناز بہت اپنے تئیں تھا

آج سوئے ہیں تہِ خاک نہ جانے یہاں کتنے
کوئی شعلہ، کوئی شبنم، کوئی مہتاب جبیں تھا

اب وہ پھرتے ہیں اسی شہر میں تنہا لیے دل کو
اک زمانے میں مزاج ان کا عرشِ بریں تھا

چھوڑنا گھر کا ہمیں یاد ہے جالبؔ نہیں بھولے
تھا وطن ذہن میں اپنے کوئی زنداں تو نہیں تھا

نیلو

تو کہ ناواقفِ آدابِ شہنشاہی تھی
رقص زنجیر پہن کر بھی کیا جاتا ہے
تجھ کو انکار کی جرأت جو ہوئی تو کیونکر
سایۂ شاہ میں اس طرح جیا جاتا ہے؟

اہل ثروت کی یہ تجویز ہے سرکش لڑکی
تجھ کو دربار میں کوڑوں سے نچایا جائے
ناچتے ناچتے ہو جائے جو پائل خاموش
پھر نہ تا زیست تجھے ہوش میں لایا جائے

لوگ اس منظرِ جانکاہ کو جب دیکھیں گے
اور بڑھ جائے گا کچھ سطوتِ شاہی کا جلال

تیرے انجام سے ہر شخص کو عبرت ہوگی
سر اُٹھانے کا رعایا کو نہ آئے گا خیال

طبعِ شاہانہ پہ جو لوگ گراں ہوتے ہیں
ہاں اُنھیں زہر بھرا جام دیا جاتا ہے
تو کہ ناواقفِ آدابِ شہنشاہی تھی
رقص زنجیر پہن کر بھی کیا جاتا ہے

ظلمت کو ضیا صرصر کو صبا بندے کو خدا کیا لکھنا
پتھر کو گہر، دیوار کو در، کرگس کو ہما کیا لکھنا
اک حشر بپا ہے گھر گھر میں دم گھٹتا ہے گنبدِ بے در میں
اک شخص کے ہاتھوں مدت سے رسوا ہے وطن دنیا بھر میں
اے دیدہ ورو اس ذلت کو قسمت کا لکھا کیا لکھنا
ظلمت کو ضیا، صرصر کو صبا بندے کو خدا کیا لکھنا

یہ اہلِ حشم یہ دارا و جم سب نقش بر آب ہیں اے ہمدم
مٹ جائیں گے سب پروردۂ شب اے اہلِ وفا رہ جائینگے ہم
ہو جاں کا زیاں پر قاتل کو معصوم ادا کیا لکھنا
ظلمت کو ضیا، صرصر کو صبا بندے کو خدا کیا لکھنا

لوگوں پہ ہی ہم نے جاں واری کی ہم نے انہی کی غمخواری
ہوتے ہیں تو ہوں یہ ہاتھ قلم شاعر نہ بنیں گے درباری
ابلیس نما انسانوں کی اے دوست ثنا کیا لکھنا
ظلمت کو ضیا صر صر کو صبا بندے کو خدا کیا لکھنا

حق بات پہ کوڑے اور زنداں، باطل کے شکنجے میں ہے یہ جاں
انساں ہیں کہ سہمے بیٹھے ہیں خونخوار درندے ہیں رقصاں
اس ظلم و ستم کو لطف و کرم اس دکھ کو دوا کیا لکھنا
ظلمت کو ضیا، صر صر کو صبا بندے کو خدا کیا لکھنا

ہر شام یہاں شام ویراں آسیب زدہ رستے گلیاں
جس شہر کی دھن میں نکلے تھے وہ شہر دلِ برباد کہاں
صحرا کو چمن بن کو گلشن، بادل کو ردا کیا لکھنا
ظلمت کو ضیا صر صر کو صبا بندے کو خدا کیا لکھنا

اے میرے وطن کے فنکارو ظلمت پہ نہ اپنا فن وارو
یہ محل سراؤں کے باسی قاتل ہیں سبھی اپنے یارو
ورثے میں ہمیں یہ غم ہے ملا اس غم کو نیا کیا لکھنا
ظلمت کو ضیا، صرصر کو صبا بندے کو خدا کیا لکھنا

داستانِ دلِ دو نیم

اک حسیں گاؤں تھا کنارِ آب
کتنا شاداب تھا دیارِ آب

کیا عجب بے نیاز بستی تھی
مفلسی میں بھی ایک مستی تھی

کتنے دلدار تھے ہمارے دوست
وہ بچارے وہ بے سہارے دوست

اپنا اک دائرہ تھا، دھرتی تھی
زندگی چین سے گذرتی تھی

قصّہ جب یوسف و زلیخا کا
میٹھے میٹھے سُروں میں چھڑتا تھا

قصر شاہوں کے ہلنے لگتے تھے
چاک سینوں کے سِلنے لگتے تھے

گیت سنتے تھے گیت گاتے تھے
ڈوب کر سُر میں دن بتاتے تھے

یوں بھڑک اٹھی نفرتوں کی آگ
زندگی میں رہے وہ رنگ نہ راگ

دیکھنے کیا لگے سہانے خواب
ہو گئے اپنے آشیانے خواب

یہ بجا زیست پا پیادہ تھی
دھوپ سے چھاؤں تو زیادہ تھی

شاخ سے ٹوٹ کر ہوا کے ہوئے
دربدر اُس گلی سے آ کے ہوئے

اجنبی لوگ اجنبی راہیں
لب پہ آباد ہو گئیں آہیں

ہوئے آقا فرنگیوں کے غلام
شبِ آلام ہو سکی نہ تمام

ہو گئے حکمراں کمینے لوگ
خاک میں مل گئے نگینے لوگ

ہر محبِ وطن ذلیل ہوا
رات کا فاصلہ طویل ہوا

بے حیائی کو جس نے اپنایا
وہی عزت مآب کہلایا

آمروں کے جو گیت گاتے رہے
وہی انعام و داد پاتے رہے

رہزنوں نے جو رہزنی کی تھی
رہبروں نے بھی کیا کمی کی تھی

ایک بار اور ہم ہوئے تقسیم
ایک بار اور دل ہوا دو نیم

ہو گئے دور راہبر کیا کیا
چھن گئے ہائے ہم سفر کیا کیا

یہ فسانہ ہے پاسبانوں کا
چاق و چوبند نوجوانوں کا

سرحدوں کی نہ پاسبانی کی
ہم سے ہی داد لی جوانی کی

اس زمانے کی کیا لکھوں روداد
خوف، مہنگائی، جبر و استبداد

اب کمشنر زکوٰۃ دیتے ہیں
اور ٹی۔ وی پہ داد لیتے ہیں

بھیک سے ملک بھی چلے ہیں کبھی
زندہ قوموں کا یہ شعار نہیں

اک نظر اپنی زندگی پر ڈال
اک نظر اپنے اردلی پر ڈال

فاصلہ خود ہی کر ذرا محسوس
یوں نہ اسلام کا نکال جلوس

یہ زمیں تو حَسین ہے بے حد
حکمرانوں کی نیتیں ہیں بد

حکمراں جب تلک ہیں یہ بے درد
اس زمیں کا رہے گا چہرہ زرد

یہ زمیں جب تلک نہ لیں گے ہم
اس سے اُگتے رہیں گے یونہی غم

بے گھری کو کریں گے ہم ہی دور
ہم ہی دیں گے دلوں کو پیار کا نور

خلق صدیوں کے ظلم کی ماری
یوں نہ حیراں پھرے گی بے چاری

روٹی کپڑا مکان ہم دیں گے
اہلِ محنت کو شان ہم دیں گے

اس خزاں کو مٹائیں گے ہم ہی
فصلِ گل لے کے آئیں گے ہم ہی

بیادِ شاہ عبداللطیف بھٹائی

پچھلے دنوں جو بلوانوں نے یہاں قیامت ڈھائی
اُس پر کیا کیا دل رویا ہے پوچھ نہ شاہ بھٹائی

اپنی اپنی سوچ ہے پیارے اپنا اپنا دل ہے
تو نے لیں قاتل کی بلائیں آنکھ مری بھر آئی

میں نے اتنی دور سے خوں بہنے کا شور سنا ہے
پاس ہی رہنے والوں تک کوئی آواز نہ آئی

یوسف کے قصے سے ہم کو یہ ادراک ہوا ہے
مال منال کے سب ہیں بندے کون کسی کا بھائی

تخت و تاج کی افسوں کاری اندھا کر دیتی ہے
ہر شے کی پہچان سے عاری ہوتی ہے دارائی

فرنگی کا جو میں دربان ہوتا
تو جینا کس قدر آسان ہوتا

مرے بچے بھی امریکہ میں پڑھتے
میں ہر گرمی میں انگلستان ہوتا

مری انگلش بلا کی چست ہوتی
بلا سے جو نہ اردو دان ہوتا

جھکا کے سر کو ہو جاتا جو سر میں
تو لیڈر بھی عظیم الشّان ہوتا

زمینیں میری ہر صوبے میں ہوتیں
میں واللہ صدرِ پاکستان ہوتا

یومِ مئی

صدا آ رہی ہے مرے دل سے پیہم
کہ ہوگا ہر اک دشمنِ جاں کا سر خم

نہیں ہے نظامِ ہلاکت میں کچھ دم
ضرورت ہے انسان کی امنِ عالم

فضاؤں میں لہرائے گا سُرخ پرچم
صدا آ رہی ہے مرے دل سے پیہم

نہ ذلت کے سائے میں بچے پلیں گے
نہ ہاتھ اپنے قسمت کے ہاتھوں ملیں گے

مساوات کے دیپ گھر گھر جلیں گے
سب اہلِ وطن سر اٹھا کر چلیں گے

نہ ہوگی کبھی زندگی وقفِ ماتم
فضاؤں میں لہرائے گا سُرخ پرچم

زندہ دلان لاہور کے عصرانہ میں حبیب جالب نے درج ذیل اشعار سید محبوب مرشد کا خیر مقدم کرتے ہوئے فی البدیہ پڑھے اور حاضرین سے جی کھول کر داد حاصل کی۔ اس تقریب میں آغا شورش کاشمیری نے سپاسنامہ پڑھا سید ابوالاعلیٰ مودودی، چودھری محمد علی، ملک اسلم حیات ایڈوکیٹ اور انجمن زندہ دلان لاہور کے سیکریٹری لطیف بٹ موجود تھے۔

ادارہ چٹان لاہور

کی نہیں اب تک کسی نے بھی ہماری بہتری
آپ کے سر پر بھی رکھ دیکھیں کلاہ رہبری
ہم کسی محبوب کو مہماں نہ اپنا کر سکے
خوں رلاتی ہی رہی ہم کو ہماری بے گھری
آپ سید بھی ہیں۔ مرشد بھی ہیں اور محبوب بھی
یہ بتائیں کب تلک کھائیں گے آٹے میں چری
آپ، شورش، ہم، سبھی ہیں قید اپنے خرچ پر
ملک کب ہوگا نظام لجکلا ہی سے بری
کون آزادی کا دشمن ہے سر محفل کہیں
سچ کو سچ کہتے ڈرے، اور آپ سا مرد جری
شاعران عصر حاضر مصلحت اندیش ہیں
ایک جالب ہے یہاں جو بات کہتا ہے کھری

غیر مطبوعہ

ہَوائے جور و ستم سے رُخِ وفا نہ بُجھا
بُجھے تمام دِیے ایک یہ دِیا نہ بُجھا

فراق و وصل کا لذّت شناس ہو کیونکر
جو دل کہ سایۂ مہتاب میں جَلا نہ بُجھا

مرے غموں کا مداوا ہے کیا، بتا کُھل کر
پہیلیاں ہی مرے دَرد آشنا، نہ بُجھا

ہر اہلِ جَور کی خواہش رہی ہے مَیں نہ رہُوں
مگر میں ہُوں کہ مِرا شعلۂ نَوا نہ بُجھا

مرے خیال میں اب تھک چُکے ہیں ظالم بھی
ڈھلے گی ظلم کی شب، دِیپ آس کا نہ بُجھا

طلوعِ صُبح کا منظر نظر میں روشن رکھ
شبِ سیاہ میں یہ آتشِ ہوا نہ بُجھا

ہجوم یہ جو ترے سامنے ہے اے ساقی
کر اس پہ لُطف مری تشنگی بُجھا نہ بُجھا

سَجا کے چہرے پہ غم کو نہ باہر آ گھر سے
بُجھی نظر سے مرے ہم نشیں فضا نہ بُجھا

مُمتاز

قصرِ شاہی سے یہ حُکم صادر ہُوا، لاڑکانے چلو
ورنہ تھانے چلو

اپنے ہونٹوں کی خوشبو لُٹانے چلو، گیت گانے چلو
ورنہ تھانے چلو

منتظِر ہیں تمہارے شِکاری وہاں، کیف کا ہے سماں
اپنے جلووں سے محفل سجانے چلو، مُسکرانے چلو
ورنہ تھانے چلو

حاکموں کو بہت تم پسند آئی ہو، ذہن پر چھائی ہو
جِسم کی لَو سے شمعیں جلانے چلو، غم بھُلانے چلو
ورنہ تھانے چلو

دن پھرے ہیں فقط وزیروں کے

وہی حالات ہیں فقیروں کے
دن پھرے ہیں فقط وزیروں کے

اپنا حلقہ ہے حلقۂ زنجیر
اور حلقے ہیں سب امیروں کے

ہر بلاول ہے دیس کا مقروض
پاؤں ننگے ہیں بینظیروں کے

وہی اہلِ وفا کی صورتِ حال
وارے نیارے ہیں بے ضمیروں کے

سازشیں ہیں وہی خلافِ عوام
مشورے ہیں وہی مُشیروں کے

بیڑیاں سامراج کی ہیں وہی
وہی دن رات ہیں اسیروں کے

امن کا گیت

چاہے کوئی رہے سنگ نا
ہم کہیں گے کہ ہو جنگ نا
بولو بولو کہ ہو جنگ نا

امن بچّوں کی مُسکان ہے
جنگ شُعلوں کا طوفان ہے
ہو یہ دھرتی لہو رنگ نا
بولو بولو کہ ہو جنگ نا

جنگ آہوں بھری رات ہے
جنگ اشکوں کی برسات ہے
ہو نہ سُونا کوئی آنگنا
بولو بولو کہ ہو جنگ نا

سر پہ گوری کے آنچل رہے
ہنستا نینوں میں کاجل رہے
یونہی چھنکیں سدا کنگنا
بولو بولو کہ ہو جنگ نا

جمہوریت نہ آئی

بھگتائے جیل خانے
دیکھے تمام تھانے
دامن ہُوا دریدہ
لکھا نہیں قصیدہ
گردن نہیں جُھکائی
سڑکوں پر مار کھائی
جمہوریت نہ آئی
چڑھ آئیں ہم پہ فوجیں

طوفاں کی جیسے موجیں
کچھ بھی رہا نہ باقی
ساغر سُبو نہ ساقی
کیا کیا ہوئی نہ بھائی
دنیا میں جگ ہنسائی
جمہوریت نہ آئی
بنگال بھی گنوایا
اپنا ہی خوں بہایا
دارورسن سے کھیلے
پاپڑ ہزار بیلے
محنت نہ رنگ لائی
جاں رات دن کھپائی
جمہوریت نہ آئی
لوگوں نے جو چُنی تھی
تصویرِ بے کسی تھی
دشمن تھے اسکے اپنے
پورے ہوئے نہ سپنے
جو شمع تھی جلائی
اک شخص نے بُجھائی
جمہوریت نہ آئی

ہم کو سِتم گروں سے بچاتا نہیں کوئی
اور اب تو آسماں سے بھی آتا نہیں کوئی

صدیوں سے اس طرف ہے یہ رات کا سماں
کچّے گھروں میں دیپ جلاتا نہیں کوئی

رُت آنسوؤں کی آنکھ سے ہوتی نہیں جُدا
موسم نظر میں پھُول کھلاتا نہیں کوئی

گُم ہو کے رہ گیا ہوں میں بیدرد شور میں
میٹھے سُروں میں گیت سناتا نہیں کوئی

بن بن کے پھر رہے ہیں ہمارے وہ چارہ گر
جن کا ہم اہلِ درد سے ناتا نہیں کوئی

گردن پہ خونِ خلق نہ رکھنے کی خُو ہمیں
رہبر اسی لئے تو بناتا نہیں کوئی

جالب یہ بات طے ہے بہت آزما چکے
کام اہلِ زر غریب کے آتا نہیں کوئی

شہر بدر طلبا کے نام

فضا میں اپنا لہو جس نے بھی اچھال دیا
ستم گروں نے اسے شہر سے نکال دیا
یہی تو ہم سے رفیقانِ شب کو شکوہ ہے
کہ ہم نے صبح کے رستے پہ خود کو ڈال دیا

میں خوش نصیب شاعر

ہر دور کے بھکاری شاعر ادیب سارے
بکتے قدم قدم پہ دیکھے خطیب سارے
بیچا نہیں ہے میں نے اپنا ضمیر جالبؔ
میں خوش نصیب شاعر اور بدنصیب سارے

محبت گولیوں سے بو رہے ہو
وطن کا چہرہ خوں سے دھو رہے ہو
گماں تم کو کہ رستہ کٹ رہا ہے
یقیں مجھ کو کہ منزل کھو رہے ہو

(مشرقی پاکستان میں فوج کشی کے موقع پر)

لوگو

آخری رات ہے یہ سر نہ جھکانا لوگو
حسنِ ادراک کی شمعیں نہ بجھانا لوگو
انتہا ظلم کی ہو جائے وفا والوں پر
غیر ممکن ہے محبت کو مٹانا لوگو

اشکوں کے جگنوؤں سے اندھیرا نہ جائے گا
شب کا حصار توڑ کوئی آفتاب لا
ہر عہد میں رہا ہوں، میں لوگوں کے درمیان
میری مثال دے، کوئی میرا جواب لا

سوجا

سوگیا شہر تو بھی اب سوجا
آپ ڈھل جائے گی یہ شب سوجا
سو گئے خامشی بتاتی ہے
جاگنے والے سب کے سب سوجا

لوٹاں دی سرکار

ڈاکواں دا جے ساتھ نہ دیندا پنڈ دا پہریدار
اَج پیریں زنجیر نہ ہُندی جِت نہ بندی ہار
پگاں اپنے گل وِچ پالو ٹروپیٹ دے بھار
چڑھ جائے تے مُشکل لہندی لوٹاں دی سرکار

(یحییٰ خاں کے دور میں لکھی گئی)

دھی کمی دی

دھی کمّی دِی

وَڈّے گھر وچ ٹہلیاں کر دی

ہنجو پیندی ہو کے بھر دی

نہ اے جیندی نہ اے مردی

بُڈّھے خان دا حُقّہ

دِن وِچ سَو سَو واری تازہ کردی

خان دا پُتّر

بیٹھک دے وِچ ہاسے پاندے

بانہہ پھڑلیندا اینویں سیدا اینویں کھیندا

کی دساں اوہ کی کی کہندا

اَدھی راتیں چھوٹی بی بی کہندی

اُٹھ تکیے وَل چلیئے

جے کسی نے پنڈ وِچ رہنا

فیر ایہہ سب کجھ کرنا پینا

جالب سائیں کدی کدائیں چنگی گل کہہ جاندا اے

لکھ پوجو چڑھدے سورج نوں آخر ایہہ لیہہ جاندا اے

باج تیرے او دِل دے ساتھی دل دی حالت کی دساں

کدی کدی ایہہ تھکیا راہی رستے وچ بہہ جاندا اے

ساندل بار وسیندیئے ہیرے ڈسدے بن تیرے ہاسے

دو پل تیرے غم دا پروہنا اکھیاں وچ رہ جاندا اے

ہائے دو آبے دی او دُنیا جتھے محبت وسدی سی

ہنجو بن کے دکھ وطناں دا اکھیاں چوں وہہ جاندا اے

فجرے اوہ چمکاندا ڈِٹھا جالب ساری دُنیا نوں

راتیں جیہڑا ایک دُکھاں دے ہس ہس کے سہہ جاندا اے

گل سُن چھپنا

گل سُن چھپنا
راج لیا اپنا
وڈیاں وڈیریاں دا
ظالماں لُٹیریاں دا
چھڈ ناں جپنا
گل سُن چھپنا!
راج لیا اپنا

سراں دیاں پوتیاں نے
پوتیاں پڑوتیاں نے
رنگیناں دے طوطیاں نے
کُجھ تینوں دِتا وی
اینویں پیا ٹپنا
گل سُن چھپنا
راج لیا اپنا

بندے نہیں اے پیار دے
اینویں تینوں چار دے
جھوٹ سچے مارے
ہوش کر پاگلا
چل پا کھپنا
گل سن چپنا
راج لیا اپنا

گورے چٹے صاباں کولوں
کالیاں نواباں کولوں
بچ ایہناں عذاباں کولوں
نہیں تاں تینوں نذناں
پےوے گا کلپنا
گل سُن چپنا
راج لیا اپنا

کُڑے

نہ جا امریکہ نال کُڑے
ایہہ گل نہ دیویں ٹال کُڑے
ایہنے قتل آزادی نوں کیتا
ایہنے ایس دھرتی دا لہو پیتا
ایہنے کٹوایا بنگال کُڑے
نہ جا امریکہ نال کُڑے

ایہہ روس دے نال لڑوندا اے
اینویں لوکاں نوں مرؤوندا اے
سانوں تیرا بڑا خیال کُڑے
نہ جا امریکہ نال کُڑے

گل ٹھیک ای کیہندا ساقیؔ وی
کتے چلا نہ جاوے باقی وی!
کر راکھی دیس سنبھال کُڑے
نہ جا امریکہ نال کُڑے

جام ساقی

ظُلم رہے اور امن بھی ہو
کیا ممکن ہے تم ہی کہو

ہنستی گاتی، روشن وادی
تاریکی میں ڈوب گئی
بیتے دِن کی لاش پہ اے دِل
میں روتا ہوں تُو بھی رو

ظلم رہے اور امن بھی ہو

ہر دھڑکن پر خوف کے پہرے
ہر آنسُو پر پابندی

یہ جیون بھی کیا جیون ہے
آگ لگے اس جیون کو

ظلم رہے اور امن بھی ہو

اپنے ہونٹ سیئے ہیں تم نے
میری زباں کو مت روکو
تم کو اگر توفیق نہیں تو
مجھ کو ہی سچ کہنے دو

ظلم رہے اور امن بھی ہو

فلم : یہ امن موسیقار : اے حمید گلوکار : مہدی حسن، نورجہاں

بھول جاؤگے تم

کر کے وعدہ صنم

تمہیں دل دیا تو یہ جانا

بھول جاؤ گے تم

درد کا ہے سماں غم کی تنہائی ہے

جس طرف دیکھئے بے کسی چھائی ہے

آج ہر سانس پر ہو کے بے تاب دل

دھڑکنے لگا تو یہ جانا

بھول جاؤ گے تم

کیسے گزرے گی شب، کیسے ہو گی سحر

اب نہ وہ منزلیں ہیں نہ وہ ہمسفر
دیکھتے دیکھتے رہگذر رہگذر

اندھیرا ہوا تو یہ جانا
بھول جاؤ گے تم

چاند کو دیکھ کر ہو رہا ہے گماں
پھول کے رُخ پہ چھائی ہو جیسے خزاں
مُسکراتا ہوا میری اُمید کا
چمن لُٹ گیا تو یہ جانا
بھول جاؤ گے تم

فلم: بسیرا   موسیقار: ماسٹر عنایت حسین   گلوکار: سلیم رضا

جاگنے والو جاگو مگر خاموش رہو
کل کیا ہوگا کس کو خبر خاموش رہو
کس نے سُنی ہے اِس نگری میں دل کی بات
کس پہ ہوا آہوں کا اثر خاموش رہو
رات کے بعد اِک رات نئی آجائے گی
اِس گھر میں ہوگی نہ سحر خاموش رہو
ظلم کے پہرے، خوف کے سائے سر پہ رہیں
ہو جائے گی عمر بسر خاموش رہو

فلم : خاموش رہو موسیقار : خلیل احمد گلوکارہ : ناہید نیازی

بُجھے نہ دل رات کا سفر ہے

رات کا سفر ہے

یہ ناسمجھ لوگ بے خطا ہیں

ہمارے غم کی کسے خبر ہے

رات کا سفر ہے

دکھائیں داغ اپنے کس کو اے جاں!

یُونہی لُٹے ہیں ہمارے ارماں

رہیں ہیں تر آنسوؤں سے داماں

یہ غم کا طوفاں ڈگر ڈگر ہے

رات کا سفر ہے

ہنسیں گی سہمی ہوئی نگاہیں

چمک اُٹھیں گی، وفا کی راہیں

ہزار ظالم سہی اندھیرا

سحر بھی لیکن قریب تر ہے

رات کا سفر ہے

فلم : گھر پیارا گھر موسیقار : نثار بزمی گلوکار : مجیب عالم

اے شامِ غم بتا کہ سحر کتنی دور ہے
آنسو نہیں جہاں وہ نگر کتنی دور ہے

دم توڑتی نہیں ہے جہاں پر کسی کی آس
وہ زندگی کی راہ گذر کتنی دور ہے

اب کوئی پاسباں نہ کوئی اپنا ہمسفر
منزل ہماری کس کو خبر کتنی دور ہے

کوئی پکارتا ہے تجھے کب سے اے خُدا
کہتے ہیں تُو ہے پاس مگر کتنی دور ہے

فلم : پرائی آگ موسیقار : خورشید انور گلوکار : مہدی حسن

آخری کلام

انتقال سے چند ماہ قبل جالب مسلسل ہسپتال میں صاحب فراش رہے۔ اس حالت میں بھی ان کی مشق سخن جاری رہی۔ ان کے آخری کلام سے چند اقتباسات

لکھ کوئی ایسا گیت--

جالب جو آکاش ہلا دے، لکھ کوئی ایسا گیت
شاید دکھیاروں کی سن لے دکھیاروں کا میت
جس کو سن کر کنکر برسیں، باطل کو ہو مات
ظلم کا راج سنگھاسن ڈولے، دکھ کی بیتے رات
پنڈت اور ملا کی جگ میں، سنے نہ کوئی بات
نیتاؤں کے من میں جاگے دیا دھرم کی ریت
لکھ کوئی ایسا گیت

کرودھ کپٹ اور بھوک ننگ کے سائے ڈھل جائیں
امن ہی امن ہو دنیا کے ماتھے کے بل جائیں
نینوں میں کھلے مسکائیں، گھٹنائیں ٹل جائیں
اس دھرتی کا چھوڑ دیں پیچھا، باوردی عفریت
لکھ کوئی ایسا گیت

جس کو سن کر غیرت جاگے، دیس نہ مانگے بھیک
اپنی آزادی کی صبحیں ہو نہ سکیں تاریک
دور ہو دوری اک دوجے کے آجائیں نزدیک
جس بھی اور نگاہیں اٹھیں ملے پریت ہی پریت
لکھ کوئی ایسا گیت

جیون کا ہر اک پل ہمیں بے آس ملا ہے
ہم رام نہ تھے، کیوں ہمیں بن باس ملا ہے
اس شہر کو اے دوست نظر کھا گئی کس کی
شب خوف میں ڈوبی ہے تو دن یاس ملا ہے
جس چاند کو دیکھا وہ بجز داغ نہ تھا کچھ
جو پھول ملا ہے ہمیں بن باس ملا ہے
ساقی نہ بجھا پائے گا تو پیاس ہماری
ساغر ہی نہیں خم بھی ترا پیاس ملا ہے
ہم اس کی جدائی میں سلگتے رہے دن رات
وہ دور ملا ہے، نہ ہمیں پاس ملا ہے
انسان کا دکھ دیکھ کے بھر آتی ہیں آنکھیں
صد شکر کہ ایسا ہمیں احساس ملا ہے
اے رب جہاں، یہ ترے پنڈت ترے ملا
کہتے ہیں کہ تجھ سے ہمیں افلاس ملا ہے
غربت کی خزاں ہو، کہ چمن زار وطن کا
ہم ایسوں کو ماحول کہاں راس ملا ہے
بے درد زمانے کے ستائے ہوئے لوگو
جالب سا کہو تم کو کوئی داس ملا ہے

عورت

بازار ہے وہ اب تک جس میں تجھے بِکوایا
دیوار ہے وہ اب تک جس میں تجھے چُنوایا

دیوار کو آ توڑیں، بازار کو آ ڈھائیں
انصاف کی خاطر ہم سڑکوں پہ نکل آئیں
مجبور کے سر پر ہے شاہی کا وہی سایا
بازار ہے وہ اب تک جس میں تجھے بِکوایا

تقدیر کے قدموں پر سر رکھ کے پڑے رہنا
تائیدِ ستم گر ہے چپ رہ کے ستم سہنا

حق جس نے نہیں چھینا حق اس نے کہاں پایا
بازار ہے وہ اب تک جس میں تجھے نچوایا

کُٹیا میں ترا پیچھا غربت نے نہیں چھوڑا
اور محل سرا میں بھی زردار نے دل توڑا
اُف تجھ پہ زمانے نے کیا کیا نہ ستم ڈھایا
بازار ہے وہ اب تک جس میں تجھے نچوایا

تو آگ میں اے عورت زندہ بھی جلی برسوں
سانچے میں ہر اک غم کے چپ چاپ ڈھلی برسوں
تجھ کو کبھی جلوایا تجھ کو کبھی گڑوایا
بازار ہے وہ اب تک جس میں تجھے نچوایا

پاکستان کا مطلب کیا؟

روٹی، کپڑا اور دوا
گھر رہنے کو چھوٹا سا
مفت مجھے تعلیم دلا
میں بھی مسلماں ہوں واللہ
پاکستان کا مطلب کیا
لا الہ الا اللہ . . . . .

امریکہ سے مانگ نہ بھیک
مت کر لوگوں کی تضحیک
روک نہ جمہوری تحریک
چھوڑ نہ آزادی کی راہ
پاکستان کا مطلب کیا
لا الہ الا اللہ . . . . .

کھیت وڈیروں سے لے لو
ملیں لٹیروں سے لے لو
ملک اندھیروں سے لے لو
رہے نہ کوئی عالی جاہ
پاکستان کا مطلب کیا
لا الٰہ الا اللہ . . . . .

سرحد، سندھ، بلوچستان
تینوں ہیں پنجاب کی جان
اور بنگال ہے سب کی آن
آئے نہ ان کے لب پر آہ
پاکستان کا مطلب کیا
لا الٰہ الا اللہ . . . . .

بات یہی ہے بنیادی
لوگوں کو ھو آزادی
غاصب کی ھو بربادی
حق کہتے ھیں حق آگاہ
پاکستان کا مطلب کیا
لا الہٰ الا اللہ . . . .

غزل

میں جب ہوں ذرا ڈوبتے خورشید سے پوچھو
کس کرب سے کس حال میں کیسے گزرتا دن

لو آج بھی کم ہو نہ سکی یاس کی ظلمت
لو آج بھی بیکار گیا آس بھرا دن

یہ شہر جہاں ہم ہیں یہاں کون ہے اپنا
یہ بات ہی کیا کم ہے یہاں بیت گیا دن

یہ کونسی بستی ہے جہاں چاند نہ سورج
کس درجہ بُری رات ہے کس درجہ بُرا دن

ظلمت کدۂ زیست میں ہم دیکھنے کل آئے
تیرے لب و رخسار سے شرمایا بڑا دن

اُس شمع سے کترا کے جو دن دیکھ رہے ہیں
دشمن کو بھی ایسے تو دکھائے نہ خدا دن

حبیب جالب
۱۵ جنوری

گوشۂ سعید پرویز
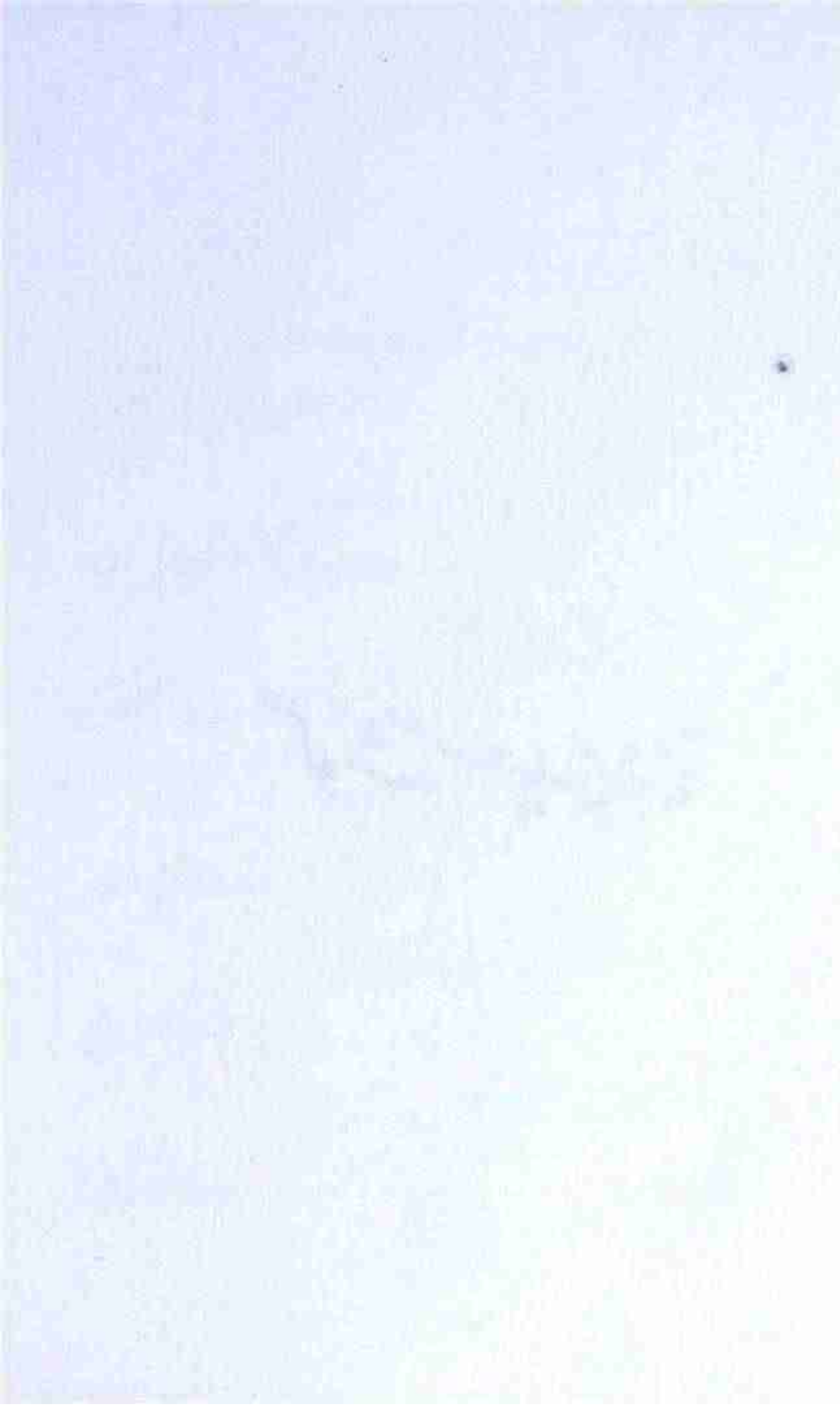
بازیگر

دن بھر شہر کی گلیوں، کوچوں اور بازاروں میں جانوروں کے کرتب دکھا کر بازیگر اپنی جیب خوب گرم کر چکا تھا اور پھر سورج ڈھلتے ڈھلتے وہ تھکے ہارے جانوروں کے ساتھ اپنے ڈیرے پہنچ گیا۔ سارے جانوروں کی رسیاں کھونٹیوں سے باندھنے کے بعد بازیگر نے منہ پر پانی کا چھپکا مارا اور کلی کی دھار جانوروں پر مار دی، شاید اس خیال سے کہ گرمی کے مارے جانور پانی کی دھار پڑنے پر کچھ سکون محسوس کریں گے۔

اب بازیگر اپنے میلے کچیلے جھولوں سے کھانے پینے کی مزیدار چیزیں نکال کر اپنے بیوی بچوں کو دے رہا تھا اور کرتب دکھانے کے عوض ملی ہوئی چیزوں کو سب مزے لے لے کر کھا پی رہے تھے۔

بازیگر کے پاس ایک ریچھ، ایک بندر، ایک پہاڑی بکرا اور ایک ہرن تھا اس وقت سارے جانور بازیگر کے بیوی بچوں کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے تھے اور اس انتظار میں تھے کہ کب مالک کو خیال آئے اور وہ انہیں بھی کچھ کھانے پینے کو دے۔ اب تو بازیگر اور اس کے بیوی بچے رات کا کھانا بھی کھا چکے تھے ادھر سارے جانور بھوک سے نڈھال خاموش بیٹھے تھے۔ آخر بندر سے نہ رہا گیا اور ہمیشہ کی طرح اس نے اُچھل اُچھل کر شور مچانا شروع کر دیا۔ بازیگر کھانے سے فارغ ہو کر حقہ

تازہ کر کے چند کش ہی لے پایا تھا کہ بندر نے شور مچانا شروع کر دیا تھا۔ بندر کی اس حرکت پر بازیگر بھی ہمیشہ کی طرح طیش میں آ گیا۔ اس نے چھینٹا اٹھایا اور دے دھنا دھن بندر کی پٹائی کر ڈالی۔ بندر کی پٹائی سے فارغ ہو کر بازیگر نے سارے جانوروں کے آگے تھوڑا بہت چارہ ڈالنا شروع کر دیا۔ وہ گالیاں بکتا جا رہا تھا' اور چارہ بھی ڈالتا جا رہا تھا۔ دن بھر کے بھوکے جانور چارے پر ٹوٹ پڑے اور منٹوں میں اسے چٹ کر ڈالا۔ چارہ تھا ہی کتنا جو سب کا پیٹ بھر جاتا لہٰذا سب کے سب جانور بھوکے تھے۔ بھوک کا یہ سلسلہ بھی بازیگر کی بازیگری کا ایک حصہ تھا۔' جانوروں کو قابو میں رکھنے اور انہیں اپنے اشاروں پر نچانے کا'

رات کافی گذر چکی تھی' بازیگر اور اس کے بیوی بچے گہری میٹھی نیند سو رہے تھے مگر ہمیشہ کی طرح آج بھی بازیگر کے چاروں جانور جاگ رہے تھے۔

بندر ریچھ سے کہہ رہا تھا۔

تمہیں مالک سب سے زیادہ کھانے کو دیتا ہے۔ اس طرح تم ہمارا حق مار جاتے ہو۔ اس پر ریچھ نے جواب دیا۔

ارے بندر میاں! ذرا میرا وجود تو دیکھو۔

یہ کہتے ہوئے ریچھ نے خود بھی اپنے وجود پر نگاہ ڈالی اور پھر بولا۔

دیکھ رہے ہو میں تم سب میں جسامت کے لحاظ سے کہیں بڑا ہوں۔ یہ تم سچ کہتے ہو کہ میں تم سب سے زیادہ کھاتا ہوں' مگر مالک میرے حصے کا جتنا مجھے کھانے کو دیتا ہے' وہ میری بھوک سے بہت کم ہوتا ہے اور یوں میں بھی بھوکا ہی رہتا ہوں حالانکہ مالک اپنے جھولوں سمیت کبھی کبھی تمہیں بھی میرے اوپر سوار کر دیتا ہے اور اس طرح میں کرتب دکھانے کے علاوہ بار برداری کے کام بھی آتا ہوں۔

کچھ دیر خاموشی رہی اور پھر ریچھ ہی بولا۔

دیکھو بھائیو! یہ ہمارا بازیگر مالک ہم میں سے کسی کا ہمدرد نہیں ہے۔ اسے تو صرف

اس بات سے دلچسپی ہے کہ ہم بھوک سے نڈھال جانور اس کے ہاتھ میں پکڑی چھڑی کے خوف تلے اس کے اشاروں پر ناچتے رہیں اور۔۔۔۔

ارے بس رہنے دو۔

بہت سن لیں تمہاری تقریریں۔

بندر نے ریچھ کی بات کاٹتے ہوئے کہا اور پھر بولا۔

میں تو مسلسل بھوک سے مایوس ہو چکا ہوں۔ اور یہ ریچھ!

بندر نے قہر آلود نظروں سے ریچھ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

یہ ریچھ جب تک ہمارے ساتھ رہے گا۔ یہ ہمارا حق مار کر اپنا پیٹ بھرتا رہے گا! اور ہم بھوکے ہی رہیں گے۔

ریچھ کو بندر کی باتوں پر غصہ آ رہا تھا۔ مگر وہ بڑا ہونے کے ناتے برداشت کر رہا تھا۔

بھائیو! ایک بار پھر ریچھ بولا۔

بھوک کا مسئلہ مجھے نکال کر یا مجھ سے علیحدہ ہو کر حل نہیں ہو گا۔

اس کے لیے ہم سب کو مل جل کر کوشش کرنا ہو گی۔ مثلاً ہمیں اس فیصلے پر متحد ہونا پڑے گا کہ کل سے ہم میں سے کوئی بھی کرتب دکھانے نہیں جائے گا۔ اور یہ عمل اس وقت تک جاری رکھنا ہو گا۔ جب تک مالک ہمارے بارے میں اپنا رویہ درست نہ کر لے۔

بولو ہے منظور؟

ریچھ نے اپنے ساتھی جانوروں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ جو پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

کسی کی طرف سے کوئی جواب نہ آنے پر ریچھ بھی خاموش ہو گیا۔

کچھ دیر خاموشی رہی اور پھر بندر بولا۔

دیکھنا ایک دن میں بھی بھاگ جاؤں گا، بالکل ویسے ہی جیسے ہمارا ایک ساتھی پہلے بھاگا تھا۔

بندر کی باغیانہ سوچ پر ہرن بولا۔

ارے رہنے دو بندر بھائی، بھاگ کر کہاں جاؤ گے۔

پھر ہرن نے خاموش بیٹھے ہوئے پہاڑی بکرے کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

'تقسیم در تقسیم'

کیا یہی ہماری بھوک کا حل ہے؟

مجھے خاموش ہی رہنے دو۔

پہاڑی بکرے نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔

نہیں نہیں کچھ تو بولو!

ہرن نے اصرار کیا تو پہاڑی بکرا بولا۔

بازیگر مالک ویسے شروع سے ہی مجھے شک کی نظروں سے دیکھتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ ڈیرے میں سب سے خطرناک اور سازشی جانور میں ہی ہوں۔

اور میں جانتا ہوں کہ میرے بارے میں مالک ایسا کیوں سوچتا ہے!

پھر پہاڑی بکرا ہرن سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

تم نے سوال کیا تھا۔ تقسیم در تقسیم تو مجھے یاد ہے کہ جب ایک بڑے ڈیرے سے علیحدہ ہو کر ہمارا یہ چھوٹا ڈیرہ بنایا جا رہا تھا تو میں بھی بڑے ڈیرے کے بہت سے جانور ساتھیوں کے ساتھ اُس تقسیم کا مخالف تھا۔ اور میں نے کہا تھا کہ قوت کو تقسیم مت کرو۔ اس سے ظلم کے ہاتھ مضبوط ہوں گے مگر بڑا ڈیرہ تقسیم ہو گیا اور میں چھوٹے ڈیرے کے حصے میں آ گیا۔ میں نے چھوٹے ڈیرے میں رہتے ہوئے شروع سے ہی مالک کے رویے کے خلاف کوشش کی تھی مگر میری بات تو تم لوگوں نے کبھی سُنی ہی نہیں۔

پہاڑی بکرے کی باتیں سن کر سارے جانور گردنیں جھکائے بیٹھے تھے۔
کچھ دیر بعد پہاڑی بکرا ہی بولا۔
اور ہاں یہ بات بھی سن لو۔
ہمارا پرانا ساتھی بھاگا نہیں تھا اسے تو بھگایا گیا تھا۔
یہ کہتے کہتے پہاڑی بکرے کی آنکھیں بھیگ سی گئیں۔ اور اس نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔
آہ! کیا ساتھی تھا ہمارا۔
تم لوگوں کو یاد ہو گا۔ کہ اس ڈیرے کو بنانے میں وہ ہی پیش پیش تھا اور پھر اس کے کرتب بھی ہم سب سے اچھے تھے۔
واہ، واہ۔
مگر اس کے ساتھ اچھا نہیں ہوا۔
وہ تو مالک کو سونے کا نوالہ کھلاتا تھا۔ مگر مالک نے ہمیشہ اسے قصائی کی آنکھ سے ہی دیکھا۔
مجھے اچھی طرح یاد ہے، جس رات وہ جارہا تھا تو اس نے بہتے آنسوؤں کے ساتھ کہا تھا۔
میں بھاگنا نہیں چاہتا، مگر کیا کروں مالک بازیگر نے حالات ہی ایسے بنا دیے ہیں کہ میں بھاگ جاؤں۔
اور وہ چلا گیا۔
اب ہم چاروں بھی ایک دوسرے سے لڑتے رہتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے.....
بہر حال کچھ بھی ہو، میں بھوک کے ہاتھوں بہت تنگ ہوں۔
میں مزید برداشت نہیں کر سکتا، اور موقع دیکھتے ہی بھاگ جاؤں گا۔
بندر نے پہاڑی بکرے کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

فرار! مسئلہ کا حل نہیں ہے۔

بھوک کے خلاف متحد ہونا پڑے گا۔

ریچھ نے ایک بار پھر بندر کو سمجھانا چاہا۔

بس بس!!

تم اپنے اتحاد کو اپنے پاس ہی رکھو۔

بندر چڑ کر بولا۔

اچھا بھاگ کر کہاں جاؤ گے؟

ہرن نے بندر سے پوچھا۔

کسی نئی قید میں۔

بندر نے جواب دیا۔

اگر بھاگ کر ایک قید سے دوسری قید میں ہی جانا ہے۔ تو بھاگنے کا فائدہ؟

ریچھ نے سوال کیا۔

ریچھ کے سوال پر بندر نے لمحہ بھر کو اسے دیکھا۔ پھر اپنے دوسرے جانور ساتھیوں کو دیکھا اور بولا۔

ایک قید سے دوسری قید کے درمیان ایک سفر آزادی کی تلاش میں اختیار کر لیتے ہیں، اور ایک خواب آزادی کا دیکھ لینے میں آخر حرج ہی کیا ہے۔ اور جانتے ہو!

کبھی کبھی خوابوں کی سچی تعبیریں بھی مل جایا کرتی ہیں۔

نہ وہ سورج نکلتا ہے

اچانک ایک دن وہ غائب ہو گیا۔

اُس کے گھر والوں نے اسے اِدھر اُدھر بہت تلاش کیا، مگر اس کا کہیں کوئی پتہ نشان نہ مل سکا۔ آخر وہ تھک ہار کے بیٹھ گئے۔ مگر ہر طلوع ہونے والا دن اُس کے گھر والوں کی پریشانیوں میں اضافہ کر رہا تھا۔

جانے وہ کہاں ہے؟

کیا کر رہا ہے؟

کن لوگوں میں ہے؟

یہ اور اسی طرح کے بہت سے سوالات نے اس کے گھر والوں کو اس لیے پریشان کر رکھا تھا کہ وہ ایک ذہنی مریض تھا۔ اس پر خاموشی کا دورہ پڑتا، تو مہینوں بات نہ کرتا، اور اگر بولنے پر آتا تو دن رات ایک کر دیتا۔ وہ خاموشی تو پھر قابل برداشت تھا مگر بولتا ہوا بہت خطرناک! بولتے ہوئے وہ اکثر ایسے کفر بکنے لگتا کہ جنہیں سن کر اس کے گھر والے خوف کے مارے اسے ایک محفوظ کمرے میں بند کر دیتے۔ ایسا وہ یوں کرتے تھے، کہ کوئی غیر اس کی خرافات نہ سن سکے۔

وہ پیدائشی تو ایسا نہیں تھا، بلکہ وہ تو بہت محنتی اور ذہین نوجوان تھا، مگر حساس بھی بہت تھا، اس کی حساس طبیعت نے ہی اسے نیم پاگل سا بنا دیا تھا۔ مرض جب بڑھا تو گھر والوں نے نفسیاتی ماہرین سے لے کر روحانی علاج تک، بساط بھر کوششیں کر ڈالیں،

مگر سب بیکار، مرض بڑھتا گیا، جوں جوں دوا کی۔

کبھی کبھی وہ ایسا نارمل ہو جاتا کہ اس پر ذہنی مریض ہونے کا شائبہ تک نہ گزرتا۔ ایسے میں اس کے گھر والے بھی اس کی طرف سے ذرا لاپرواہ سے ہو جاتے۔ ایسے ہی نارمل حالات چل رہے تھے کہ اچانک وہ گھر سے نکلا اور غائب ہو گیا۔

اب تو اسے غائب ہوئے کئی مہینوں بیت گئے تھے، پھر ایک دن ایسا ہوا کہ اچانک وہ گھر آ گیا۔ بالکل اپنے اچانک غائب ہو جانے کی طرح۔ اس کے گھر والے اس کی واپسی پر بہت خوش تھے کہ وہ کوئی گل کھلائے بغیر ہی واپس آ گیا۔

٭٭٭

گھر والوں کے پوچھنے پر کہ وہ اتنے دن کہاں رہا، اس نے جو داستان سنائی وہ کچھ یوں تھی۔

مجھے کچھ معلوم نہیں، مگر جب مجھے ہوش آیا تو میں ایک ایسی بستی میں تھا کہ جسے نیم دائرہ نما دو فلک بوس عمارتوں نے گھیر رکھا تھا، اس بستی کے رہنے والے بہت پریشان حال تھے، دکھی تھے۔

ڈرے، ڈرے۔

سہمے، سہمے۔

کمزور، کمزور۔

بستی کے گرد دونوں عمارتوں کا حصار بہت مضبوط تھا! یوں اندھیرے بستی والوں کا مقدر بنے ہوئے تھے۔ سورج ایک عمارت کے پیچھے طلوع ہوتا، اور نصف النہار کے مراحل سے گزرتے ہوئے اک نگاہ بستی پر ڈالتا اور پھر دوسری عمارت کے پیچھے چھپ جاتا۔ سورج کی روشنی کا بستی والوں سے یہی لگا بندھا ناتا تھا کہ وہ اک اچٹتی نگاہ بستی پر ڈالتا، اور بس!

پھر وہی اندھیرا!

میں بستی میں اجنبی تھا۔ مگر بستی والوں نے مجھے دیکھ کر کسی حیرت کا اظہار نہیں کیا، اور میں بھی جلد ہی اُن میں گھل مل گیا۔ مسلسل اندھیرے بستی کا روگ بنے ہوئے تھے۔

جہالت

بیماری

بھوک

بستی والے اپنے مسائل خوب سمجھتے تھے۔

ایک بار بستی والے اندھیروں کے خلاف متحد ہو گئے۔

روشنی چاہیئے!

روشنی چاہیئے!

پوری بستی میں نعروں کی گونج تھی۔

نعروں کی آوازیں جب دونوں عمارتوں تک پہنچیں، تو وہاں سے چند باریش افراد نکلے۔

لمبے لمبے چوغے پہنے!

ہاتھ میں تسبیح!

اور بغل میں کتاب!

یہ لوگ بستی میں نکل گئے، اور جب وہ اپنے "فرائض" ادا کرنے کے بعد عمارتوں میں لوٹ گئے، تو پوری بستی کا اتحاد پارہ پارہ اور زمین انسانی خون سے رنگین ہو گئی!

بستی والوں کا بہتا ہوا خون دونوں عمارتوں کی بنیادوں میں جذب ہو رہا تھا۔

پوری بستی زخموں سے شکستہ تھی۔

لہو لہان تھی۔

چند روز میں بستی کے حالات معمول پر آ گئے۔

وہی مانوس اندھیرے!

وہی مایوسیوں کے ڈیرے!

کچھ روز اور گذر گئے، بستی میں گھر گھر، گلی گلی گھٹن و بے چینی بڑھ رہی تھی، لوگ پھر سے جمع ہونے لگے تھے۔

اضطراب اور بڑھا، تو ایک بار پھر بستی میں نعرے بلند ہونے لگے۔

روشنی چاہیئے!

روشنی چاہیئے!

نعروں کی گونج جب دونوں عمارتوں تک پہنچی، تو اس بار وہاں سے تر و تازہ اور چمکیلے چہروں والے لوگ نکلے۔

سروں پر دیدہ زیب ٹوپیاں!

عمدہ لباس!

اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے پوری بستی اُن کی لچھے دار تقریروں سے گونجنے لگی۔ تر و تازہ اور چمکیلے چہروں والے ٹولیوں کی صورت بستی میں پھیل گئے۔ ایک ٹولی بستی کے زرد چہرے والے لوگوں سے مخاطب تھی۔

زرد چہرے والے لوگو!

کالے چہرے والے لوگ تمہارے نہیں ہیں۔

تم زرد!

وہ کالے!

پھر تمہارا، ان کا اتحاد کیسا؟

دوسری ٹولی بستی کے کالے چہرے والے لوگوں کو درس دے رہی تھی

کالے چہرے والے لوگو!

زرد چہرے والے بھلا تمہارے کیسے ہو سکتے ہیں۔

تم کالے!

وہ زرد!

کہاں تم!

کہاں وہ!

تمہارا ان کا اتحاد!

ناممکن۔

اپنا فرض پورا کر کے عمدہ ٹوپیوں اور قیمتی لباس والے اپنے ترو تازہ چمکدار چہروں سمیت عمارتوں میں واپس جا چکے تھے۔

اب بستی کے کالے اور زرد چہروں والے آمنے سامنے بالکل تیار کھڑے تھے۔

یوں اتحاد ایک بار پھر پارہ پارہ!

بستی لہولہان!

کالے اور زرد چہروں والے لوگوں کا سرخ سرخ خون دونوں عمارتوں کی بنیادوں کی جانب رواں دواں۔

ایک دن میں چھپتا چھپاتا ایک عمارت میں گھس گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ اکڑی گردنوں والے کچھ لوگ فائلیں سامنے رکھے بڑی سی میز کے گرد بیٹھے ہیں۔

میں نے کان لگا کر ان کی گفتگو سنی۔

مسئلہ زیر غور تھا

بستی والوں کے اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کے لیے آئندہ کی حکمت عملی۔

کسی طرح میں عمارت سے نکل کر بستی میں پہنچا اور وہاں کے چند سمجھدار لوگوں کو بتایا کہ ان عمارتوں میں بستی کے خلاف منصوبے بنائے جاتے ہیں۔

میری باتیں سن کر بستی کے سمجھدار لوگ بولے۔

ہم سب کچھ جانتے ہیں۔

مگر اب ہم بے بس و مجبور ہو چکے ہیں۔
اس بار وار بڑا کاری تھا۔
ہم یقین کھو بیٹھے ہیں۔

❀

بستی کے سرکردہ لوگوں کو بے بس و مجبور پا کر میں نے بستی والوں کو اندھیروں کے خلاف متحد کرنے کا عزم کر لیا۔ اور پھر گھر گھر، گلی گلی اپنے مشن پر آگے بڑھنے لگا۔

زرد اور کالے چہرے والے لوگو!
خود کو دیکھو۔
تمہارے چہروں پر یاسیت کی لکیریں ایک سی ہیں۔
اپنے گھروں کے آنگنوں میں جھانکو!
ویرانیاں ایک سی ہیں۔
کیا تم نے اپنے بہتے لہو کو نہیں دیکھا؟
تم زرد اور کالے۔
مگر لہو کا رنگ ایک۔
لوگو!
اندھیروں کو دور بھگانا ہے۔
سورج کو بستی میں لانا ہے۔
اگر ایسا چاہتے ہو۔
تو اپنے خون کو آپس میں بہنے سے بچانا ہوگا۔

❀

اک اجنبی نے بے یقین بستی کا یقین لوٹا دیا تھا۔
اس بار بستی کا اتحاد مثالی تھا۔

اس بار بستی والوں نے نعروں کی گونج سے جیسے دھرتی کانپ رہی تھی۔ اس بار دونوں فلک بوس مضبوط عمارتوں والے بستی کے شاملی اتحاد سے پریشان نظر آ رہے تھے۔

یوں لگتا تھا جیسے وہ بستی والوں کے اتحاد کے آگے بے بس و مجبور سے ہو گئے ہوں۔

بستی والے آگے ہی آگے بڑھتے جا رہے تھے۔

نعروں کی گونج عمارتوں تک پہنچ چکی تھی۔

عمارتوں والے بستی والوں کا گھیرا تنگ ہوتا محسوس کر رہے تھے۔ بستی والے خوش تھے کہ سورج کی راہ میں حائل دیواریں

اب گریں !

کہ تب گریں !

ایسے میں عمارتوں سے سنگین بردار نکلے۔

اور پھر پوری بستی پر گہرا سکوت طاری ہو گیا۔

گلیاں خاموش تھیں۔

راستے سنگینوں سے اٹے پڑے تھے۔

پھر مجھے بھی یہ کہہ کر بستی سے نکال دیا گیا کہ تم بستی والوں کو ورغلاتے ہو۔

❦

اپنی داستان سنانے کے بعد وہ چند لمحے خاموش رہا' اور پھر مضبوط ارادے کے ساتھ بولا۔

میں بستی میں جاؤں گا۔

وہاں لوگ میرے منتظر ہیں۔

میں بستی اور سورج کے درمیان حائل دیواریں اکھاڑ پھینکوں گا۔

روشنی چاہیے !

روشنی چاہیئے!

وہ زور زور سے نعرے لگا رہا تھا۔

گھر والوں نے اس کی بگڑتی حالت کو دیکھتے ہوئے سمجھا بجھا کے اسے کمرے میں بند کر دیا۔

❀

ہفتہ دس دن کے اندر اس کی بستی والی داستان قریب کے گھروں میں پھیل چکی تھی۔ اور آخر وہی ہوا۔ جس کا خطرہ اس کے گھر والے محسوس کر رہے تھے۔

اس کے گھر کا محاصرہ ہو چکا تھا۔

وہ اسے لینے آئے تھے۔

جب وہ اسے لے جا رہے تھے، تو اس کے گھر والوں نے کہا

جناب!

یہ تو پاگل ہے؟

تو اُدھر سے جواب ملا

یہی تو پاگل نہیں ہے۔

❀

لیڈر

پورن میں بھی انتخابی سرگرمیاں آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھیں. کل پھیکے کی پارٹی کے دفتر کا افتتاح ہونے والا تھا' حلقے سے قومی اسمبلی کا پارٹی امیدوار' دفتر کا افتتاح کرنے آ رہا تھا۔ مین ریلوے لائن کے ساتھ چوہدری منصب بھٹہ خشت والے کی دکانوں میں سے ایک دکان چوہدری صاحب نے پارٹی دفتر کے لیے خالی کر دی تھی۔ پارٹی کے جیتنے کے امکانات بہت روشن تھے' اسی لیے چوہدری منصب بھٹہ خشت والا' اس بار پارٹی کا ساتھ دے رہا تھا۔

الیکشن چوہدریوں کے لیے بڑا مسئلہ ہوتے ہیں' بڑا سوچنا پڑتا ہے. آگے پیچھے اوپر نیچے' دائیں بائیں.

بڑا خیال کرنا پڑتا ہے.

دیکھنا پڑتا ہے.

پورن کے "بڑوں" کا تو پارٹی میں آنا جانا لگا ہی رہتا تھا۔

کبھی آ گئے!

کبھی چلے گئے۔

پورن کے چھوٹے بھی اپنے اپنے "بڑوں" کے ساتھ آتے جاتے رہتے تھے' مگر پھیکا پارٹی کا بڑا پرانا وفادار ورکر تھا۔

سارا دن کارکن پارٹی دفتر کو سجاتے رہے۔ پھیکا تو سخر دپہرے بھی لگا رہا۔ شام ہوئی تو پھیکے نے "انے دی کھوئی" کے یخ پانی سے پارٹی دفتر کے سامنے چھڑکاؤ کیا۔ دن بھر کی سخت دھوپ کھائی ہوئی پیاسی زمین میں پانی جذب ہوا چلا جا رہا تھا' پھیکا بالٹیوں پہ بالٹیاں بھر بھر کے لا رہا تھا، مگر زمین کی پیاس بجھنے ہی میں نہیں آ رہی تھی' دن بھر کے تھکے ہارے پھیکے کی کمر دوہری ہو گئی تھی، چھڑکاؤ کرتے کرتے، لیکن مٹی سے اُٹھنے والی سوندھی سوندھی خوشبو اسے بھلی لگ رہی تھی۔ وہ صبح سے ہی کام میں جُتا ہوا تھا۔ اور گھر بھی نہ جا سکا تھا' گھر میں اس کی ماں اسے سو سو گالیاں دے رہی تھی۔

حرام جادہ' کتا نہ ہوے تاں۔

وڈا پارٹی دا چودریا نہ ہوے تاں۔

کی دِتا پارٹی نے' جو مُن مل جاؤ گا۔

سخر دوپہر' دی پکھا پیا سا لگا رہیا

بیمار ہو گیا' تاں دوا دارو کون کرو گا؟

پھیکے کی ماں خوب بول رہی تھی۔

ماں بس کر!

ویر کو اتنی گالیاں دے دیں۔

اب بیمار تو نہ کر ویر کو!

کھیجاں بھائی کی حمایت میں بول رہی تھی۔

چپ کرنی!

حرام جادی نہ ہووے تاں

ماں نے بیٹی کو بھی آڑے ہاتھوں لیا۔

اور پھر بولی

میں سب جانتی آں
تو بھی اس کے ساتھ ہے۔
دونوں 'رل مل' کے پارٹی کی 'گوڑی گوڑی' باتیں کرتے ہو
اماں بول چکی تو کھیجاں نے اماں سے کہا
اماں!
جے پارٹی جت گئی تاں انقلاب آجاؤ گا۔
انقلاب!
بس تو دعا کر اماں دعا!
'کھبے تے سُوا' انقلاب آئے گا۔
اماں نے ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔
اور پھر بولی۔
یہ آساں، تسی دونوں بہن بھائی ہی لگائی رکھو!
اماں، کدی تو چنگی بات بھی منہ سے نکال لیا کر
کھیجاں نے چڑ کر ماں سے کہا
نکل ادھر سے!
اماں چمٹا اٹھا کر کھیجاں کی طرف بڑھی۔
جا چلی جا!
جا کے دیکھ اس پارٹی وے ہوتے سوتے نوں۔
جس تے سخر دو پہر وی پاگلاں دی طرح سر پہ گذاردی اور کھانا کھانے دی
گھر نہیں آیا۔
اماں صبر کر!
ویرا آجائے گا۔

اے، لے وہ آ بھی گیا میرا دیر!
کھیجاں پھیکے کو گھر میں داخل ہوتے ہوئے دیکھ کر بولی
آگیا! ساری دوپہر سڑتے گذار کے!
چمٹا اماں کے ہاتھ ہی میں تھا اور اب اس نے کھیجاں کو چھوڑ کے پھیکے کو گھیر رکھا تھا۔
وے پھیکے!
وے جا کے اپنی شکل دیکھ شیشے دے وچ
کالا دھواں رنگ ہو گیا تیرا۔
او مُے!
کی مل جاؤ گا تینوں
آ، باج آجا
بس کر
بہت ہو گئی
اماں ذرا سی دیر کو بولتے ہوئے رکی تو پھیکے کو بھی بولنے کا موقع مل گیا۔
اماں!
تو بس کر دے!
بہت ہو گئی۔!
اماں! تینوں پتہ نہیں عزتاں دا سوال اے۔
ایس واری پہلے والے حالات نئیں
پارٹی ہُن پارس ہو گئی اے
پارس!
ایس واری انقلاب آوے ای آوے

اے اماں!

دیکھ! میں تیرے اگے ہتھ جوڑدا آں

توں، مینوں مار لے، پیٹ لے، گالیاں دے لے

پر پارٹی توں کج نہ کہہ!

پھیکے نے ماں کے آگے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

ہاں ماں! ویر ٹھیک کہندا اے۔

ایس واری انقلاب آ کے رہوے گا۔

کھیجاں نے بھی ماں کو قائل کرنے کی کوشش کی۔

مگر اماں کب ماننے والی تھی۔

زمانہ دیکھا تھا اُس نے!

اسی لیے پھیکے اور کھیجاں کی بات اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

ہونہہ!

انقلاب آوے گا۔

اماں کے لہجے سے بیزاری کا اظہار ہو رہا تھا۔

اس نے سالن گرم کرنے کے لیے ہانڈی چولہے پر چڑھائی اور بولی۔

آمنے سامنے، مَتّے دَتّے، زمیندار کھڑے نیں تے کہندے او انقلاب آوے گا!

اماں نے بات کر کے پھیکے اور کھیجاں کو لاجواب کر دیا تھا۔

پھیکے کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ ماں کو کیا جواب دے، بات تو ماں نے ختم کر دی تھی مگر پھیکا بات کیسے ختم کر دیتا۔ سو وہ ماں سے کہہ رہا تھا۔

اماں! ہمارے والا زمیندار ضرور اے پر اوہ پارٹی پروگرام دے نال اے اس وارسب نے حلف اُٹھایا اے۔

اماں! بس تو دعا کر اُتے روز مغرب دے بعد، بابے دُتے، دے مزار تے چراغ

واسطے چلی جایا کر۔

اماں بڑا اوکھا ویلا اے۔

یہ چٹ لگ گیا، تے فیر سٹے خیراں نیں۔

چل ویر!

نہالے۔

میں نے ملکا گیڑ کے ٹھنڈے پانی کی بالٹی بھر دی ہے۔

تو نہا کے آ، تو کھانا کھاتے ہیں۔

میں نے بھی کھانا نہیں کھایا۔

کھیجاں نے اماں اور بھیکے کی بحث کو ختم کراتے ہوئے اُسے غسل خانے کی طرف دھکا دے دیا۔

⁂

سارا کام ہو گیا ویر؟

کھیجاں نے بھیکے سے پوچھا۔

ہاں، ہو تو گیا۔

بھیکے نے کوڑا تیل ہاتھوں پر مسل کر، بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

ہو تو گیا! کیا مطلب؟

کیا بات ہے ویر؟

کھیجاں سمجھ گئی تھی کہ بھیکا کچھ چھپا رہا ہے۔

کھیجاں! اجے پارٹی دفتر کے افتتاح پر کل پرچم کشائی وی ہو جائے تاں۔

پرچم دا کپڑا اوی سوہنا ہووے تے مزا آجاوے۔

پر وقت گھٹ رہ گیا اے۔

بس! اتنی سی بات ہے ویر!

کھیجاں کے لہجے میں بڑا اعتماد تھا۔

وہ کہہ رہی تھی۔

ویر! توں گھبرا نہیں،

جھنڈا بن جائے گا۔

مگر تو کیسے......

میں ابھی آئی۔

کھیجاں اپنے ویر پھیکے کی بات ادھوری چھوڑ کے اندر کوٹھری میں بھاگ گئی۔ تھوڑی دیر بعد کھیجاں کوٹھری سے نکلی تو اس کے ہاتھ میں دو تین دوپٹے تھے۔

یہ کیا کھیجاں!

نہیں نہیں!

یہ تو تیرے داج کے ہیں

پھیکے نے کھیجاں کے ہاتھ سے دوپٹے چھین لیے۔

ویرا ڈوپٹے فیر بن جان گے۔

ایس ویلے عزت دا سوال اے۔

کھیجاں نے رات ہی رات میں بڑی سرشاری کے عالم میں پارٹی پرچم تیار کر لیا۔ پرچم کے کناروں پر ٹکا ہوا گوٹا پارٹی سے اس کے بے پناہ عشق کی گواہی دے رہا تھا۔

پورن کی گلیوں اور رستوں میں رنگ برنگی جھنڈیاں خوب بہار دے رہی تھیں۔ صبح سے ہی پارٹی دفتر کے سامنے ڈھول بجنا شروع ہو گئے تھے، بوڑھے، جوان اور بچے سبھی ڈھول کی تھاپ پر ناچ رہے تھے۔ دھوپ چڑھنے سے پہلے دفتر کا افتتاح ہونے والا تھا۔ بس میاں صاحب کا انتظار تھا۔

دُور اڑتی ہوئی دُھول بتا رہی تھی کہ جس کا انتظار تھا۔ وہ آرہا ہے۔

جوں جوں میاں صاحب اور ان کے ساتھ آنے والی گاڑیوں کی دُھول قریب آرہی تھی، ڈھول کی تھاپ پر رقص زور پکڑتا جا رہا تھا۔ جب میاں صاحب کی پجیرو عین دفتر کے سامنے رکی تو خوشی کے مارے لوگ ایک دوسرے پر گر رہے تھے۔

چودھری منصب بھٹہ خشت والے نے آگے بڑھ کر میاں صاحب کے گلے میں طلائی ہار ڈالا۔

سجنو! میاں صاحب ہمارے علاقے سے ممبری کے لیے کھڑے ہوئے ہیں۔ میاں صاحب کی جیت دراصل ہماری جیت ہے۔

پارٹی کی جیت ہے

پارٹی کے منشور کی جیت ہے

تالیاں

اور پھر تالیوں کی گونج میں میاں صاحب نے پارٹی دفتر کا افتتاح کرتے ہوئے پارٹی پرچم بھی فضا میں لہرا دیا۔

بسم اللہ!

پرچم فضا میں لہرایا تو پھیکے کا چہرہ خوشی سے دمک اُٹھا۔

بلے بھئی بلے!

پرچم کی اُٹھان ہی بتا رہی ہے کہ اس بار ستّے ای خیراں ہیں۔

تقریب کے بعد چودھری منصب بھٹہ خشت والے نے میاں صاحب سے پھیکے کا تعارف کروایا۔

میاں صاحب! پورے ہیں پارٹی کا ایسا وفادار ورکر اور کوئی نہیں ہے۔

اور جواباً میاں صاحب نے بڑھ کر پھیکے کو گلے سے لگا لیا۔

شاباش جواناں!

خوشی ہوئی تجھ سے مل کر۔
میاں صاحب نے پرجوش انداز میں پھیکے سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔
اور پھر بڑے پیار سے پوچھا۔
سناؤ! چاچے ہوری کا کیا حال ہے؟

پھیکا میاں صاحب کے سوال پر سوچ میں پڑ گیا۔
اُس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میاں صاحب کس چاچے کا حال پوچھ رہے ہیں۔
جواناں! تمہارے والد کا پوچھ رہا ہوں۔
میاں صاحب نے اپنے سوال کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔
جی! ان کو تو گذرے ہوئے بھی دو ' ورے ' ہو گئے ہیں۔

اوہو!
جواناں! افسوس ہوا۔
مجھ کو تو ان کے فوت ہونے کی کسی نے خبر ہی نہیں دی!
بک، با بڑا چنگا بندہ تھا۔
میاں صاحب کے اخلاق پر پھیکا اندر ہی اندر خوشی سے جھوم رہا تھا۔
چلو جی! فاتحہ پڑھ لو۔
میاں صاحب زور سے بولے اور فاتحہ کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔
ان کے ساتھ ہی، موجود سب لوگوں نے بھی فاتحہ کے لیے ہاتھ اٹھا دیئے۔
میاں صاحب نے بڑی لمبی سی آمین کہہ کر منہ پر ہاتھ پھیرے۔
اور پھر پھیکے سے پوچھا
چاچی ہوری تو ٹھیک ہے ناں؟
ہاں جی! وہ راضی باضی ہے۔
پھیکے نے جواب دیا۔

ان کو میرا اسلام بولنا، اور کہنا کہ میں الیکشن سے فارغ ہو کر آؤں گا۔

میاں صاحب نے یہ کہہ کر قریب بیٹھے ہوئے مُنّے کی گود سے اس کے بچے کو اٹھا کر اپنی گود میں بٹھا لیا۔

پُچو پُچو، پُچو پُچو

میاں صاحب نے بچے کے گال تھپتھپائے۔

مُنّا میاں صاحب کی غریب پروری پر نہال و نہال ہو رہا تھا۔

اچھا بھئی مجنو!

ڈٹے رہو۔

میاں صاحب کو اسی طرح، اور بھی کئی جگہ جانا تھا۔ اس لیے انہوں نے اجازت لی اور چل دیے۔

پورن کے باہر تک بوڑھے، جوان اور بچے ان کی گاڑی کے ساتھ ساتھ نعرے لگاتے ہوئے بھاگتے رہے۔

❀

پھیکے یار! تو نے تو کمال کر دیا

پارٹی پرچم بھی راتوں رات تیار کر لیا۔

چوہدری منصب بھٹہ خشت والا بھی فضا میں لہراتے ہوئے پرچم کو دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔

پارٹی دفتر کے سامنے اس وقت ریل گاڑی گذر رہی تھی۔

اوئے پھیکے!

دیکھ اوئے!

ریل گاڑی کے مسافر پارٹی پرچم کو دیکھ کر فتح کا نشان بنا رہے ہیں۔

چوہدری منصب نے پھیکے سے کہا۔

بھیکے نے دیکھا تو دوڑ کر پارٹی پرچم کے پاس کھڑا ہو گیا۔
پھر اس نے بھی ریل گاڑی کے مسافروں کو انہی کی طرح دو انگلیاں اُٹھا کر فتح کا نشان دکھانا شروع کر دیا۔
اوئے، اوئے!
بھیکا اُچھل اُچھل کر اپنا "پرنا" بھی ہوا میں لہرا رہا تھا۔
ریل گاڑی چند لمحوں میں گذر گئی اور بھیکا بھی پارٹی دفتر میں واپس آ گیا۔
یہ ریل گاڑی کہاں سے آ رہی تھی؟
بھیکے نے چوہدری منصب سے پوچھا۔
پشاور سے آ رہی تھی اور کراچی جا رہی ہے۔
چوہدری منصب نے بھیکے کے اگلے سوال کا بھی جواب دے دیا۔ ورنہ وہ پوچھتا کہ ریل گاڑی کہاں جا رہی ہے۔
بھیکے نے دونوں ٹانگیں سمیٹیں اور کرسی پر آلتی پالتی مار کر بیٹھتے ہوئے بولا۔
لو بھئی چوہدری صاب!
رب نے چاہا تو اس بار ہماری پارٹی پھر پورے ملک میں جیتے گی۔
اوئے بھیکے تیرے منہ میں گھی شکر!
چوہدری منصب نے مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

❀❀

اور پھر ایسا ہو بھی گیا۔ بھیکے کی پارٹی نے پورے ملک میں انتخابات اکثریت سے جیت لئے تھے۔ اور حکومت کی باگ ڈور بھی سنبھال لی تھی۔ جس روز بھیکے کی پارٹی کی حکومت بنی، وہ دن بھیکے اور کھیجاں کے لیے بہت خوشی کا دن تھا، اس روز وہ دونوں بہن بھائی پورن میں کھلاں بتاشے بانٹتے پھر رہے تھے۔
کھلاں بتاشے بانٹتے ہوئے دونوں بہن بھائی پارٹی دفتر کی طرف آ نکلے

مگر پارٹی دفتر بند پڑا تھا۔

دیر! اَج دا' دن' تے دفتر بند؟

کھیجاں نے پھیکے سے پوچھا۔

ہو سکدا اے چوہدری صاحب ایس خوشی دے موقع تے میاں صاحب دل گئے ہوَن......!

اور پھر پارٹی دفتر کبھی نہ کھلا۔

اور کھیجاں کا سدراں' چاداں' اور عشق و سرشاری والا پارٹی پرچم بھی ساتھ چھوڑتا گیا۔

پہلے پرچم کے کناروں پر ٹکا ہوا گوٹا اُکھڑ کر فضا میں لڑکھڑایا۔

اور پھر چل سو چل

پرچم کے رنگ اُڑے

پرچم اُدھڑنا شروع ہوا

اور ایک دن۔ صرف ایک لیر پھڑپھڑاتی رہ گئی۔

اپنی مزدُور ماں کے نام

عظیم ہوتی ہیں مائیں عظیم تر مری ماں
جُھکا سکا نہ زمانہ جسے وہ سر مری ماں
رشیدہ، جالب و مُشتاق اور حمید سعید
یہ سب تمہاری ہی محنت کا ہے ثمر مری ماں

ابّا جی

خادمُ الاولیاءؒ تھے ابّا جی
عِشقِ خیرُ الوراء تھے ابّا جی
سَر جُھکا کر چلے تمام حیات
شیریں لَب، باخدا تھے ابّا جی

تیرے بعد

کس کو سنائیں درد فسانے تیرے بعد
کیسے کٹیں گے غم کے زمانے تیرے بعد
سر کو اٹھا کر چلتے رہنا صبح تلک
کون آئے گا یہ سمجھانے تیرے بعد
ظالم خوش ہیں، کوئی نہیں اب آئے گا
خوابوں سے لوگ کو جگانے تیرے بعد
سیدھے سادے لہجے میں لوگوں کی بات
کون کرے گا، کوئی نہ جانے تیرے بعد
تو جو گیا، تو یاد ہمیں پھر آئے بہت
بچھڑے ہوئے سب یار پرانے تیرے بعد
دور تلک سناٹا ہے کون آئے گا
اپنے لہو کے دیپ جلانے تیرے بعد

جالب

وہی سماں، وہی شب کے حصار ہیں جالب
سیاستوں کے وہی کاروبار ہیں جالب
رہ وفا، میں تری یاد کے اجالے ہیں
یہ اور بات کہ غم بے شمار ہیں جالب
ترے عوام، ترے جاں نثار تیرے بعد
بہت اداس، بہت بے قرار ہیں جالب
اٹھائیں گے جو ترے پرچم گریباں کو
انھی کے واسطے سب رسن و دار ہیں جالب
تمھاری فکر تمھارا عمل تمھارا شعار
بہت نشے ہیں، بہت ہی خمار ہیں جالب

جیون کیسے بیتے، سوچ سوچ دن بیتے
بوڑھا برگد پوچھے کیا ہارے کیا جیتے
گوری سیج سجائے، دھاروں نیر بہائے
اک اک پل یاد آئے ساجن سنگ جو بیتے
تخت پہ بیٹھ کے بولیں، بول خدائی والے
دار پہ چڑھنے والے زہر پیالے پیتے
ہر کوئی یہ سوچے جانے کل کیا ہوگا
کہے فقیر نمانا، لنگ جا چپ چپیتے
کچھ بھی کریں، کرالیں، بات یہیں ہے مکتی
وہ ہیں، "ناتے گھوڑے" جو ہیں گرو چہیتے
اونچے شملوں والے، ہاری سے یہ چاہیں
ساری عمر گزارے آنکھیں کر کے نیچے

باتیں جالب بھائی کی

صدر ایوب خان کے دور میں حزب اختلاف کا ایک بڑا اہم اور فیصلہ کن جلوس مال روڈ لاہور پر رواں دواں تھا۔ جلوس کی قیادت وقت کے بڑے سیاست دان و علماء کر رہے تھے۔ جلوس کو گورنر ہاؤس تک جانا تھا۔ مگر ریگل چوک سے پہلے ہی پولیس نے جلوس کا راستہ روک لیا اور بندوقیں تان لیں صورت حال یہ تھی کہ جلوس کی ناکامی، تحریک کی ناکامی تھی، جلوس رکا ہوا تھا۔ ایسے میں جلوس کی پچھلی صفوں سے نکلتے ہوئے جالب صاحب نے گریبان چاک کیا اور یہ کہتے ہوئے بندوقوں کی جانب بڑھے۔ کہ "چلاؤ گولی" اور پھر جلوس بندوقوں کو روندھتا ہوا کامیابی کے ساتھ اپنی منزل پر پہنچ گیا۔

صدر یحییٰ خان کے دور حکومت میں نواب مظفر حسین قزلباش وزیر خزانہ تھے (جن کی حویلی سے ذوالجناح بر آمد ہوتا ہے) کسی مشاعرے میں نواب صاحب سے جالب صاحب کی مڈبھیڑ ہو گئی۔ جالب صاحب نے نواب صاحب سے کہا۔

میں حسینؑ کا ماننے والا ہوں اور آپ یحییٰ خان کے وزیر خزانہ ہیں اور میرا شعر سنئیے۔

صعوبتوں کے سفر میں ہے کاروان حسینؑ
یزید چین سے مسند نشین آج بھی ہے

سن ۶۰'۶۱ کی بات ہے۔ لاہور میں ایک مشاعرہ ترتیب دیا گیا۔ جس میں ترنم کے ساتھ کلام پڑھنے پر پابندی لگائی گئی اور یہ اہتمام "بطور خاص" جالب صاحب کے لئے کیا گیا تھا۔ جالب صاحب "بطور خاص" مدعو بھی کئے گئے۔ وہ آئے انہوں نے تحت میں اپنی غزلیں سنائیں' مشاعرہ لوٹا اور چلے گئے۔

جالب صاحب کے ہاں کسی کے لئے انکار نہیں تھا "سوائے اہل جور کے" اسی لئے ہمارے عزیز رشتہ دار' امیر غریب سبھی بھائی صاحب کے گھر خوب آتے جاتے رہتے تھے' کسی کو نوکری چاہئے' کوئی بیمار ہے' اس کا علاج کسی کو مقدمہ میں وکیل چاہئے' اور کچھ نہیں تو داتا کو سلام کرنے لوگ آجاتے تھے۔ ایسے میں جالب بھائی ہنس کر کہا کرتے تھے۔

داتا' دربار لوگ سلام کرنے آتے ہیں اور وہاں نذرانہ بھی ڈالتے ہیں' مگر میرا کنستر خالی کر جاتے ہیں۔

ایک شام

یہ شام نغمہ بہ لب شام خوبصورت شام
یہ شام ایک زمانے کے بعد آئی ہے
یہ شام جام بکف شام رنگ و نور کی شام
خرد کے نام جنوں کا پیام لائی ہے

تمام عمر پڑی ہے غمِ جہاں کے لیے
غمِ جہاں سے نگاہیں ذرا بچا لیں آج
بجا کہ محتسبوں کی نظر ہمیں پہ ہے
ہر ایک خوف پہ جی بھر کے مسکرا لیں آج

سکون لوٹنے والے تو چاہتے ہیں یہی
کہیں سکوں نہ ملے ہم سے غم کے ماروں کو
چمن اداس رہے یونہی اپنے خوابوں کا
یونہی ترستے رہیں ہم حسیں بہاروں کو

کریں بہار کی باتیں صبا کے لہجے میں
کسی حسیں سے کہیں فیضؔ کی غزل گائے
دیارِ دل کو اجالیں عدم کے شعروں سے
رخِ حیات پہ رنگ آئے روشنی آئے

زمانے بھر کے غموں کو ہے دعوتِ آزار[1]
ہمارے دل کو نہیں چھو سکے گا غم کوئی
ہمارے ہاتھ میں ہے آفتابِ عالم تاب
قریب آکے دکھائے شبِ الم کوئی

[1] اختر شیرانی مرحوم

نام کیا لوں

ایک عورت جو میرے لیئے مدتوں
شمع کی طرح آنسو بہاتی رہی
میری خاطر زمانے سے منہ موڑ کر
میرے ہی پیار کے گیت گاتی رہی
میرے غم کو مقدر بنائے ہوئے
مسکراتی رہی

اس کے غم کی کبھی میں نے پروا نہ کی
اس نے ہر حال میں نام میرا لیا
چھین کر اس کے ہونٹوں کی میں نے ہنسی
تیری دہلیز پر اپنا سر رکھ دیا
تو نے میری طرح میرا دل توڑ کر
مجھ پہ احساں کیا

آج اس شہر میں کل نئے شہر میں بس اسی لہر میں
اڑتے پتوں کے پیچھے اڑاتا رہا شوقِ آوارگی

اس گلی کے بہت کم نظر لوگ تھے فتنہ گر لوگ تھے
زخم کھاتا رہا مسکراتا رہا شوقِ آوارگی

کوئی پیغام گل تک نہ پہنچا مگر پھر بھی شام و سحر
ناز بادِ چمن کے اٹھاتا رہا شوقِ آوارگی

کوئی ہمدم کے ملے غنچۂ دل کھلے چاک دل کا سلے
ہر قدم پر نگاہیں بچھاتا رہا شوقِ آوارگی

دشمنِ جاں فلک غیر ہے یہ زمیں کوئی اپنا نہیں
خاک سارے جہاں کی اڑاتا رہا شوقِ آوارگی

قطعہ

آگ کے تیر چلے صحرا میں
پھول سے جسم جلے صحرا میں
قتلِ خورشید کے منظر کے سوا
کچھ نہ تھا، شام ڈھلے صحرا میں

حبیب جالب

سعید پرویز کے افسانوں کا مجموعہ
نہ وہ سورج نکلتا ہے

ملنے کا پتہ: مکتبہ دانیال، وکٹوریہ چیمبر نمبر ۲
عبداللہ ہارون روڈ کراچی

ہمیں تو یوں ہی ملے سخن کے صلے سڑک کے بیچ

بڑے بنے تھے جالب صاحب پٹے سڑک کے بیچ
گالی کھائی، لاٹھی کھائی، گرے سڑک کے بیچ
کبھی گریباں چاک ہوا، اور کبھی ہوا دل خون
ہمیں تو یوں ہی ملے سخن کے صلے سڑک کے بیچ
جسم پہ جو زخموں کے نشاں ہیں اپنے تمغے ہیں
ملی ہے ایسی داد وفا کی کسے سڑک کے بیچ